ا

جملہ حقوق محفوظ

نیرنگ خیال (ماہوار مصوّر رسالہ)

جلد ۱۳ — نمبر ۱۰۹/۱۱۰

اشاعت خاص

جولائی و اگست ۱۹۳۳ء

آنریری ایڈیٹر

بدرالدین حسن

ایڈیٹر اینڈ پروپرائٹر

حکیم محمد یوسف حسن

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی، ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

تعداد اشاعت ساڑھے چھ ہزار

(۶۵۰۰)

قیمت خاص نمبر
ایک روپیہ

چندہ سالانہ
اس خاص نمبر سمیت
تین روپے چھ آنے

(پتہ) منیجر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور

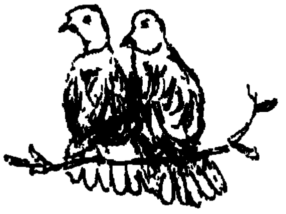
کریمی پریس بیرون بھیرا والہ دروازہ لاہور میں باہتمام حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر چھپا اور دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

نیرنگ خیال کے دو معاونین کی تصاویر

اس خاص نمبر میں ہم نیرنگ خیال کے دو قلمی معاونین کی تصاویر شایع کر رہے ہیں۔ ایک تصویر مسٹر ظفر قریشی بی اے دہلوی کی ہے۔ جو نیرنگ خیال کے قدیمی معاون اور دورِ حاضرہ کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ تحریری کام کرنے والے ہیں۔ روزنامہ عادل کے بعد الامان اور وطن میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے بہت سے رسایل واخبارات میں بھی مضامین لکھتے ہیں +

دوسری تصویر جناب فرید مچھلی شہری کی ہے۔ جو اس کم سنی میں ملک کے ممتاز رسایل کے نہایت کامیاب مضمون نگار ہیں۔ اور بعض جگہ سب ایڈیٹر کے فرائض بھی ادا کر چکے ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں فرید صاحب کا ملک کے مشہور اہلِ قلم میں شمار ہوگا +



(۴۸۶)

نیرنگِ خیال

اشاعت خاص

نیرنگ خیال گذشتہ سالوں میں ہر سال ایک خاص نمبر عید کے موقع پر پیش کرتا رہا ہے۔ اوّل اوّل یہ خاص نمبر عید الفطر کے موقع پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ عید الضحیٰ پر شایع ہونے لگا۔ اس لئے اس خاص نمبر کا نام عید نمبر رکھا جاتا تھا۔ اور یہ ہمیشہ دو ماہ کا مشترکہ پرچہ ہوتا تھا +

امسال عید نمبر کی اشاعت منسوخ کر دی گئی ہے۔ کیونکہ چاند کی ہجری تاریخوں کے حساب سے ہر سال دس دن کا فرق پڑ جاتا تھا۔ اور گذشتہ دو سالوں میں بعض خریداروں کو اس ہیر پھیر سے یہ کہنے کا موقع ملا تھا کہ انہیں ایک ماہ قبل وی۔ پی کر دیا گیا ہے۔ یا بعض نے کہا کہ انہیں ایک ماہ بعد وی پی وصول ہوا ہے۔ اس غلطی سے بچنے کے لئے ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب جولائی یعنی وسط سال میں ایک خاص نمبر بالکل اسی حجم اور اسی شان سے پیش کیا کریں۔ جس طرح سے عید نمبر پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس اعلان کا نتیجہ یہ خاص نمبر ہے۔ اس لئے جن صاحب کو یہ شکایت تھی کہ امسال انہیں عید نمبر کیوں نہیں ملا۔ ان کی اب تسلّی ہو جائے گی +

اس خاص نمبر کے متعلق بعض معاونین سے یہ رائے دی تھی کہ اسے جولائی اور اگست کا مشترکہ نمبر بنانے کی جگہ سو سو صفحہ کے دو خاص نمبر نکالے جائیں۔ اور کسی ایک ماہ کا پرچہ خاص نمبر میں شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ وہ ایک ماہ کے لئے بھی نیرنگ خیال کی غیر حاضری کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تجویز ضرور قابل غور ہے۔ لیکن ہم امسال کوئی ایسی تبدیلی نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے ہمارے ناظرین کو کسی قسم کا اشتباہ ہوتا اور وہ عید نمبر جیسا پرچہ نہ پا کر دل برداشتہ ہوتے + آیندہ سال کے لئے ہم تجویز کے متعلق غور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں +

یہ خاص نمبر جولائی و اگست مشترکہ نمبر ہے۔ اس لئے ناظرین اب ستمبر کے پرچہ کا انتظار کریں جو دس ستمبر کو انہیں ملیگا۔ کہیں اگست نمبر کی عدم موجودگی کی شکایات دفتر والوں کو پریشان نہ کردیں +

نیرنگِ خیال کا سالنامہ ۱۹۳۴ء

اگر سالنامہ کی ایجاد کا سہرا نیرنگ خیال کے سر ہے۔ تو اس کو کامیابی سے سنبھالنے اور اس میدان میں سب سے آگے رہنے کا فخر بھی نیرنگ خیال کے لئے مخصوص ہے۔ گذشتہ سال ۱۹۳۳ء کا سالنامہ دسمبر میں شایع ہوا تو آخر جنوری میں ہم آرزوؤں کی تعمیل سے معذور ہو گئے تھے۔ اگر وہ پرچہ تین ہزار زاید بھی چھاپ لیا جاتا۔ تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ✦

۱۹۳۳ء کے سالنامہ کے متعلق دوست دشمن سبھی کی یہ رائے تھی کہ یہ پرچہ بحیثیت مجموعی بہترین ہے۔ امسال جس سالنامہ کی تیاری کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اُس کے متعلق ہم پانچ ماہ قبل اعلان کرتے ہیں کہ وہ بلحاظ مضامین امسال بھی یکتا اور بے مثل ہو گا۔ اور ہندوستان بھر کے تمام سالنامے مقابلہ کے میدان میں اُس سے پیچھے رہ جائیں گے :

نیرنگ خیال جب اس قسم کا کوئی اعلان کرتا ہے۔ تو بعض حلقوں میں اس کی اس روش کو مذموم ٹھیرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تسلیم ہے کہ نیرنگ خیال کا سالنامہ بہترین ہوتا ہے۔ لیکن نیرنگ خیال کو اس قسم کے الفاظ لکھنے زیبا نہیں اس سے دوسرے رسائل کا دل دُکھتا ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا اظہار رائے غیر مستحسن ہے۔ لیکن سال کے بعد ایک پرچہ شایع کرنا اور اُس کے لئے خاص اہتمام کرنا درحقیقت تمام رسایل کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ بزم ادب میں ہر رسالہ بن سنور کر رونق افروز ہوتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ اُسے ہی سب سے بہتر ہونے کا فخر حاصل ہو۔ یہ جذبہ نہ بُرا ہے نہ مذموم۔ اگر ہم حسد اور مخالفت کو ترک کر کے ایک دوسرے کی ترقی پر رشک کھائیں۔ اور ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں تو یہ ملک اور زبان کی ایک خدمت ہے۔ مقابلہ کا جذبہ اگر نیک نیتی پر ہو تو اس کی تعریف ہونی چاہئے۔ الاعمال بالنیات ✦

نیرنگ خیال کے معاونین کا فرض اوّلین ہے کہ وہ سالنامہ نیرنگ خیال کی اعانت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہمارے قلمی معاونین اپنے مضامین فوراً بھیج دیں۔ نیرنگ خیال کے سالنامہ میں مضامین مضمون نگاروں کے نام کی وجہ سے شایع نہیں ہوتے۔ بلکہ مضمون کی خوبی کی وجہ سے جگہ پاتے ہیں ✦

سید نجم الدین جعفری کا نیا اعزاز

نیرنگ خیال کے قلمی معاون جناب سید نجم الدین احمد جعفری بی اے بار ایٹ لا۔ حال ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات ہند کو اُن کی ایک محققانہ علمی ریسرچ پر امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم نیرنگ خیال کی طرف سے اس اعزاز پر آپ کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں ✦

سب ایڈیٹر

تجدیدِ شوق

(از حضرت ساغر نظامی)

ہم کو تم سے ہم کو کام ہے ماسوا کا غم جنونِ خام ہے
آؤ گردن میں وہ باہیں ڈال دو پریم جھولا جن کا اصلی نام ہے
پھر اُٹھو پہلو سے دامن کھینچ کر پھر مراذوقِ تجسس خام ہے
پھر نگاہِ مست سے دیکھو مجھے پھر مجھے فکرِ شکستِ جام ہے
پھر پلاؤ دستِ نگیں سے شراب پھر مجھے اندیشۂ انجام ہے
پھر گرادو میرے دل پر بجلیاں بجلیاں جن کا تبسم نام ہے
پھر ہے پھولوں اور ستاروں پر خرام
پھر وہی ٹھنڈی ہوا ہے شام ہے

غزل

فکرِ حاصل اک جنونِ خام ہے عاشقی بے حاصلی کا نام ہے
دل تو دل اب خاک تک دل کی نہیں اے جنونِ الله کیا انجام ہے
الله الله عشق کی بے کاریاں ہم ہیں اور پھر اک کام ہے
ہے ترا سحرِ تبسم فتنہ ساز اور مری دیوانگی بدنام ہے
اضطرابِ بندگی پر شک نہ کر میری بے تابی کا سجدہ نام ہے
لمحۂ آغاز کی عشرت نہ پوچھ عشق کتنے ہی کو غم انجام ہے
یا فقط دم کا ہے دامانِ کرم یا مراذوقِ طلب ہی خام ہے
مدعی اور بختہ کاری کا فریب
مدعا ساغر خیالِ خام ہے

ساغر نظامی

محبت پارے

(از۔ محمد فصیح الحق عباسی۔ تیتر۔ احمد آبادی)

(۱) "جنس" ایک ولولہ ہے۔ ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ دل محبت ہے۔ اور محبت ابدی ہے۔ (نگھم)

(۲) محبت کسی کی محکوم نہیں اور نہ اپنی اقلیم کے سوا کسی اور اقلیم سے باخبر۔ (گرین ول)

(۳) ورجنت کو دا کرنے والی چیز محبت ہے نہ کہ عقل۔ جہاں محبت ہے وہاں علم کا گزر نہیں۔ (ینگ)

(۴) محبت کا درس خاص "نظارہ" ہے۔ (جی چاپمین)

(۵) محبت کی زبان آنکھیں ہیں ! آنکھیں محبت کی زبان ہیں۔ (فلیچر)

(۶) محبت کو کبھی زوال نہیں۔ (بیری کارن وال)

(۷) محبت سب سے نرمی کا برتاؤ سکھاتی ہے اور اس سے "دستی" نادر الوجود چیز حاصل ہوتی ہے۔ (کورل)

(۸) زمین اور آسمان پر جو چیز سب سے بہترین ہے۔ محبت اس سے بہتر ہے۔ (ورڈزورتھ)

(۹) محبت آدمی کو شاعر بناتی ہے گو اس نے پہلے اُسنے شاعری کا نام تک نہ سنا ہو۔ (یوری پیڈز)

(۱۰) محبت آنکھ سے نہیں دل سے دیکھتی ہے۔ اور اسی لئے کیوپڈ کی آنکھیں بے بصر ہیں۔ (شکسپیر)

(۱۱) صرف بلند اخلاق انسان ہی محبت کا اہل ہوتا ہے۔ محبت تلخی کو حلاوت سے بدل دیتی ہے۔ (کیوے لن ڈگبی)

(۱۲) محبت کی غذا محبت ہی ہے اور یہ طرفین کے نظارے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ (شکسپیر)

(۱۳) محبت میں خاموشی بھی فصاحت ہے۔ (کون گرین)

(۱۴) محبت کو آپ جسقدر پوشیدہ رکھینگے اسیقدر وہ آشکارا ہوگی۔ (والٹر ڈینی سن)

(۱۵) محبت غیر فانی ہے۔ اس کا مقدس شعلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس کا نزول آسمان سے ہوتا ہے۔ اور آسمان ہی پر صعود کرتا ہے۔ (ساؤدی)

(۱۶) جو محبت سے واقف نہیں وہ خدا سے واقف نہیں کیونکہ خدا محبت ہے۔ (بلور لٹن)

(۱۷) محبت کے لئے حسین ترین لباس "آنسو" ہے۔ (والٹر سکاٹ)

(۱۸) میں جب اس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیتی ہے۔ لیکن جب کہیں اور دیکھتا ہوں تو وہ میری طرف دیکھتی ہے اور ایک ہلکا سا تبسم اس کے لبوں پر ہوتا ہے۔ (کورل)

وہ دیکھتے ہیں جبکہ نہ دیکھے کوئی ان کو　　　دیکھے کوئی انکو تو وہ دیکھا نہیں کرتے

(۱۹) مقدس ترین محبت وہ ہے جو ممنونِ اظہار نہ ہو۔ (کارلائل)

(۲۰) میں پوچھتا ہوں محبت کیا ہے؟ عقل جواب دیتی ہے "محض جذبۂ بیکار"۔ کیا میں بھی اسے تسلیم کر لوں؟ فطرت کہتی ہے "نہیں"۔ . . . . اے ناصحو اپنی نصیحت ختم کرو کیونکہ خشک زندگی نے تمہارے دلوں کو برف کی قاش کے مانند سرد کر دیا ہے۔ کیا میں تمہاری نصیحت سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتا ہوں؟ فطرت جواب دیتی ہے "نہیں"۔ (کمبرلینڈ)

(۲۱) محبت بہت سے گناہوں کی پردہ پوش ہے۔ (سنٹ پیٹر)

(۲۲) اے ماہِ تاباں جب تک کہ میں اُسے نہ دیکھ لوں جو میرے خانۂ دل میں بسا ہوا ہے خدا کے لئے چرخ پر نمودار نہ ہونا! (کورل)

(۲۳) ستارے آسمان پر اپنے مستقر سے اس لئے بھٹک رہے ہیں کہ وہ چاند اور میرے محبوب کے حسین چہرے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ (کورل)

(۲۴) محبت کی مسرت ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ لیکن محبت کا غم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ (″)

(۲۵) میرے محبوب کا چہرہ اس چمن کے مانند ہے جس میں کنول کھلے ہوئے ہوں۔ (ایلی سن)

(۲۶) عشاق کے دل کی دھڑکن کائنات سنتی ہے اور سن کر دم بخود ہو جاتی ہے۔ (برنس)

(۲۷) زندگی ایک جامِ بلوریں ہے اور محبت اس میں بادۂ سرجوش۔ (نا معلوم)

(۲۸) محبت کی حقیقت کچھ محبت ہی سمجھ سکتی ہے۔ اے محبت تیرا تیر کیسا بے پناہ ہے کہ دل ہمیشہ کے لئے زخمی ہو جاتا ہے! آہ یہ تو وہی جان سکتے ہیں جن کے دل زخموں سے چور ہوں۔ (ڈرین ہیم)

(۲۹) محبت ایک آزار ہے۔ مستقل۔ رنگین۔ اور دلچسپ۔ (ڈولی سن)

(۳۰) نئی مسرتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایام بہار و نشاط بھی آ سکتے ہیں۔ مگر ان سب کی محبت کے خوابِ شیریں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ (ٹامس مور)

(محمد فصیح الحق عباسی)



منظومات

نوائے راز

(از جناب خان بہادر چودھری رضا علی صاحب وحشت کلکتہ)

میری خاموشی کہ جو در پردہ اک آواز ہے
اُنکے دل سے ہم سخن ہو گو ابھی تک راز ہے

گفتگو جو تجھ سے ہوتی ہے زبانِ راز ہے
بیمِ رسوائی تجھے کیوں اے نگاہِ ناز ہے

تیری بزمِ عیش میں تیرے سوا کوئی نہیں!
ساز بھی تیرا ہلاکِ شوخیٔ آواز ہے!

پرفشانی شوق سے ہے سعیٔ آزادی نہیں
صید افگن کو گمانِ کوششِ پرواز ہے!

ہے ہدایت کے لئے موجود خود تیرا ضمیر
گوشِ دل سے سن حقیقت کی یہی آواز ہے

تیری محفل میں نہ ہونگے دوست تیرے متفق
یہ تقاضائے فریبِ غمزۂ غماز ہے

ظلم ہے صیاد ابھی تک مطمئن مجھ سے نہیں
وہ سمجھتا ہے کہ باقی طاقتِ پرواز ہے!

گرمیٔ محفل کسی کی میرے سوزِ دل سے ہے
میرا ہی نالہ کہیں بزمِ طرب کا ساز ہے

وحشت

کلامِ سہا

(از حضرت سہا بلند شہری)

ہر تازہ مصیبت پر اک عید مناتے ہیں — دل کو تری الفت کے انداز سکھاتے ہیں
یہ دست درازی کی تہمت ہے عجب ہم پر — ظالم ترے دامن سے اک داغ مٹاتے ہیں
یہ بے سروپا باتیں یا عالمِ خاموشی — یوں ہوش سے جاتے ہیں یوں ہوش میں آتے ہیں
پیراہنِ ہستی میں کیوں آگ نہیں لگتی — شعلے تپش دل کے کیوں خاک اُڑاتے ہیں
سامانِ جنوں بیکراں وسعتِ صحرا ہیں — اب ایک نئی دنیا ہم اور بساتے ہیں
تدبیر نہیں چلتی تقدیر نہیں پھرتی — ہم اے طلبِ فانی دھوکے میں کب آتے ہیں
سب چھیڑ کی باتیں ہیں منظور نہیں پرسش — ہنستے ہیں غریبوں پر دیوانہ بناتے ہیں

کم ذوقی و محجوبی مشکل ہے سہا یعنی
وہ اہلِ نظر سے بھی چھپتے ہوئے جاتے ہیں

سہا

(مرسلہ جلیل فخری)

غزل

انتخاب جداگانہ

(از جناب خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی اے ریٹائرڈ منسٹر کشمیر)

یہی جو اُس رُخِ تاباں کی آب و تاب رہے ۔۔۔ تو کس کی آنکھ کو جلوے کی اُسکے تاب رہے
نگاہِ لطف رہے مجھ پہ یا عتاب رہے ۔۔۔ ترے حضور میں یہ بندہ باریاب رہے
جو مدرسہ میں رُخِ یار کی کتاب رہے ۔۔۔ تو امتحان میں عاشق ہی کامیاب رہے
بلا سے بینک میں اپنا نہ کچھ حساب رہے ۔۔۔ بس ایک کنجِ چمن اور اک کتاب رہے
بشر جو دل سے نکالے ہوائے نام و نمود ۔۔۔ تو پھر نہ یہ غمِ دنیا کا اضطراب رہے
گلہ عدو کا ہو لب پر نہ اپنی قسمت کا ۔۔۔ تری نگاہِ کرم پر جب انتخاب رہے
نگاہِ مست تری ساقیا مرا غمِ عشق ۔۔۔ یہ میکدہ رہے باقی یہی شراب رہے
بنی جو نجد میں کونسل تو قیس نے یہ کہا ۔۔۔ کہ عاشقوں کا جُداگانہ انتخاب رہے
گجر سحر کا بجا اور زمانہ جاگ اُٹھا ۔۔۔ ہیں اپنے قافلے والے کہ مستِ خواب رہے

جو بزمِ شوق میں ناظر کبھی ہو نغمہ سرا
تو شیخ و شاب کو اک نشۂ شراب رہے

ناظر

کلامِ آرزو

(غزل خالص اُردو)

جی رہے ہیں چاہ میں مر مر کے ہم　　پڑ گئے جھگڑے میں ہامی بھر کے ہم
آڑ ہے ایک یہ بھی جی کے بھید کی　　پوچھنے والے نہیں ٹھہر کے ہم
آ بسو جی میں جھجک یہ کس لئے　　اب اکیلے ہی ہیں اپنے گھر کے ہم
اُن کے چندرا نے پہ جی اُمڈا تو تھا　　رہ گئے ایک سانس ٹھنڈی بھر کے ہم
بے سہاروں کا سہارا کچھ نہ پوچھ　　سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم
کُھل کے تم کہدو تو دکھلا دیں ابھی　　اپنے ہاتھ اپنے لہو سے بھر کے ہم
جس کو بے دیکھے نہیں ہے اب بھی چین　　ہائے گھائل ہیں اُسی تیور کے ہم
آس میں اُسکی نہ اب سکھ ہے نہ دُکھ　　تکتے تکتے بن گئے پتھر کے ہم
اُن کے آگے آرزو سچ بات بھی　　کہہ نہیں سکتے ہیں مارے ڈر کے ہم

(غیر مقید اُردو)

اشکوں نے راہ بدلی ضبطِ دلِ حزیں سے　　ٹپکا لہو جگر کا بن کر عرق جبیں سے
جوشِ نموئے گل میں اعجاز ہے جنوں کا　　نکلینگے ہاتھ سو سو ایک ایک آستیں سے
قطعِ رہِ وفا کے آداب کچھ نہ پوچھو　　جو کام پاؤں کا تھا لینا پڑا جبیں سے
راہِ طلب کی سختی سنگِ نشاں تھی گویا　　ٹھوکر یہ کھائی ٹھوکر پلٹا نہیں کہیں سے
دل کیا ہے ایک امانت ہم ایک امین یعنی　　دینا بھی ہے تمہیں کو لینا بھی ہے تمہیں سے
میرے ہی آنسوؤں سے دھو ڈالو خون میرا　　دامن سے کچھ نچوڑو کچھ لے لو آستیں سے
خود انفعالِ مجرم درمانِ سوزِ غم ہے　　سینے پہ مل رہا ہوں لیکر عرق جبیں سے
رُخ کا مرے تغیرِ غم کی کتاب سمجھو　　لی ٹھنڈی سانس جس جا پلٹا ورق وہیں سے
آئی رہِ طلب میں حدِ ادب کی منزل　　لے پاؤں کانپ اٹھے چل سر کے بل یہیں سے
سیکھا و تیرہ یہ ہی دو کروٹوں میں ہوگی　　ہاہا جی ہو نہ ہو میں اُٹھنا بھی ہے زمیں سے
شوقِ طلب نے کھویا حکمِ طلب نے ڈھونڈا　　میں گم ہوا تھا جس جا پھر مل گیا وہیں سے
کھا کر قسم وفا کی عہدِ وفا نہ لینا　　ہاں چوک ہو گئی کچھ اے آرزو ہمیں سے

آرزو لکھنوی

ا؎ اقرار کرنا
۲؎ تجاہل عارفانہ



ستم ظریفیٔ فطرت

(از حضرت یگانہ لکھنوی)

دیکھوں کب تک گُلوں کی یہ تشنہ لبی
فطرت کا گِلہ کروں تو ہے بے ادبی
پیاسے تو ہیں جاں بلب مگر ابرِ کرم
دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی!

جتنی ضرورت اُتنی قیمت

ہاں فکرِ رسا دیکھ بڑا بول نہ بول
گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت اُتنی قیمت
ہیرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول

یگانہ لکھنوی ۔ سب رجسٹرار لاتور

گاؤں

گاؤں! اے تہذیبِ انسانی کے نقشِ اولیں
زندگی کے دورِ عمرانی کے نقشِ اولیں

غربتِ نوعِ بشر کی آخری حد کے نشاں
تیرے ٹوٹے پھوٹے بیڈھنگے گارے کے مکاں

کُہنہ دیواریں تری تاریخِ ماضی کے ورق
تیرے مکتب سے ملا پہلا حضارت کا سبق

آدمی جنت سے نکلا تیرے دامن میں بسا
اس مسرت اور آزادی کے دامن میں بسا

بحرِ وحشت کا شناور تیرے ساحل پر رُکا
عمر کا لمبا مسافر تیری منزل پر رُکا

رہروانِ زندگی کی منزلِ اول ہے تو
بارِ تہذیبِ بشر کا حاملِ اول ہے تو

رہنمایانِ بشر تیری ہی بستی سے اُٹھے
سرفرازانِ بشر تیری ہی بستی سے اُٹھے

یہ ترے کچے گھروندے مسکنِ اشراف ہیں
تیری چوپالیں ستونِ کعبۂ انصاف ہیں

بے ریا بھولے ترے معصوم اور سادہ مکیں
محنت و اخلاص و دلداری کے دلدادہ مکیں

رُوح کا سامانِ عشرت تیرے دلکش گیت ہیں
تیری آبادی کے انساں ہر کسی کے میت ہیں

نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتیں تری
"پی کہاں" کے سوز سے معمور برساتیں تری

دھوپ سے آباد تیری سردیوں کی ہر سحر
چھاؤں سے دلشاد تیری گرمیوں کی دوپہر

تیری صبح و شام کا سادہ مگر دلچسپ رنگ
آدمی کے دل میں بس رہ رہ کے اُٹھتی ہے اُمنگ

ڈھاک کے پھول آم کے پھل چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
رشک کھائے بادشاہت اس پہ ہفت اقلیم کی

لے کے چوپایوں کے گلّے خانۂ دہقان سے　　پھرتے ہیں چرواہے اک پیغمبرانہ شان سے
کھیت میں خود دار مزدور اور جفاکش محنتی　　جن کا مسلک ہے "عمل" اور جن کا مشرب "سادگی"
تیرے میدانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار　　تیرے ویرانوں کی آبادی پہ ہنگامے نثار

حسنِ سادہ کی فسوں خیزی۔ الٰہی ! الاماں　　عشقِ صادق کی جنوں خیزی۔ الٰہی! الاماں
پاسدارِ عصمتِ مریم کنواری لڑکیاں　　ناشناسِ رنگِ بیش و کم کنواری لڑکیاں
ناچتے ہیں گیت ان کے محنتوں کے ساز پر　　چکیوں کی منضبط اور دل رُبا آواز پر
اک طرف ساون میں ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار　　اک طرف ان کے سُریلے مست گیتوں کی بہار
سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں　　گرمیوں کی دوپہر میں باہمی دل جوئیاں

شہر کے پُرشور ہنگاموں سے گھبراتا ہوں جب　　رات دن کی محنتِ شاقہ سے اُکتاتا ہوں جب
تیری جانب دوڑ کر بے ساختہ آتا ہوں میں　　دل کا اطمینان اس ماحول میں پاتا ہوں میں
تجھ سے وابستہ مرا سرمایۂ تاب و قرار　　کچھ عزیزوں کے مکاں ہیں کچھ بزرگوں کے مزار

وقت کی رفتار مجھ کو یاں نظر آتی ہے سُست　　جسم کی بگڑی کلیں ہوتی ہیں یاں آکر درست
زندگی کی حرکتوں میں اک سکونِ دل نواز　　شادمانی خرمی کا اک فسونِ دل نواز
تیرے میدانوں کی وسعت میں مرا پیکِ خیال　　چار جانب دوڑتا ہے لیکے ادراکِ جمال
لطف اُٹھاتا ہوں تری روشن فضا میں بیٹھ کر　　گیت گاتا ہوں تری تازہ ہوا میں بیٹھ کر
میری خواہش میری تسکین اور مری مرضی ہے تو　　گاؤں کیا میری نظر میں "جنتِ ارضی" ہے تو

وقار انبالوی

لیلیٰ کے خطوط

(مشہور ادیب جناب قاضی عبدالغفار صاحب کے قلم سے)

[ان خطوط میں "لیلیٰ" کی زندگی کے تین دَور پیش کئے گئے ہیں۔ پہلے دور کے چند خطوط "نیرنگ خیال" میں شایع ہو چکے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے دَور کے چند نمونے اب پیش کئے جاتے ہیں۔ ان خطوط کا مکمل سلسلہ پریس میں جا چکا ہے۔ اور انشاء اللہ عنقریب شایع ہوگا ‡

اس عرصہ میں مجھے بعض احباب نے بہ اصرار لکھا کہ "لیلیٰ" کے خطوط کے ساتھ وہ خطوط بھی شایع کئے جائیں جن کے جواب میں "لیلیٰ" نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ سرسری نظر میں یہ کمی پوری کئے جانے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔ مگر میرے نقطۂ نظر سے احباب کی یہ تجویز کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں عرض کردوں کہ "لیلیٰ" کے خطوط کی بنیاد جو تخیل ہے وہ یہ ہے کیا ‡

ہندوستان میں عورت کی مظلوم فطرت کا ... نقش اُسی کے قلم سے پیش کرانا مدنظر تھا۔ اور مشکل یہ تھی کہ کسی شریف عورت کے قلم سے مرد کی حقیقت کو واضح طور پر لکھوانا بعید از قیاس تھا اس لئے عصمت فروش طبقہ میں "لیلیٰ" کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا۔ تاکہ اُس کے قلم سے بے حجابانہ وہ تاثرات بیان کرائے جاسکیں جن کا واضح طور پر بیان کرانا ضروری تھا۔ صرف "لیلیٰ" ہی کے طبقہ کی کوئی عورت اس طرح اپنے خیالات کو ظاہر کرنے پر قادر ہوسکتی تھی ‡

علاوہ بریں مقصود صرف مرد کے متعلق عورت کے محسوسات کا بیان کرانا تھا۔ رہے مرد کے محسوسات تو اُن کے اندر تو کوئی ایسی جدت باقی نہیں جس سے اردو زبان کا "ادب لطیف" محروم ہوگیا ہو! مرد ماشاءاللہ اپنے عاشقانہ جذبات کے ظاہر کرنے میں ہمیشہ مرد میدان رہا ہے۔ عاشقانہ خطوط لکھنے اور اپنے عشق کی داستان بیان کرنے کا فن مرد کو اُسیقدر آتا ہے جسقدر مچھلی کو پانی میں تیرنا! اس ماہر فن کا یہ "ادب لطیف" کا ڈیول اور ٹھیلوں پر لدا ہوا بازاروں بازار ٹکے سیر بکتا پھرتا ہے۔ اب نئی بات کونسی باقی ہے جو وہ کہے! لب خشک اور آہ سرد کی وہی ایک کہانی مختلف الفاظ میں ہر دفعہ اُس سے سُن لیجئے۔ البتہ اگر محض اپنی انشاپردازی کا مظاہرہ کرنا ہو تو اس میدان میں اُس کی گنجایش ضرور ہے۔ لیکن کسی خاص مطمح نظر اور مقصود کے بغیر قلم

کی جولانیاں بے نتیجہ اور فضول ہیں۔ کم از کم میں تو اُردو رسالوں کے سینہ پر یہ وزن رکھنا پسند نہیں کرتا!

"لیلیٰ" کے خطوط ایک خاص مقصد کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ وہ محض انشا پردازی اور ادبیات کا طبل تہی نہیں ہیں۔ مگر حضرت "مجنوں" کے خطوط میں کوئی نئی بات کہاں سے پیدا کی جائے اور پھر ایسی حالت میں جبکہ خود "لیلیٰ" کے خطوط کا انداز تحریر ایسا ہے۔ جس سے اُن خطوط کے مضامین و مطالب کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ جن کا جواب "لیلیٰ" نے لکھا ہے۔ میری ناچیز رائے میں اتنا ہی اشارہ بالکل کافی ہے +

وہ ادبی نکتہ جو یک طرفہ خطوط میں اہلِ ذوق کے لئے نشاطِ خاطر کا باعث ہو سکتا ہے باقی نہ رہے گا۔ اگر باضابطہ سوال و جواب کی صورت پیدا کر دی جائے۔ جواب سے ہی اگر سوال کی حقیقت بھی واضح ہوتی رہے۔ اور پڑھنے والا "لیلیٰ" کے جواب کو پڑھ کر سمجھے کہ سوال کیا ہوگا تو وہ چیز میری ناچیز رائے میں لطیف تر ہے۔ اس لئے میں احباب کے اس حکم کی تعمیل کرنے سے اپنے کو قاصر پاتا ہوں۔ "مجنوں" کے خطوط بھی اگر لکھے گئے تو پھر "لیلیٰ" کے خطوط کی معنویت تباہ ہو جائے گی!!

مردوں کی خواہشات کے پرانے دفتر کو بند ہی رہنے دیجئے۔ اور "نیرنگ خیال" کے کاندھوں پر نہ رکھئے۔ اُس دفتر کے اندر وہی اوراق پارینہ ہیں جو ہزار دفعہ پڑھے جا چکے ہیں۔ کوئی نئی بات ہے تو وہ صرف "لیلیٰ" کے خطوط میں ہے۔ اس آئینہ میں مرد اپنا چہرہ صاف دیکھ سکتے ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اُن کی بھدی تصویر الگ بھی چھاپی جائے!! عبدالغفار

دوسری کتاب

(۲۴)

تمہاری کل رات کی گفتگو نے میرے زخموں کو بُری طرح کُرید ا ہے۔ اپنی زندگی کے حال و استقبال کا جائزہ لے رہی ہوں۔ معلوم نہیں کس نتیجہ پر پہنچوں۔ دو چار دن مجھ سے دُور ہی رہو۔ میرے سامنے نہ آؤ۔ نہ مجھے خط لکھو۔ نہ پیام بھیجو —— للہ سوچنے دو۔ سنبھلنے دو۔ دم لینے دو۔ اگر تم نہ مانو گے اور میرے گھر آؤ گے تو میرا دروازہ بند پاؤ گے۔ خط لکھو گے تو بغیر پڑھے اُس کو آگ میں ڈال دوں گی۔ انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے۔ جب وہ اُس منزل پر پہنچتا ہے جہاں "حال" کی سرحد ختم اور "استقبال" کی سرحد پر شروع ہوتی ہے

کل رات میں اُس سرحد پر آگئی میرا تمام وجود روحانی حیران و ششدر رہے! یہ کیا ہو گیا؟ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور میں اس منزل پر آگئی! آنکھیں بند کئے بھاگی جا رہی تھی اور سمجھتی تھی کہ یہی راستہ نجات کا ہے ٹھوکر لگی تو اپنے کو اُس منزل پر پایا جس منزل سے دُور بھاگ رہی تھی! ایسے ہی حوادث کا نام شاید مقدر ہے؟ قسمت اسی کو کہتے ہیں؟ جب مشرق کی طرف مُنہ کر کے بھاگے اور مغرب میں پہنچ جائے۔ جب آسمان کی طرف پرواز کرتا ہو اور زمین میں دفعتاً چلا جائے۔ موت مانگے اور زندگی ملے ــــ آب حیات کا پیالہ ہاتھ میں ہو اور دم نکل جائے ــــ وہی تقدیر ہے! میں "زندانی تقدیر" دو چار دن کے لئے معتکف ہوتی ہوں۔ میرا تمام وجود روحانی معتکف ہوتا ہے۔ دو چار دن بعد جب اس اعتکاف سے باہر آؤں گی۔ تو اپنی قسمت کا آخری فیصلہ کر کے باہر آؤں گی۔ دریا چڑھا ہوا ہے۔ بند باندھ رہی ہوں۔ مجھے بند باندھنے دو! میں نے ہمیشہ حقارت اور استہزا سے تمہارے ادعائے عشق و عاشقی کو ٹھکرایا ہے۔ آج مغلوب ہوئی جاتی ہوں۔ اور ہاتھ جوڑتی ہوں ــــ تم مجھے مہلت دو کہ میں اپنا گلا گھونٹ لوں! اے اللہ! کیا یہ بھی نہ ہو سکیگا؟

(۲۴)

بار بار مت لکھو۔ میں پڑھ نہیں سکتی۔ سُن نہیں سکتی۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میری ساری زندگی تپائی جا رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یا تو یہ لوہا پانی ہو کر بہ جائیگا۔ یا کسی نئے سانچہ میں کوئی نئی شکل اختیار کرے گا۔ دق نہ کرو۔ میں جل رہی ہوں۔ پُھنک رہی ہوں۔ مٹ رہی ہوں +

(۲۵)

نہیں سُنتے۔ نہیں سمجھتے۔ لکھے جاتے ہو۔ بکے جاتے ہو! میں ایک نئی دنیا کے دروازہ پر کھڑی ہوں۔ میرے تخیل کے تمام دیوتا اپنے سنگھاسنوں میں اوندھے پڑے ہیں۔ جس معبود کی میں نے ساری عمر پوجا کی وہ آج سر نہیں اُٹھاتا! میرے لئے اس نئی دنیا میں جس کا دروازہ تم کھول رہے ہو۔ موت بھی ہے اور زندگی بھی ــــ کیا ملیگا؟ ــــ کیا پاؤنگی؟ ــــ خبر نہیں!

(۲۶)

نہیں جواب کا انتظار رہے۔ کس جواب کا انتظار رہے؟ کس کے جواب کا انتظار ہے؟ ــــ مجھے بھی جواب کا انتظار ہے! اپنی قسمت سے ایک سوال کیا ہے۔ اُس کے جواب کی منتظر ہوں ــــ آسمان کو تک رہی ہوں ــــ صبر کرو۔ انتظار کرو!

(۲۷)

فیصلہ کر لیا! اُس جنت کا دروازہ بند کر لو۔ جہاں تم مجھے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ عالم میرے لئے نہیں ہے! میرا فیصلہ آخری ہے! جاؤ میری زندگی کی حدود سے باہر نکل جاؤ۔ اتنی دور کہ میرا ایک نقش قدم بھی نہ پاسکو۔ جتنا رونا چاہو رو لو! سر پٹکنا چاہو پٹک لو! مرنا چاہو مر جاؤ! ہر حال میں جو کچھ گذر چکا اُسکو بھول جاؤ!

کسی زمانہ میں میرا غم نصیب دل بہت روشن اور بہت زندہ تھا ــــ اُس گھر میں نور ہی نور تھا ــــ محبت کا نور! ظلمت نام کو نہ تھی ــــ غم اور گناہ کی ظلمت۔ پھر ایک بے وفا نے اُس گھر کو برباد کر ڈالا۔ وہ اس گھر کی خاک اُڑا کر اپنے راستہ پر ہنستا کھیلتا چلا گیا۔ مرد اسیطرح آباد گھروں کو برباد کر کے گذر جاتے ہیں ــــ بھول جاتے ہیں!

تین قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ وہ جو اپنے کو بلا شرط ہبہ کر دیتی ہیں ــــ مرد ایسی عورتوں کی طرف بہت کم توجہ کرتا ہے۔ وہ جو عارضیتاً اپنا جسم مرد کو دیتی ہیں ــــ مرد اُن سے سرراہ تھوڑی سی دلچسپی لیتا ہے اور بھول جاتا ہے ــــ اور وہ جو مرد کے دماغ کا گودا نکال کر پھینک دیتی ہیں۔ اُس کی آنکھیں نکال لیتی ہیں۔ اُس کو جھنجھوڑتی ہیں۔ پٹکتی ہیں۔ ٹھکراتی ہیں ــــ ان عورتوں پر مرد مرتا ہے! میں نے عصمت فروشی کے کھیت میں اس فن کے بہت سے راز سیکھے۔ مگر جب کسی چاہنے والے کے دماغ کا گودا نکالنے کا وقت آتا ہے تو میرے دل کے کسی گوشہ میں رحم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور میں اُس گنہگار کو بخش دیتی ہوں ــــ یہ میری بڑی کمزوری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرے چاہنے والوں کے قافلے آتے ہیں۔ ایک رات کو اس سرائے میں ٹھہرتے ہیں اور گذر جاتے ہیں ــــ میں اسی حال میں خوش ہوں۔ خوش ہوں کہ مجھے کوئی یاد نہیں کرتا ــــ خوش ہوں کہ سب مجھے بھول جاتے ہیں! تم بھی اسیطرح ــــ کسیطرح ــــ بھول جاؤ۔ اُس اُجڑے گھر کی دیواریں جو میرا دل ہے آخری تباہی کے بعد پھر بنالی ہیں۔ اور اس دفعہ اُس گھر کے تمام دروازے اور روشندان بند کر دیئے ہیں تاکہ باہر کی ہوا اور روشنی کسی طرح اندر داخل نہ ہو سکے ــــ لیکن ــــ میرے گھر کی تاریکی میں کہیں سے ایک شعاع داخل ہو رہی ہے۔ الٰہی! یہ کیا غضب ہو رہا ہے! شاید دیوار کی کوئی اینٹ یا پتھر کا کوئی ٹکڑا کہیں اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ دیواروں کی چنائی میں کوئی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جو باہر کی روشنی کو اندر آنے کا راستہ دے رہا ہے۔ اب میرے [illegible] کیا ہوگا۔ اگر پھر اس گھر کے روشندان کھل گئے؟ اگر پھر اس راکھ کے ڈھیر میں کسی چنگاری نے گھر بنا لیا۔ کیا پھر ایک دفعہ مجھے اپنے تمام ہتھیار جسم سے جدا کرنے ہوں گے؟ میرا زرہ بکتر پھر میرے جسم سے اُتارا جائے گا؟ میری تلوار میری کمر سے کھولی جائیگی؟ پھر مجھے بے دست و پا کر دیا جائے گا؟ میں پھر محبت کی عریانی کو چھپانے کے لئے ایک بیوفا مرد سے لباس مانگونگی؟ میرے دل میں گناہ کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائیگا؟ محبت کی زنجیریں میرے وجود کو پھر باندھ کر ڈال دینگی؟ الٰہی کیا ہوگا؟ میں ڈر رہی ہوں۔ کانپ رہی ہوں! گویا ایک طوفانی سمندر کے ساحل پر

کھڑی ہوں۔ موجیں بڑھتی آتی ہیں۔ بڑھتی آتی ہیں! کیا پھر یہی کشتی کسی ملاح کی محتاج ہوگی؟ رب العالمین! ایسا تو نہ ہو ۔۔۔ مر جاؤں گی! ختم ہو جاؤں گی!! گناہ کی شہنشاہیت پہ محبت کی حکومت کو ترجیح نہیں ہو سکتی ۔۔۔ نہیں ہو سکتی ۔۔۔ نہیں ہونی چاہئے ۔۔۔ نہیں ہوگی! میں بھاگ جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ میں ڈوب جاؤنگی محبت کے بیرحم دیوتا کا تیر میرے سینہ تک پہنچنے نہ پائے گا۔ میں کیوں گناہ کی گہری نیند سے جگائی جا رہی ہوں۔ میں نہیں جاگنا چاہتی ۔۔۔ یہ نیند میرے لئے موت کی نیند ہونی چاہئے ۔۔۔ زندگی میں نہیں چاہتی ۔۔۔ نہیں چاہتی! کیوں مجھے پھر زندہ کیا جا رہا ہے؟ کیا اس کے سوا میرے گناہوں کی اور کوئی سزا تجویز نہیں ہو سکتی؟

"تو بھاگتی ہے، کہاں بھاگ کر جائے گی؟ تو گرفتار کی جائیگی۔ تو مردوں کی نیند سونا چاہتی ہے۔ تو جگائی جائے گی"۔

کوئی میرے کان میں بار بار کہہ رہا ہے۔ اور میں چیختی ہوں۔ "بھاگ جاؤں گی۔ بھاگ جاؤں گی۔ ہاتھ نہ آؤنگی! مر جاؤں گی۔ مجھے جگاؤ مت! سونے دو۔ جگاؤ مت! گناہ کی نیند میں مجھے موت کے خواب دیکھنے دو ۔۔۔ محبت کے زہر کا مزا ابتک زبان پہ باقی ہے ۔۔۔ کیا وہی زہر پھر پلاؤ گے؟ نہیں ہوگی ۔۔۔ نہیں ہوگی ۔۔۔ گناہ کی نیند میری راحت کا تنہا وسیلہ ہے۔ گناہ اور بے شرمی کو اپنا بنا کر بے شرم اور بے حجاب ہو کر گناہ کا ارتکاب کرتی ہوں۔ پتھر کی طرح سرد، سخت اور بے حس ہو کر! نہ کچھ دیکھتی ہوں۔ نہ کچھ سنتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے جگاؤ نہیں ۔۔۔ سونے دو ۔۔۔ میری خوابگاہ میں آہستہ قدم اٹھاؤ۔ میں جاگ اٹھی تو مر جاؤنگی!!

میری عمر کا بہترین حصہ۔ آہوں اور آنسوؤں کا ایک مجموعہ ہے۔ اب کہ میں ان آنسوؤں اور آہوں کے کرب کو بھول کر گناہ کے قہقہہ میں مست اور بے خبر ہوں۔ مجھے مست اور بے خبر رہنے دو۔ اس مستی اور بیخبری کو اس زہر سے تلخ نہ کرو۔ جو عورت کمبخت کے دل میں محبت بن کر سرایت کرتا ہے!!

میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم تم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں۔ میں تمہاری دنیا سے دور اپنے کو مفقود الخبر کروں اور تم میری دنیا سے دور اپنی دنیا میں جو کچھ گذر چکا ہو اس کو بھول جاؤ۔ وہ نہ کر سکی جو کرنا چاہتی تھی۔ بزدل ہوں ہمت نہیں۔ اختیار نہیں۔ ہو سکتا تو جان دے کر اس قضیہ کا خاتمہ کر دیتی۔ یہ نہ کر سکی۔ اب بھاگی جاتی ہوں خبر نہیں کہاں +

تیسری کتاب

ایک سال بعد

(۲۹)

بیچارگی اور بے کسی کی گھڑیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے بھی طویل ہوتیں۔ اگر گناہ کے ہنگامو

میں گذرے ہوئے واقعات کو بھول نہ گئی ہوتی! پورا ایک سال تو نہ گذرا ہوگا۔ جب میں تمہارے دستِ طلب سے بچ کر بھاگی تھی۔ اس عرصہ میں عمر کی صدیاں اس طرح گذر گئیں جس طرح تمہارے لئے۔ تم جیسے عشاق عشاق کے لئے، وصل کی ایک شب! ہر دن اور ہر مہینہ ایک لمحہ اور ایک ساعت سے زیادہ نہ تھا۔ گذشتہ سال کی طغیانی کے بعد جب دریا اُترا تو اُس کے کناروں پر کیچڑ اور متعفن کوڑا، اور سڑی ہوئی لاشیں جو باقی رہ گئیں اُن کی گندگی میں میں نے یہ بارہ مہینے آنکھ بند کر کے گذار دئے! بھاگ جانے کا آخری فیصلہ میرے لئے پہاڑ کی چڑھائی تھی، مشکل سے چڑھ سکی۔ مگر چڑھ گئی۔ تم کھینچتے ہی رہے۔ روکتے ہی رہے۔ لیکن ایک شدید ہیجان و اضطراب کا عالم تھا کہ میں تم سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگی اور چڑھائی پر چڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ چوٹی پر پہنچ کر دم لیا ذرا اطمینان ہوا کہ تم بہت دور رہ گئے۔ میں ہاتھ نہ آئی گی۔ مگر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ دوسری طرف کا اُتار اس چڑھائی سے بھی زیادہ مشکل ہے! ۔ چڑھائی میں تمام قوت صرف کر دینے کے بعد اُتار کیوقت ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں رہتے اور چڑھنے والا چڑھ کر جو بے اختیار پست ہے تو پھسلا چلا جاتا ہے! باوجود تمہاری مزاحمت کے میں نے پہاڑ کی چڑھائی طے کر لی۔ مگر یہ کیا خبر تھی کہ پہاڑ کے اُتار پر دوسری طرف قسمت مجھے کہاں لیجائے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ گذشتہ بارہ مہینوں میں میں نے اپنے وجود فانی کو پہلے سے زیادہ وارفتگی کے ساتھ عصمت فروشی کے دوزخ میں جھونک دیا ہے۔ اور میں تم سے کیا کہوں کہ کس طرح میں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ——— گذشتہ ایک سال میں ——— گناہ سے خالی نہیں چھوڑا معصیت، نفس پرستی، حسن فروشی! (دنیا والوں کی اصطلاح میں جو چاہے کہو) کے ہجوم اور ہنگامہ میں میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ کچھ بھی یاد نہ رکھا ——— کم از کم بھلانے اور بھول جانے کی پوری کوشش کی۔ اُترے ہوئے دریا کے کنارے میں کیچڑ اور کوڑے کرکٹ میں کھیلنے لگی۔ گندگی کا احساس، اگر پہلے کچھ تھا تو اُس کو بھی میں نے اپنے دل سے مٹا دینا چاہا! میری زندگی کا ہر دن عشاق کی تلاش میں گذرنے لگا۔ اور ہر شب میں نے عہد کر لیا کہ میرا بستر خالی نہ رہے گا! اس طرح کم و بیش ۳۶۵ دن اور ۳۶۵ راتیں بسر گذار چکی!! اپنے خیال میں تو میں نے ازدواجی زندگی کے تمام امکانات کا خاتمہ کر لیا۔ اور اب میں سمجھتی ہوں کہ میرا وجود معنوی بھی اسقدر گندہ ہو گیا ہے اور میرا ظاہری حسن بھی اسقدر پھیکا پڑ گیا ہے کہ تم ایک دفعہ دیکھ کر منہ پھیر لو گے! میری روح کا تعفن میرے جسم کے ہر رونگٹے سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ پہلے میرے لباس زندگی کے چند ٹکڑے شاید ناپاکی کے دھبّوں سے بچے ہوئے تھے۔ مگر میں نے وہ لباس ہی پھاڑ کر پھینک دیا! اب عریاں ہوں ——— شیطان کیطرح عریاں!! جب تک پانی گندہ تھا اور اسقدر متعفن نہ تھا تم اُس کو اپنے لئے آب حیات سمجھتے رہے۔ اب صرف کیچڑ باقی ہے اور وہ بھی نہایت متعفن۔ اب تو شاید تم قریب آنا بھی گوارا نہ کرو گے۔ معلوم نہیں تم کو کس طرح میرا پتہ معلوم ہوا۔ بہرحال تمہارے خط کے آنے سے میں خوف زدہ نہیں ہوئی۔ اب تو وہ عالم ہے کہ جب چاہو آکر مجھے دیکھ لو۔ لیلیٰ اب وہ لیلیٰ ہی نہیں جس کو تم پیام محبت دیتے تھے۔ اپنے حُسن ظاہری کو میں نے دونوں ہاتھوں

سے لُٹایا ہے۔ میرا چہرہ اب بے نور ہے۔ میری روح تاریک ہے۔ میرے عارض کی چمک جو کچھ ہے وہ پوڈر اور غازہ کی مرہونِ منت ہے۔ گویا چہرہ پر ایک خول چڑھا ہوا ہے۔ صبح کو میری صورت دیکھو تو چڑیل نظر آتی ہوں۔ شام کو میری بے رونقی دیکھنا چاہو تو تھیٹر کی لال پری معلوم ہوتی ہوں۔ حُسن کا سرمایہ ختم کر چکی ——— دیوالیہ ہوں! اپنی صورت کی کشش اور جاذبیت کو مٹا کر میں نے اپنی زندگی کو اسقدر مسخ کر دیا ہے کہ اب میری حالت کو دیکھکر تم حیران رہ جاؤ گے۔ تمہارے آنے اور ملنے سے اب میں نہیں گھبراتی! گھر کا سارا اثاثہ لُٹا چکی۔ اب چوروں کا کیا ڈر!

بہتر یہ تھا کہ تم اپنا وقت اب ضایع نہ کرتے اور مجھ تک آنے کی تکلیف نہ اُٹھاتے۔ مگر آنا چاہتے ہو تو آؤ جتنی راتیں تم چاہو گے میرے بستر پر بسر کر سکو گے۔ اپنے دیو کو آسودہ کر کے چلے جانا۔ میری تمہاری عشق و عاشقی تو انشاء اللہ پہلے ہی دن مجھے دیکھ لینے کے بعد ختم ہو جائے گی!! اب جو میں نے اپنی حالت بنالی ہے وہ تمہارے عشق کا اچھا علاج ہے! میں نے اپنی اُس لغزش کا کافی انسداد کر لیا ہے۔ جو نہ جانے کیونکر تمہارے نکاح کے پیغام کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ اُس زمانہ کو اب میں اس طرح یاد کرتی ہوں جس طرح ملیریا کے موسم کے جاڑے بخار کو صحت ہو جانے کے بعد مریض یاد کرتا ہے! آؤ تمہارے جاڑے بخار کا علاج بھی کر دوں! میری زندگی کا وہ سمندر جسمیں تم اپنی کشتی لے کر آ گئے تھے۔ اور جس کے پانی کو تمہارے پتواروں نے متلاطم کر دیا تھا۔ اب محض ایک چہ بچّہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اُس میں پانی باقی نہیں محض کیچڑ ہی کیچڑ ہے! عورت کی وہ کمزوری جس کو لوگ "محبّت" کہتے ہیں۔ اور جس سے مرد ہمیشہ ناجائز فائدہ حاصل کرتا ہے۔ وہ کمزوری جس کی ایک جھلک تم نے دیکھی تھی۔ وہ سب فنا ہو چکی۔

میں تم سے اور تمہارے عشق کی شورش سے ڈر کر بھاگتی تھی۔ اور کچھ عرصہ تک بہت ڈرتی رہی۔ یہاں آنے کے بعد بھی کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں میرے اندر کوئی دوسرا وجود مجھے دھمکایا کرتا تھا:-

"لیلیٰ! بچنا مشکل ہے۔ تیرے دل میں تو ابھی تک چنگاری موجود ہے۔ تو تو ابھی تک محبت کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے۔ تیرے دل کی پُرانی قبر میں وہ مردہ ابھی تک کروٹیں لے رہا ہے! اب کیا کرے گی؟ کہاں بھاگ کر جائے گی؟ تیرے حُسن کو عشق کی بارگاہ میں ہتھیار رکھ دینے ہی پڑیں گے!"

پھر میرا شیطان میری مدد کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا:-

"گھبراتی کیوں ہے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ "لیلیٰ"! تو ڈرتی ہے؟ تو ——— جس نے سینکڑوں موذیوں کو اپنی چٹکی میں مسل ڈالا ہے؟ عشق ایک دھوکہ ہے۔ محبت ایک فریب ہے۔ بھول کر بھی اس کا خیال نہ کیجو۔ تجھے تو مردوں سے اُن مظالم کا انتقام لینا ہے جو تجھ پر کئے گئے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو تباہ کئے جا! مٹائے جا! اُن کے وجود ظاہری و

باطنی میں ایسا زہر ملا دے کہ اُن کی نسلیں ہمیشہ تلخ کام رہیں! گھبرا نہیں، تیرے
ڈنک میں کافی زہر ہے! فتح تیری ہے شیروں کے پنجے اور بھیڑیوں کے دانت توڑ دے!"

میرا شیطان جتنی باتیں کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ جو راستہ مجھے بتاتا ہے صحیح بتاتا ہے۔ عشق و محبت سے زیادہ شیریں انتقام کا جذبہ ہے۔ میرا شیطان انتقام کا دیوتا ہے۔ وہ میرا ہمدم و ہمراز ہے۔ خلوت میں میرا سہارا اور محفل میں میرا محافظ ہے!

چند ہی روز میں میں نے اپنے کو تمہاری عشق و عاشقی کے مقابلہ میں پہلے سے زیادہ محفوظ کر لیا ہے۔ آؤ! اگر آنا چاہتے ہو۔ عشق کا کھوٹا سکہ میری دوکان پر نہیں چلتا۔ سونا چاندی جسقدر جیبوں میں بھر کر لا سکو لیتے آنا۔ آؤ تو ایسے آؤ جیسے دولت والے بازار کو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ آؤ جس طرح سڑک پر لڑکے کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہیں! ـــــ منہ اُٹھائے آسمان کو تکتے ہوئے۔ ہاتھ میں بانس کا ایک ٹکڑا۔ بھاگے چلے جاتے ہیں۔ خبر نہیں سامنے خندق ہے۔ دیوار ہے یا درخت ہے! پیسہ پاس نہیں۔ مفت کی پتنگ لوٹنا چاہتے ہیں! یوں آنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اپنے نفس کو اپنا راہنما بناؤ ـــــ وہ تمہارا خدا ہے۔ پھر میرے بستر اور آرائش دل کے مالک بنو۔ میرے پوڈر سے پکے ہوئے رخساروں سے اپنے ہونٹ سفید کرلو۔ میرے عطر میں بسے ہوئے جسم سے اپنا لباس معطر کرلو۔ میری بنائی ہوئی پلکوں اور ابروؤں کی شان میں قصیدے پڑھو۔ ایک شب۔ دو شب۔ ہزار شب۔ جتنا روپیہ صرف کرسکو ـــــ میرے مہمان رہو۔ پھر تھک جاؤ تو گھر جا کر کسی "شریف" خاندان میں کسی نیک بخت لڑکی کو اپنا شریکِ زندگی بنالو ـــــ اور سیدھے حج کرنے چلے جاؤ! پھر تم سے زیادہ سچا مسلمان اور تم سے زیادہ پاکباز "شریف" کون ہوگا؟

جب آنا ہو تو خط لکھ دینا تاکہ تمہارے لئے چند راتیں محفوظ رکھوں!

---

(۴۰)

گناہ؟ کیا کہا؟ گناہ کس کو کہتے ہیں؟ جس چیز سے دنیا میں انسان کو مفر نہ ہو۔ جو اسقدر عام ہو کہ ہر ایک انسان اس میں مبتلا ہو۔ اُس کو گناہ کیوں کہو؟ اگر پانی پینا گناہ ہے۔ آنکھوں سے دیکھنا گناہ ہے۔ کانوں سے سننا گناہ ہے۔ تو پھر بتاؤ وہ کونسی بات ہے جو گناہ نہیں ہے؟ کون ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بے انصافیاں نہیں کرتا۔ ایک ایک گز زمین پر جان نہیں دیتا۔ ایک ایک کوڑی کے لئے اپنے بھائیوں سے نہیں لڑتا۔ ایک ایک لقمہ کے لئے جان دینے اور لینے پر آمادہ نہیں ہو جاتا ـــــ کون ہے بادشاہ سے گدا تک، مسجد کے سب سے اونچے مینار۔ مندر کے سب سے بڑے گھنٹے سے لے کر دوکانہ والی میونک؟ بات یہ ہے کہ دنیا میں گناہ کوئی چیز ہے نہ ثواب۔ ساری انسانی زندگی کی بنیا صرف دو چیزوں پر ہے۔ قوی اور ضعیف۔ قوی ثواب ہے ضعیف گناہ ہے! قوت یکسر خیر ہے اور ضعف یکسر شر! صرف وہی

قانون ہیں۔ دو ہی مذہب ہیں۔ دو ہی مسلک ہیں۔ دو ہی قومیں ہیں۔ انسانیت کے دو ہی اصول ہیں۔ ترازو کے دو ہی پلے ہیں! بس! قوی اور ضعیف، قوی اور ضعیف! قوی اور ضعیف! ان دو لفظوں میں دنیا کی ساری زندگی کی تفصیل مرکوز ہے! قوی قانون بناتا ہے۔ ضعیف سزائیں پاتا ہے۔ قوی سر بفلک مینار بناتا ہے ضعیف قبریں کھودتا ہے۔ جو شراب قوی پیئے وہ بالکل جائز اور حلال ہے۔ جو ضعیف پیئے وہ مطلق حرام و ناجائز! جو زنا قوی کرے وہ محض ایک فطری فعل ہے۔ اور ضعیف اگر قوی کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف عورت کے پاس جائے تو وہ زانی اور بدکار۔ اُس کے لئے سزا قید بھی اور موت بھی! قوی جب اپنے محل میں دو ہزار عورتیں اور لونڈیاں بھر لے تو وہ سب رانیاں اور بیگمات ہیں۔ لیکن اگر ایک سے زیادہ عورت کو بہ یک وقت اپنے پہلو میں بٹھائے تو وہ گناہگار، عیاش اور بدچلن! بڑے سے بڑا بدکار اور عیاش، قاتل، شراب خوار، امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین اور ظل اللہ اور مہاراج اور ہیراج ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کے غلاموں کو عیاشی اور قتل اور شراب خواری کی پاداش میں ہر روز سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں تم کہو گے کہ بغیر اس کے انسانی تمدن کا شیرازہ کیونکر قایم رکھا جا سکتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ بغیر اس تمدن کے کیا دنیا آباد نہ تھی۔ خوش نہ تھی۔ مطمئن نہ تھی۔ قوی اور ضعیف کا مقابلہ اگر محض جسمانی طاقت تک محدود رہے تو وہ اقتضائے فطرت ہے۔ لیکن جب سوسائٹی کے ہر طبقہ میں ہر دو انسانوں کے درمیان یہ مقابلہ ہر لحہ اور ہر گھڑی جاری رہے اور اُس کی بنیاد بھی قوئے جسمانی کا تفوق نہ ہو۔ بلکہ چالاکی، عیاری، مکاری تفوق کی بنیاد قرار پائے تو یہ دنیا جہنم سے کس طرح کم ہے! ہم جب اس جہنم میں شاد و ناشاد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو پھر اُس دوسرے جہنم سے ڈرنا کیا۔ جس کی دھمکیاں مذہب دیتا ہے! میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ جہنم شاید اس دنیا سے زیادہ آرام دہ جگہ ہوگی۔ ہاں یہ یہ تو نہ ہوگا کہ قوی کی سیاست ضعیف کو کچل رہی ہو! ہماری دنیا میں اعلیٰ دماغ وہ کہلاتے ہیں جو دوسروں کو غلام بنانے کا فن جانتے ہوں۔ سیاست اُس کو کہتے ہیں کہ ایک فرد اور ایک قوم کے وسیع پیٹ میں دوسرا فرد اور دوسری اقوام منضم کی جا سکیں۔ معاشرت اس کو کہتے ہیں کہ ایک چھوٹا دولتمند اور چالاک طبقہ باقی تمام طبقوں پر جابرانہ حکومت کر سکے۔ ہماری معاشرت میں بھی نوع انسان کے صرف دو طبقے ہیں۔ برہمن اور اچھوت! مسلمان۔ ہندو۔ عیسائی۔ پارسی۔ ایرانی۔ عرب سب اسی تقسیم کے ماتحت ہیں۔ آقا اور غلام! برہمن اور اچھوت! سرمایہ دار اور مزدور "مولانا" اور مرید! ان مختلف ناموں کے ساتھ سوسائٹی کی ترکیب ہر جگہ وہی ایک ہے۔ بُرا اچھا۔ گناہ، ثواب۔ پاک، ناپاک۔ بلند، پست۔ مومن و کافر۔ حاکم و محکوم۔ آقا اور غلام یہ سب اصطلاحیں قوی وضع کرتا ہے۔ اور اُن ہی کے معیار پر ضعیف جانچے جاتے ہیں! اگر آج تم کمزور ہو جاؤ اور میں قوی ہو جاؤں تو تمہاری تمام نیکیاں گناہ اور جرم قرار دی جا سکتی ہیں۔ اور میرے تمام گناہ اعمال حسنہ میں شمار ہونے لگیں! کیا خدا نے جب اس دنیا کو پیدا کیا تھا تو اُس کا منشا یہی تھا کہ اس طرح اُس کے بندوں کی زندگی کا نظم قایم کیا جائے! تم چونکہ میرے مقابلہ میں قوی ہو۔ اس لئے یہی کہو گے کہ یہ در و بست جو کچھ ہے، فطرت الٰہی کے مطابق ہے۔ میں

چونکہ کمزور ہوں مجھے تمہارا یہ قول فیصل ماننا پڑیگا۔ مگر میرا ایمان یہیں ہے۔ تم میرا سارا لباس اُتار لو۔ تم میری عصمت کو خاک میں ملا دو۔ تم مجھے اپنے گھر کی ماما اور لونڈی بنا دو۔ مگر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جسکو کوئی قوی کسی ضعیف سے نہیں چھین سکتا! فطرت الٰہی کی یہی سب سے مضبوط چٹان ہے جو مظلوموں کا سہارا ہے۔ مرد نے اپنی قوت سے عورت کی ہستی کو مٹا دیا ہے۔ مگر ابھی تک وہ اُس کے ایمان کو نہیں مٹا سکا ہے۔ ہندوستان میں کم از کم اور غالباً تمام ایشیا میں عورت ایک دفعہ مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے جو تمہاری سوسائٹی کے خودساختہ شیرازہ کو درہم برہم کر دیگی۔ ہم تم غالباً دنیا میں زندہ نہ ہوں گے۔ جب وہ طوفان نوح آئیگا۔ لیکن ہماری آئندہ نسلیں عورتوں کو مردوں سے جگہ بدلتے ہوئے دیکھیں گی۔ وہ نسلیں ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لینگی اور بلاشبہ جفاکار مردوں کے لئے وہ یوم الحساب بہت سخت ہوگا!!

عورتوں کی جو بات تم کو ناپسند ہو تم لوگ بے تکلف کہہ دیتے ہو کہ یہ گناہ ہے۔ یہ جرم ہے۔ لیکن ہم اگر تمہارے کسی گناہ یا جرم کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں تو تم ہماری آنکھیں پھوڑ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ مجھ جیسی بازار میں بیٹھنے والی عورتیں سب سے زیادہ رحم نصیب ہیں۔ اور سب سے زیادہ مظلوم۔ وہی انشاء اللہ باغیوں کی سب سے پہلی صف میں کھڑی ہونگی اور اپنے نیزوں کی نوک تمہارے سینوں پر رکھ کر تم سے کہیں گی:۔

> "لاؤ! جو کچھ تم نے گذشتہ صدیوں میں ہم سے چھینا ہے۔ اُس خون کے ایک ایک قطرہ کا حساب دو جو تم نے بہایا ہے۔ مٹے ہوئے ارمانوں۔ ٹوٹی ہوئی امیدوں۔ زخمی دلوں اور بگڑے ہوئے نصیبوں کی قیمت ادا کرو! ایک ایک زخم گن لو جو تم نے لگایا تھا۔ ہر زخم کے بدلے میں تمہاری بدکردار روح کو ٹکٹکی سے باندھ کر ہزار ہزار چابک لگائے جائیں گے!!"

اُس دن تمہارے عزیزوں کی کمر ٹوٹے گی اور اُس دن خدا کے انصاف کی ترازو کے پلّے برابر ہو جائینگے!!

انتقام کا یہ جواب میری طرح ہزاروں عورتیں کہہ رہی ہیں۔ تمہارا ظلم بڑھتا جائیگا اور ہمارا جذبۂ انتقام بھی قوی تر ہوتا جائیگا۔ ہماری تعداد بھی بڑھتی جائیگی۔ تا آنکہ ایک دن قوی اور ضعیف جگہ بدل لیںگے!!

ان بے سروپا تخیلات پر حقارت کی ہنسی ہنسو۔ ہنستے جاؤ۔ ہنس ہنس کر عورت کے کمزور وجود کو ٹھکرائے جاؤ۔ یہی ہنسی ایک دن موت کا پھندا بن کر تمہارے گلے کی رگوں کو نچوڑ ڈالے گی!!

یہ سب اُس اشارے کا جواب ہے جو تم نے اپنے خط میں میرے گناہوں کی طرف کیا تھا!

کچھ اور سنوگے؟

(۴۱)

قصبہ کے باہر ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں کوئی بڑھیا رہتی تھی۔ ایک دن اُس کا جی چاہا کہ کھیر پکائے۔ دودھ لینے کے لئے اُس نے اپنے بچے کو بازار بھیجا۔ بچہ دودھ لے کر آرہا تھا کہ راستہ میں ایک کٹی ہوئی پتنگ گرتی نظر آئی۔ سڑک پر بہت سے لڑکے اُس پتنگ کو لوٹنے دوڑے۔ وہ بھی دوڑا۔ دودھ کا پیالہ اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ اور اُس کے ٹکڑے سڑک پر پڑے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک رئیس زادے اپنی موٹر دوڑاتے ہوئے اُس سڑک پر گذرے۔ پیالہ کا ایک نوک دار ٹکڑا موٹر کے ٹائر میں گھس گیا۔ ٹائر کے پھٹ جانے کی وجہ سے اُن کو کچھ دیر قصبہ میں ٹھہرنا پڑا۔ وہ اپنا ٹائر درست کر رہے تھے کہ سامنے کے مکان کے دریچہ میں انہوں نے حسین لڑکی کو دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ عاشق ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد اُس لڑکی سے رئیس زادہ کا نکاح ہو گیا۔ اس ازدواج سے سات اولادیں پیدا ہوئیں۔ اُن سات بچوں میں سے ہر ایک، ایک نئے گھر کا چراغ بنا ——— خاندان دنیا میں پیدا ہوئے۔ اُن سات سے دنیا کی آبادی میں ستر ہزار انسانوں کا اضافہ ہوا ——— اب اگر قصبہ کی بڑھیا کے دل میں اُس دن صبح کو کھیر کھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ اور بجائے کھیر کھانے کے اُس نے کھچڑی کھانے کا ارادہ کیا ہوتا۔ تو وہ نہ بازار سے دودھ منگاتی۔ نہ پیالہ سڑک پر ٹوٹتا۔ نہ رئیس زادہ کی موٹر کا ٹائر خراب ہوتا۔ نہ اُس کا نکاح اس لڑکی سے ہوتا۔ نہ سات اولادیں پیدا ہوتیں۔ نہ سات گھر آباد ہوتے!! بڑھیا کی ذرا سی خواہش نے دنیا کی آبادی میں کتنا بڑا اضافہ کر دیا ——— ...

خان صاحب کی بیوی بہت ضدی اور تیز مزاج تھیں۔ خان صاحب کا مزاج بھی نازک اور جلد مشتعل ہونے والا تھا۔ گھر میں صبح کی چاء کے وقت ماما نے مکھن نالی میں گرا دیا۔ بیگم صاحب نے غصہ کی حالت میں ماما کے دو طمانچے مار دیئے۔ ماما نے اپنے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر خان صاحب سے شکوہ کرنے آیا۔ خان صاحب صبح کی چاء پر مکھن نہ ملنے کی وجہ سے بدمزاج ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے ماما کے شوہر کے ایک گھونسہ مار دیا۔ وہ گھونسہ اُس شخص کی کمزور تلی پر پڑا۔ تلی کے پھٹ جانے سے ماما کا شوہر مر گیا۔ خانصاحب قتل کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور سات برس کے لئے جیل خانہ گئے۔ بیوی اس صدمہ میں مر گئیں۔ جائداد قرضہ میں بک گئی۔ آج نہ خانصاحب کا یاد کرنے والا کوئی باقی ہے۔ نہ اُن کی بیوی کی قبر پر کوئی چراغ جلانے والا! ——— بات صرف اتنی تھی کہ صبح کو مکھن کی ایک گولی نالی میں گر گئی تھی! تم کہو گے کہ اُس صبح کو اگر مکھن کی گولی نالی میں نہ گر گئی ہوتی تو شاید یہ سارا خاندان اس طرح تباہ نہ ہو جاتا ——— ...

ایک مٹھی بھر خاک۔ ایک چیونٹی۔ ایک مچھر۔ ایک تنکا۔ چلّو بھر پانی۔ درخت کا ایک پتا۔ پھول کا ایک کانٹا ایک خفیف سی خواہش۔ ایک ذرا سا وہم۔ بڑے بڑے واقعات اور بڑے بڑے نتائج کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ سر راہ ایک خفیف واقعہ کے بطن سے اکثر خوفناک اور خونریز انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ شہنشاہوں کے تخت لوٹ جاتے ہیں۔ پانی کی سطح پر ایک چھوٹا سا سنگریزہ پھینکو تو کتنے بڑے بڑے حلقے بنتے

ہیں! چڑیا کسی درخت کا ایک بیج لے کر اُڑ جاتی ہے۔ کسی بیابان میں وہ بیج اُس کی چونچ سے نکل کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا اُس بیج پر ایک مٹھی بھر خاک ڈال دیتا ہے۔ بادل چند قطرے اُس مٹھی بھر خاک پر گرا دیتا ہے ——— پچاس برس بعد اُس بیان میں سینکڑوں میل تک ایک گھنا جنگل، چرندوں پرندوں اور درندوں کا مسکن ہوتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ اُس ویرانہ میں وہ پہلا بیج کیونکر آیا تھا۔ اُس ابتدا اور اس انتہا کے تفاوت کو دیکھو! ——— اگر پرندہ اُس بیج کو لیکر نہ اُڑا ہوتا تو یہ سینکڑوں میل کا ویرانہ ہی ویرانہ بنتا ———

اسباب و نتائج کا یہ سلسلہ کسقدر دلچسپ اور کسقدر خوفناک ہے۔ اور پھر غور کرو کہ ہمارے ہر سانس کے ساتھ یہ اسباب پیدا ہوتے ہیں — ایسے خفیف کہ ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی! ذرا سوچو کہ ہماری تمہاری زندگی ہمارے تمہارے اختیار سے کسقدر باہر اور فہم و ادراک سے کسقدر بالاتر ہے۔ مگر ہم کو ——— اور عورتوں سے زیادہ مردوں کو ——— دعوےٰ ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں!

میرے اور اپنے تعلقات ہی پر ایک نظر کرو۔ کتنی معمولی بات تھی کہ تم اُس شب کو محفل میں آئے اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے میرے قریب بیٹھ گئے۔ پھر کتنی ذرا سی بات تھی کہ میرا جلتا ہوا سگریٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا! اور تم نے اُسے اُٹھا کر مجھے دیدیا۔ اور میں نے تمہارا شکریہ بھی ادا کیا۔ بہرحال اگر اُس شب کو وہ کمرہ جس میں محفل جمی تھی۔ اسقدر تنگ نہ ہوتا۔ اگر میرا سگریٹ اتفاقاً میرے ہاتھ سے گرا نہ ہوتا اور اس طرح مجھ سے اور تم سے بیگانہ وار چند باتیں نہ ہوئی ہوتیں تو اس کے بعد گذشتہ دو برس میں میری تمہاری زندگی میں جو زلزلہ آتا رہا ہے وہ کیسے پیدا ہوتا؟ خدا جانے میں کہاں ہوتی اور تم کہاں ہوتے اُس شب کو نہ تم مجھ پر عاشق ہونے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ نہ مجھے اُس وقت چاہنے والوں کی تلاش تھی۔ میرا وہ پہلا دن تھا کہ میں ایک عام محفل میں پیشہ ور کی حیثیت سے شریک ہوئی تھی۔ اس دنیا میں جہاں میں اب ہوں وہ میرا پہلا قدم تھا! پھر اُس شب کی مختصر ملاقات کے بعد بھی ایک زمانہ گذر گیا۔ میں اپنے پیشہ میں مشغول رہی اور تم اپنے تعیش میں۔ میں تو دوسرے دن صبح ہی کو بھول چکی تھی کہ تم کون ہو۔ اور تم بھی بظاہر مجھ سے ملنے کے لئے بیتاب نہ تھے۔ مگر وہ بیج جو اُس محفل سے کوئی چڑیا لے کر اُڑ گئی تھی۔ عرصہ تک ایک ویرانہ میں پڑا رہا اور ہم تم اُس کی نشو و نما سے بالکل بے خبر رہے۔ لیکن کہیں کوئی باغبان تھا جو اس بیج کی سیوا کر رہا تھا! دو سال کے اندر ہی وہ بیج تمہاری محبت کا ایک جنگل بن گیا۔ جہاں ایک سانس کے لئے بھی ہوا میسر نہ آتی تھی وہاں اب آندھیاں چل رہی ہیں! کیا خبر ہے کیا ہونا ہے۔ محبت اور اُلفت کی آبادیاں آباد ہونگی یا مایوسیوں اور مجبوریوں کے شعلے بھڑک بھڑک کر اس جنگل کو جلا ڈالیں گے۔ ان درختوں کے سایہ کی خنکی میں ہم تم بیٹھ کر زندگی کے دن گذار دیں گے۔ اُن کی گھنی شاخوں میں ہم کوئی آشیانہ بنائیں گے یا کسی دن ایک آندھی ایسی آئے گی کہ وہ درخت جڑ سے اُکھڑ کر ہمارے سروں پر گریگا۔ اور اُس کے

پتے ہماری کھلی ہوئی لاشوں پر ایک سبز چادر ڈال دیں گے ———— کوئی کیا جانے!

تم اپنے عشق کی بانسری بجائے جاؤ۔ میں اپنے حسن کا نغمہ سنائے جاؤں۔ جو کوئی اس بساطِ زندگی کا مالک ہے وہ جس طرح چاہے گا اپنے مہروں کو چلاتا رہے گا"

پرسہ

عرصہ سے تمہیں خط نہیں لکھا۔ کمزوری۔ ہوا کچھ بات ... چل رہی ہے!! سوچتی زیادہ ہوں کہتی کم ہوں کبھی جو پھر ایک دورہ سا پڑتا ہے جیسے کسی نے کتاب کا ورق اوٹ دیا! تمہارا اندازہ غلط نہیں میرے موسم جلد جلد بدل رہے ہیں۔ آجکل ایک انقلابی اور ہیجانی کیفیت ہے۔ خبر نہیں یہ کیسا انقلاب ہے کیونکر کہاں ہے اور کس طرح پیدا ہو رہا ہے۔ کوئی قوت ہے —— ازلی اور ابدی —— جو میری باگیں ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ کوئی دُور کی آواز ہے جو مجھے بُلا رہی ہے۔ کوئی بھولی ہوئی موسیقی ہے جس کی موج کہیں دور پیدا ہوتی ہے۔ آتی ہے اور مجھ کو چھو جاتی ہے۔ میرے وجود باطنی میں ایک نئی لرزشِ حیات ہے۔ جیسے بجلی کے تار پر کہیں انگلی لگ جائے۔ ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس کرتی ہوں۔ جو کیفیات مجھ پر گذر رہی ہیں ان میں عجیب تر کیفیت یہ ہے کہ مجھے اپنی گذری ہوئی جوانی جو کبھی عزیز تھی۔ کچھ عزیز ہوتی جاتی ہے جب سے میں نے اس بازارِ حسن میں دوکان لگائی اپنی جوانی کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی رہی۔ اپنے عاشقوں کے ہجوم میں دونوں ہاتھوں سے اس دولت کو بکھیرتی رہی۔ اور کوشش کرتی رہی کہ لوٹنے والوں کی تعداد بڑھتی رہے یعنی جسقدر جلد ممکن ہو میں اس متاعِ حسن سے فارغ ہو جاؤں۔ لیکن اب جو کچھ گرہ میں باقی رہ گیا ہے اس کو محفوظ کرنے کی خواہش دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ اپنے ہاتھ سے لاکھوں پھول میں تقسیم کر چکی۔ ایک چھوٹی سی کیاری میں کچھ پھول جو باقی رہ گئے ہیں۔ اب میں اپنے دل میں ان چند پھولوں کو سرسبز رکھنے کی خواہش پاتی ہوں۔ —— شاید یہ میرے آنے والے عہدِ پیری کا ایما اشارہ ہے! اشرفیاں لٹانے کے بعد چند بچے ہوئے پیسوں کو گرہ میں مضبوط باندھنے کی خواہش اُسی وقت ہوتی ہے جب افلاس دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ شاید کچھ ایسا ہی حال میرا ہے جب تک یہ دولت میرے پاس وافر تھی۔ بے دریغ لٹی۔ لٹائے گئی! —— اب جبکہ پینے والے میرے میخانہ کی رہی سہی شراب بھی پی گئے تو تلچھٹ کے چند قطروں کو جو خم میں باقی رہ گئے ہیں بچا کر رکھنا چاہتی ہوں —— یا تو یہ بات ہے —— یا —— میں کہہ نہیں سکتی سمجھ نہیں سکتی! زندگی کی سرسبز وادی میں پھولوں کی بہت سی شاخیں خالی ہیں۔ مگر جو کلیاں ابھی تک محروم رنگ و بو نہیں اُن کی بہار قائم رکھنے کی ایک غیر معمولی خواہش میں اپنے اندر کیوں پاتی ہوں۔ میری جوانی بھاگی جاتی ہے۔ میں کیوں اُس کو واپس بُلا رہی ہوں۔ کیوں اُس کے پیچھے دوڑ رہی ہوں؟ اگر یہ عہدِ جوانی کے اختتام کی وہ کیفیت نہیں جو اکثر انسانوں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ تو پھر یہ بات کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنی تجارت کے فروغ کے لئے جو جنس میں



[illegible]

دوکان پر رکھتی تھی اب اُس کو کسی آنے والے کے سامنے ہدیۂ محبت بنا کر پیش کرنا چاہتی ہوں ؟ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو میں اپنا ہدیۂ حقیر اپنی رُوح - اس کی شعریت - اپنی جوانی - اُس کا حسن - اپنی راگنی - اُس کا نغمہ - اپنی ساری پونجی ایک خوان میں رکھ کر اُس کے سامنے پیش کروں اور کہوں :- " اے میرے راجہ یہ مجھ فقیرنی کی نذرِ محبت ہے ــــــ اسکو قبول کر ــــــ تو دیر سے آیا - جب میرا شہر لُٹ چکا تھا میرے خزانوں میں سے جو کچھ باقی ہے وہ تیرا ہے ــــ اس کے بعد میرے پاس کچھ نہیں "

ــــــ حیران ہوں کہ الٰہی وہ کون ہوگا جس کے سامنے میں اس طرح اپنی نذر پیش کرونگی اور جو اس طرح اسکو قبول کریگا ــــــ میں کس کے لئے یہ چند مرجھائے پھول پڑا رکھنا چاہتی ہوں کس کے لئے اپنی حسرت کی کھیتی پر پانی چھڑک رہی ہوں ــــ کس کے لئے ــــ کس کے لئے ــــ کوئی مجھے بتائے ــــــ موت کے کھنڈر سے زندگی کی آوازیں کیوں نکل رہی ہے ؟

عبدالغفار

کبری

شیب اور شباب میں
ہرگز کوئی مفارقت نہیں ہوسکتی
شباب سراپا خوشی و شادمانی ہے ایک نغمہ مرتعش ہے
شیب تفکرات کا ایک عجب رنجیدہ انبار !
شباب گرمیوں کی ایک سہانی صبح سے مشابہ ہے
شیب جاڑوں کی طرح سرد و خنک ہے
شباب ایک طویل مستی - بے ہستی اور ترنگ ہے
شیب چند مختصر انفاس کا مجموعہ ہے
شباب تیز پا - شباب تیز رفتار اور چست ہے
شیب لنگ و معذور !

شباب حرارت و شجاعت ہے
شیب برودت اور مردنی !
شباب ایک وحشت ہے
شیب تسکین اور اطمینان !
اے شیب میں تجھ سے متنفر ہوں !
شباب میں تیرا پجاری اور تجھ پر فدا ہوں
میرا محبوب میرا دلبر جوان ہے وہ پر شباب ہے
اے شیب میں تیری حکم عدولی کر رہا ہوں !!!
(ماخوذ از شیکسپیر)

جواد

غزل

(از جناب حامد اللہ صاحب افسر بی اے)

دکھاوے کے ہیں سب یہ دنیا کے میلے
بھری بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
کرے عشق جو وہ مصیبت بھی جھیلے
ہمارے تو بس کے نہیں جھمیلے
ہمیں صبر بھی عشق ہی نے سکھایا
کہیں کیا کہ ہم کس گرو کے ہیں چیلے
بہت اُن کو باطن میں ہشیار پایا
بظاہر جو ہوتے ہیں الھڑ آنیلے
کھلونے تمنا کے بچپن سے بھائے
نرالے زمانے سے ہم کھیل کھیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے
پڑے رہتے ہیں گھر میں افسر اکیلے

افسر

نغمات

(۱)

دخترِ رز ذرا نہیں بھاتی ! — بن گئے نام کے خراباتی
بلبلِ زار کر رہی ہے فغاں — ہل رہی ہے بہار کی چھاتی
میں وہ محرومِ شادمانی ہوں — جسے برسوں ہنسی نہیں آتی !
دہر میں اسلئے ہوں نالہ کش — جاگ جائے یہ نیند کی ماتی !
سب کو لطفِ حیات حاصل ہے — اور مجھے موت بھی نہیں آتی
ایک دن موت بھی تو آئیگی — پھر مجھے زیست کیوں نہیں بھاتی

غم نہ ہوتا تو زندگی اختر
ایک خوابِ لطیف بن جاتی

(۲)

میں نے جب تنگ آ کے نالہ کیا ! — چرخ نے بھی کلیجہ تھام لیا
کیا خبر کس نے کیا سوال کیا — میں نے کیا جانے کیا جواب دیا
دل نے سینچا ابھی آرزوؤں کو — آرزوؤں نے خونِ دل بھی پیا
اُجڑے دل میں امید کا عالم — جیسے صحرا میں جل رہا ہو دیا
نوجوانی تھی زندگی فی الاصل — یوں میں جینے کو ساری عمر جیا
تھا طبیعت میں سوز پہلے ہی — اس جوانی نے اور ظلم کیا !
ق
مجھ کو جامِ شباب کے بدلے — ساقیا ! تو نے زہر کیوں نہ دیا ؟

موت اور زیست میں نہ تھا کچھ فرق
میں تو اختر برائے نام جیا

اختر انصاری

غزل

(از جناب جلیل قدوائی ۔ ایم ۔ اے)

عشق میں ہم کیا سے کیا ہو جائیں گے بے خدا ہیں باخدا ہو جائیں گے
بادشاہِ وقت ہو جائیں گے ہم جب ترے در کے گدا ہو جائیں گے
درد ہی کی اب دوا ملتی نہیں درد ہی کی پھر دوا ہو جائیں گے
کو بکو گاتے پھریں گے تیرے گیت مطربِ رنگیں نوا ہو جائیں گے
بن کے سرتاپا مجسم رازِ فاش تیرا عشقِ برملا ہو جائیں گے
جذب کر کے تجھ میں اپنا شورِ زیست تیری ہلکی سی صدا ہو جائیں گے
رہ نہ جائے گی کوئی قیدِ مقام منتشر یوں جابجا ہو جائیں گے
ہم بھی تیرے حُسنِ بے پایاں کیساتھ پھیل کر لاانتہا ہو جائیں گے
کر کے پہلے تجھ کو اپنا رہنما خود پھر اپنے رہنما ہو جائیں گے
ختم کر کے نغمۂ سازِ خودی ایک سازِ بے صدا ہو جائیں گے
جانے کیا ہیں دُور رہ کر تجھ سے ہم تجھ سے مل کر جانے کیا ہو جائیں گے

یہ تو سب کچھ ہم نے سوچا تھا جلیلؔ
کیا خبر تھی یہ جُدا ہو جائینگے

جلیلؔ قدوائی

لیڈر کا راہ عمل

(از جناب مولوی غلام محی الدین صاحب بی اے)

ہندوستان کے موجودہ حالات و واقعات کے پیش نظر اس بات کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ کہ تعلیم یافتہ نوجوان بحیثیت لیڈر کام کرنے کے لئے مستعد ہو جائیں اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھائیں ہندوستان کی تین کروڑ آبادی اُن لوگوں کی . . . ہے جنہوں نے موجودہ نظام تعلیم کے تحت اعلیٰ قابلیتیں حاصل کی ہیں۔ ہندوستان مغربی ممالک کے مقابل میں بحیثیت علم غیر تعلیم یافتہ ملک ہے۔ مگر طبیعی طور پر یہاں کے باشندوں میں علم حاصل کرنے کی ضرور قابلیت موجود ہے۔ ہندوستان کے کسان حقیقی معنوں میں جنٹلمین کہلانے کے مستحق ہیں۔ کسی نے کہا ہے غریب بدقسمت دیہاتی جو درجہ سوم میں سفر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے مقابل میں اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل ہوتے ہیں جو ٹھاٹ باٹ اور رعونت و تمکنت کیساتھ درجہ اول و دوم میں سفر کرتے ہیں۔ یہ کہنا صداقت پر مبنی ہوگا کہ مغربی تعلیم نے ہم کو ہماری قدیم شائستگی سے محروم رکھا ہے جس کے بغیر دنیا میں تعلیم کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ہندوستان کے باشندوں نے زندگی کے حقائق اور اُس کا فلسفہ اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پایا ہے۔ جو فی الحقیقت بڑی گرانقدر چیز ہے۔ اس ورثہ کی حفاظت کرنی ہندوستانیوں کا فرض ہے۔ اور اس فلسفہ کو الفاظ کے نئے جامہ میں بھی پیش کرنا انہیں کا فرض ہے +

اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک کی ترقی سے متعلق جس میدان عمل میں نوجوان تعلیم یافتہ گامزن ہوں۔ دوسرے لوگ بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپاہج بن بیٹھا ہے۔ اور ان کی زندگی پر جمود کی سی کیفیت طاری ہے۔ ایسے لوگوں کو قومی زندگی کے دائرے میں اُکسانا اور خواب غفلت سے بیدار کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہندوستان فرض شناس لیڈروں کا محتاج ہے۔ اور ہر شخص سے لیڈر بننے کی زبانِ حال سے درخواست کر رہا ہے۔ ایک شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ہم میں سے ہر شخص اس قابل ہے کہ سر سید تلک اور گاندھی جیسا لیڈر بن سکے۔ ہاں! ہم میں سے ایسے لیڈر تو بہت کم پیدا ہوں گے جن کی طرف ساری قوم کی نظریں لگی ہوئی ہوں۔ اور جن کے ہر اشارے پر ایثار و قربانیاں کرنے کو تیار ہو جائے۔ البتہ چھوٹے چھوٹے لیڈر بہت پیدا ہو سکتے ہیں جن کی فی الحقیقت ضرورت ہے تاکہ قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ اصلاحی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اور ملک کی ابتری اور تنزل کے اسباب جلد دور کے

گوش گذار کرکے اُن کو اُبھاریں تاکہ خود بھی میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔ ملک کو چلتے پھرتے جانوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اعلیٰ دماغوں کی ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی ہے۔ کہ تین سو ملین میں سے صرف دو ملین زیر تعلیم ہیں یعنی منجملہ ڈیڑھ سو صرف ایک شخص موجودہ نظام تعلیم کی تحت تعلیم و تربیت پا رہا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈیڑھ سو افراد کو قعرِ ذلت سے نکالنے کا بارِ گراں صرف ایک شخص کے سر ہوگا یوں تو دو ملین سے کچھ زیادہ ہی زیر تعلیم ہوں گے۔ مگر ان کا شمار تعلیم یافتہ حضرات میں نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر لیٹن لکھتا ہے۔ کہ بڑے بڑے مقرر جو ترقی تعلیم کے متعلق تقریر کرتے ہیں۔ اُن کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ مختلف مضامین و فنون کی کتابوں کا مطالعہ کریں اور اپنی معلومات کا ذخیرہ بڑھائیں۔ اور "تعلیمی تربیت" سے ان کی مراد صرف عقلی قویٰ کی تربیت ہوتی ہے۔ مگر حقیقی تعلیم کا مفہوم عادات و اطوار کی درستی۔ جذبات و احساسات کی اصلاح اور تخیلات و عقلی قویٰ کی تربیت میں مضمر ہے۔ محض معلومات کے بڑھانے یا عقلی قویٰ کے ارتقا سے تعلیم کا حقیقی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ایسے لوگ ملک و قوم کی خدمت کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ "او خویشتن گم است کرا رہبری کند"۔ ہندوستان میں تعلیم کا مفہوم بڑا محدود ہے۔ اس لئے حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ کی بھی تعداد بہت کم ہے۔

ہندوستان کو تعلیم یافتہ اور نئے طرز کے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ فی زمانہ لیڈری مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا سب سے پہلا اقتضا یہ ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ قوم کی ضروریات و احتیاجات کو اپنی ضروریات و احتیاجات پر مقدم سمجھے۔ اپنے گردوپیش کے حالات سے باخبر رہے۔ اور جدید تمدن کی غلامی سے آزاد۔ گاندھی جی کی سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ غور و فکر کرتے ہیں حق و صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات کو دنیا کے آگے پیش کرتے کبھی جھجکتے نہیں۔ اور ہر قسم کی مصیبت جھیلنے اور تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور کبھی اس پر غور نہیں کرتے۔ کہ کتنے اُن کے خیال کے حامی ہیں۔ اور کتنے مخالف۔ اگر پبلک ان کے پیش کردہ تجاویز پر عمل کرتی ہے تو وہ خوش ہیں۔ اور اگر مخالفت کرتی ہے تو وہ ہرگز اپنی ڈگر اور اصول سے نہیں ہٹتے۔ اسی استقلال و پامردی نے گاندھی جی کو ہندوستان کا ممتاز لیڈر بنایا۔ ہر شخص اُن کے متعلق یہ کہتا ہے جب وہ کسی کام کے کر لینے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ تو ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ کہ انہوں نے اپنی زندگی ایک خاص کام کے لئے وقف کر دی ہے۔ اور کبھی استقلال و ہمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ گاندھی جی کی اساس حیات سادگی پر ہے۔ اور ان کی زندگی نہایت منظم و باقاعدہ زندگی ہے کسی کی تعریف و خوش اعتقادی نے انہیں لیڈر نہیں بنایا۔ بلکہ حق و صداقت نے۔ وہ ہر صورت میں لیڈر ہیں خواہ ہم اُن کے خیالات و تجاویز پر عمل کریں یا نہ کریں ؞

دنیا میں تین قسم کے قائد پائے جاتے ہیں۔ ایک علمی قائد۔ دوسرا روحانی قائد۔ اور تیسرا سیاسی قائد کہلاتا ہے۔ اور ان قائدین کے پیرو' روحانی پیرو' اور سیاسی پیرو کہلاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق اپنا قائد تلاش کر لیتا ہے۔ سائنسدان' شاعر اور ماہر موسیقی کا تعلق پہلی قسم کے قائد سے ہوتا ہے۔ اور صاحبِ دل خدا ترس

حضرات کا تعلق قسم دوم سے ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو تمام قسم کی آلائشوں نفسی خباثتوں اور کدورتوں سے پاک صاف ہوتی ہیں۔ تیسری قسم سیاسی قائد کی ہے جس کو ہم فاتح کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں۔ جو دنیا میں عظیم الشان انقلاب پیدا کرتا ہے۔ کامیاب سیاسی لیڈر وہی شخص ہو سکتا ہے جو قسم اول و دوم کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ اور ان صفات کی اُس کی ذات میں برابر نشو و نما ہوتی رہتی ہے ۔

لیڈری کے فن سے واقف ہونے کے لئے چند عام اساسی اصولوں پر کاربند ہونا از بس ضروری ہے۔ سب سے پہلے فرمانبرداری کی صفت اپنی ذات میں بدرجۂ اتم پیدا کرے۔ اور لیڈری کا دعویٰ کرنے سے پہلے معلوم کرے۔ اس امر کا تجربہ کرنا چاہئے کہ قواعد و ضوابط کی پابندی کس طرح کی جاتی ہے۔ اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ حاکم بننے کے لئے محکومیت کا علم ضروری ہے۔ فرمانبرداری کے اصول سے واقف ہونا گویا لیڈری کا سنگ بنیاد رکھنا ہے۔ اور آئندہ کوششوں سے ایک مستحکم و عالی شان تعمیر چنی جا سکتی ہے۔ جو ہر قسم کے زلزلے اور صدمے سے بالکل محفوظ رہے گی۔ اس کے علاوہ لیڈر کا نیک نفس۔ بے آزار خوش خصال و ملنسار ہونا لازمی ہے لیڈر کو نہ تو قواعد و ضوابط کی اندھا دھند پابندی کرنا چاہئے۔ اور نہ توہمات و رسم و رواج کا غلام بنے رہنا چاہئے۔ قانون و رسم و رواج انسان کے لئے ہیں۔ نہ کہ انسان قانون و رسم و رواج کے لئے۔ سچ تو یہ ہے کہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے قوانین "مدون کئے جاتے ہیں۔ اور رسم و رواج جاری کئے جاتے ہیں۔ مگر جب ان کی مدد سے معاملات رو براہ نہیں ہوتے۔ تو ان میں ترمیم کی جاتی ہے۔ جتنے بڑے لیڈر گذرے ہیں سب سے پہلے اُنہوں نے زمانہ کے حالات و واقعات کو ملحوظ رکھ کر مروجہ قانون کی خامیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ براڈلاف نے اپنی غیر معمولی قانون دانی کی وجہ سے دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اور ایسے قوانین مٹانے کی کوشش کرتا رہا جن سے بُرے نتائج مرتب ہوتے تھے۔ اور جو عوام کی آزادی کے دائرہ اور عرصۂ حیات کو تنگ کر دیتے تھے۔ ایک حقیقی لیڈر کے پیش نظر قوانین قدرت ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کی ماہرانہ اہمیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ جس کی بدولت انسان کے بنائے ہوئے قانون اور ضابطوں کے نقائص دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بادی النظر میں وہ قانون شکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقی معنوں میں قانون ساز ہے۔ اس قانون سازی کی کوشش میں عوام کے خیالات اور اُن کے حملوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور نہ عوام کی حمایت و مخالفت کی پروا کرتا ہے۔ ایک اور بات اسی سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ لیڈر کو اپنی ذات پر کامل اعتماد ہو۔ عوام کے خیالات سے جلد متاثر ہو کر اپنی رائے سے پلٹ جانا لیڈری کے شایانِ شان نہیں۔ وہ شخص جو لیڈری کے میدان عمل میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو چاہئے مایۂ ناز لیڈروں کا پرستار بھی بنے۔ اور اُن کا احترام کرے۔ آنریبل جسٹس سداسیو نے جب گوکھلے کی تصویر مدراس میں بے نقاب کر رہے تھے۔ کہا کہ قائد بننے سے پہلے قائد پرست ہونا ضروری ہے اور پرستش کی حقیقی غرض و غایت اُس وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ لیڈروں کے اعلیٰ جذبات و احساسات اور قابل فخر کارناموں سے بصیرت و تقویت حاصل کی جائے۔ بڑی بڑی ہستیاں جو صدیوں پیشتر گزری ہیں۔ وہ اب

بھی قابلِ قدر ہیں اور یقینی دنیا تک ہر شخص اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کرے گا۔ انسان میں شریف ترین جذبہ یہ ہے کہ بزرگ ہستی کو قابلِ قدر و تحسین نظروں سے دیکھے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جلیل القدر قائدین کی دل سے پرستش کرتا ہوں۔ تو اُس کے صرف اتنا کہنے سے تشفی نہیں ہوسکتی۔ تاوقتیکہ زندہ لیڈروں کی دل سے عزت نہ کرے پچھلے زمانہ کے لیڈروں کی پرستش کرنی فی الحقیقت کوئی دشوار کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد خود بخود ان کی کمزوریوں پر پردہ پڑجاتا ہے۔ اور صرف محاسن باقی رہ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے زندہ لیڈروں کے عمل کی تصویر کے دونوں رُخ سامنے ہوتے ہیں۔ ان کے محاسن کے مقابل میں عیوب کو نظرانداز کرکے اُن کی عظمت و بزرگی کو ملحوظ رکھنا بڑی وسیع النظری کا کام ہے۔ جو لوگ عوام کی خدمت گزاری کے طریقے سے واقف ہونا چاہتے ہیں اُن کا فرض ہے۔ کہ لیڈروں کی خدمت میں حاضر رہیں۔ مگر بعض حضرات جیسا کہ دیکھا گیا ہے ما اپنے اپنے مجوّزہ معیار پر لیڈروں کو جانچتے ہیں۔ اور جب وہ اُن کو حسب منشا نہیں پاتے تو اُن سے روگرداں ہوجاتے ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے ایک شخص خواہ وہ کیسا ہی صاحبِ کمال و صفات ہو۔ ہر شخص کے معیار پر پورا اُتر سکے۔ اس خیال کے اظہار سے یہ مطلب نہیں کہ کورانہ تقلید و والہانہ فرمانبرداری کی جائے۔ ایک حقیقی لیڈر اس بات کو خود پسند نہیں کرتا۔ کہ کوئی شخص بے سمجھے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردے۔ البتہ بعض مواقع پر جس طرح ایک جنرل اپنے سپاہیوں کی اندھی فرمانبرداری چاہتا ہے۔ اسیطرح ایک لیڈر بھی چاہتا ہے کہ عوام بے چون و چرا اُس کے اصول و تجاویز پر عمل پیرا ہو۔ مگر ایسے موقعے شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں +

ہندوستان کو موجودہ حالات کے تحت چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی سخت ضرورت ہے۔ جو ملک کے ہر گوشہ میں عام مذاق کو سُدھارنے اور سنوارنے کی کوشش کرے جہلا میں زندگی کی روح پھونکے۔ اور دنیا سے تہذیب سے آشنا کرائے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے سے کم قابلیت والوں اور جاہلوں کا لیڈر بننے کی خواہش تو کرتا ہے۔ مگر جب اُن سے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی خواہش کی جاتی ہے۔ تو اپنی خانگی مشکلات، وقت کی قلت اور کنبہ پروری کا عذر کیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی نادانی سے اپنی زندگی کے راستے میں آپ کانٹے بوتے ہیں۔ ان مشکلات اور دشواریوں کے متعلق قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے۔ کہ زندگی کے ساتھ مصائب و آلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر ہر قسم کی کامیابیوں کی کلید ہیں اور اعلیٰ منازل پر پہنچانے کی ضامن ہیں۔ کسی مفکر نے کہا ہے۔ جب ہم دنیا کے جھگڑوں اور مخمصوں سے رہائی پاکر آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو ایسے خوشحالی کے دور میں رنج و کلفت کا زمانہ یاد آتا ہے کہ اسی نے ہم کو آگے بڑھنے کی ترغیب و تحریص دی اور زندگی کو کامیاب بنایا +

وقت کی قلت اور امورِ خانہ داری کے فرائض و عام مشاغل کے عذر کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ جسقدر بھی وقت ایک شخص کو ملتا ہے اس کی ضروریات رفع کرنے کے لئے کافی ہے۔ ہم کو زیادہ وقت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وقت کو مناسب طریقہ پر کام میں لانے کی زیادہ صلاحیت درکار ہے۔ اب رہا خانہ داری کا عذر۔ وہ بھی

معقول نہیں۔ گھریلو زندگی کے فرائض اور ذمہ داریاں فن قیادت کے اصول سے واقف کراتے ہیں۔ لیڈری پہلے اپنے مکان سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ خیال "اوّل خویش بعد درویش" کا صحیح مصداق ہے۔ موقع کے دستیاب نہ ہونے کا سوال بھی عذرِ لنگ ہے۔ ہونے والا قاید جوش عمل و استقلال سے اپنے لئے آپ موقع پیدا کر سکتا ہے۔

قیادت کے لئے جو صفات و خوبیاں بیان کی گئی ہیں ان میں توازن قایم کرنے کے لئے سب سے آخری وصف یعنی احساس تنظیم کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کارلائیل کا زریں مقولہ اس موقعہ پر قابل اندراج ہے۔ ہر سربرآوردہ و ممتاز شخص فطری طور پر تنظیم کا سپوت اور مبلغ ہوتا ہے۔ اور اس کا ہر کام دنیا میں تنظیم و دستور قایم کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو لیڈر بننے کا خواہاں ہو اس کا فرض ہے کہ اپنے جذبات و خواہشات کو اپنا تابع بنائے اور اپنے ہر قول و فعل کے عواقب و نتائج پر نظر ڈالتے رہے۔ ہر شخص نت نئے خیالات احساسات و جذبات کا گذرگاہ بنا رہتا ہے۔ مگر نادان ہر خیال کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ اور ان کی تکمیل کی ہوس میں دیوانہ وار پھرتا رہتا ہے برخلاف اس کے ایک منظم زندگی بسر کرنے والے کا طرز عمل اس سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ یوں تو ہر شخص کی طرح اس کے دماغ میں بھی خیالات کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مگر اس کا حال ایک چوکس دربان کا سا ہوتا ہے جو ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتا ہے۔ اور جس کی حالت مشتبہ پاتا ہے۔ بلا خوف اس کو داخل ہونے سے روک دیتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جو کام بھی کیا جائے۔ خوب غور اور دل لگا کر کیا جائے تو ہم میں بتدریج ایسی صلاحیتیں پیدا ہونے لگتی ہیں جن کی بدولت ملک و قوم کی نازک خدمت انجام دینے کے قابل ہو جاتے۔ اس صلاحیت کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے قول و فعل نشست و برخاست و عادات و کردار میں تنظیم کو ملحوظ رکھے تاکہ خیالات و جذبات میں حقیقی طور پر منظم ہو سکے۔ برے خیالات ہماری پُرامن زندگی و خوش بختی میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ اور لاابالی پن کی زندگی تو ہمارے لئے سم قاتل ہے۔ ایک مغربی مصنف نے کہا ہے اگر عاقبت اندیشی کا گرانبہا جوہر اپنی ذات میں پیدا کرنا چاہو تو سرتاپا منظم بن جاؤ۔ اور اگر منظم زندگی کے خواہاں ہو تو عاقبت اندیشی کے خوگر ہو۔ ایک شخص میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں وہ محض عدم تنظیم کا نتیجہ ہیں۔ دعویٰ کا ترک مبالغہ۔ جھوٹ غرض دنیا بھر کی برائیاں غیر منظم کردار کی علامتیں ہیں +

غلام محی الدین بی اے

"قمیص"

"اناطول فرانس کا تخیل دوسرے الفاظ میں"

(مشہور ادیب جناب قاضی عبدالغفار صاحب کے قلم سے)

(۱)

اُس کی رعایا اُس سے خوش تھی۔ اُس کے امرا اُس سے رضامند تھے۔ اُس کے اہل وعیال اُس کا دم بھرتے تھے ـــــ وہ نہایت نیک انسان اور نہایت رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اُس نے مزاج شگفتہ طبیعت نیک اور دل صاف پایا تھا +

مگر وہ چند روز سے بیمار تھا مرض کسی کی سمجھ میں آتا نہ تھا۔ اطبا کی کوششیں ضایع ہو رہی تھیں۔ رعایا پریشان۔ شاہی محل میں ہر شخص متردد اور ارکین سلطنت سرگردان تھے ـــــ کیا علاج ہو کہ جہاں پناہ کی طبیعت سنبھلے؟ دن۔ ہفتے۔ مہینے گذرے چلے جاتے تھے۔ اور مریض کی حالت ہر صبح کو کل شام کے مقابلہ میں بدتر ہوتی جاتی تھی +

(۲)

مرض بھی عجیب تھا۔ نہ بخار تھا۔ نہ درد تھا۔ نہ دُکھن تھی۔ نہ ورم تھا۔ مگر جسم کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ نبض کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مریض کا مزاج پژمردہ۔ طبیعت سرد اور قلب کمزور ہوتا جاتا تھا۔ نہ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ نہ باتوں میں چاشنی۔ احباب کی صحبت بھاتی نہ تھی۔ اہل وعیال کی محبت دل کے کنول کو کھلا سکتی نہ تھی۔ ذوق نفرت سے اور لطف بے لطفی سے بدل گیا تھا۔ یوں کوئی فکر نہ تھی۔ کوئی وجہ رنج وملال نہ تھی۔ کوئی خطرہ نہ تھا۔ کوئی جھگڑا نہ تھا۔ زندگی ویسی ہی پُرسکون تھی جیسی ہمیشہ رہتی۔ مگر پھر بھی زندگی بے کیف تھی! دسترخوان لذیذ اغذیہ سے بھرا ہوتا تھا۔ مگر وہ دو نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ موسیقی کے بہترین ماہر حاضر ہوتے تھے۔ مگر اپنا ساز چھیڑنے سے پہلے ہی سامنے سے ہٹا دئے جاتے تھے۔ دربار شاہی کی حسین رقاصہ ہر شام کو مجرا عرض کرتی تھی۔ اور اشارہ ہوتا تھا کہ ہٹ جاؤ۔ چلی جاؤ۔ - - غرض یہ کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ جہاں پناہ بیمار کیا ہیں۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ بیمار ہیں!

(۳)

مرض کی تشخیص نہ ہو تو علاج کیونکر کیا جائے۔ شاہی اطبّا اور امراض کے بڑے بڑے ماہرین آتے تھے۔ گھنٹوں معائنہ کرتے تھے نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے تھے۔ دل کی حرکت کو شمار کرتے تھے۔ خون کا امتحان کرتے تھے۔ دوائیں دیتے۔ غذائیں بدلتے۔ سب کچھ کرتے جو کرنا چاہئے لیکن مرض کی نوعیت کا پتہ نہ چلا سکتے صبح سے شام تک اراکین دولت۔ وزرا اور امرا۔ محل کے خاموش کروں۔ دالانوں اور شہ نشینوں میں بیٹھے ہوئے سرگوشیاں اور مشورے کرتے رہتے تھے لیکن فہم قاصر اور عقل حیران تھی +

(۴)

اُس زمانہ میں ہمسایہ سلطنت کا ایک طبیب دنیا میں بہت مشہور ہو رہا تھا۔ وہ اسقدر طبیب نہ تھا جسقدر حکیم تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ نہ دوا دیتا ہے۔ نہ نسخہ لکھتا ہے۔ مگر جو علاج کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سے چٹکلوں اور معمولی ترکیبوں سے وہ مریض کے مزاج پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور نہ جانے کیونکر مرض اُس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ دنیا میں اُس کے کمالات کا چرچا تھا۔ اور بالآخر جہاں پناہ کے امرا نے اُس کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عمال حکومت تیز رفتار سواریوں پر بھیجے گئے اور ملکوں ملکوں اُس حکیم کو تلاش کر کے آخر لے آئے +

(۵)

مریض کی حالت اب بد سے بدتر ہو چکی تھی نشست و برخاست کی طاقت باقی نہ تھی۔ زندگی کے دریا کا پانی خشک ہو چلا تھا۔ جو باقی تھا وہ بھی روز بروز خشک ہوتا جاتا تھا ―― حکیم صاحب آئے۔ نبض دیکھی۔ حالات سُنے۔ کوئی نسخہ نہیں لکھا۔ اور اپنے معمول کے مطابق کئی دن تک نیم اعتکاف کی حالت میں غور کرتے رہے۔ آخر ایک دن انہوں نے تمام اراکین خاندان شاہی۔ امرا و وزرا کو جمع کر کے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"بادشاہ کی بیماری لادوا ہے" +

شاہزادوں اور شاہزادیوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ امرا و وزرا کو پسینہ آگیا +

"لادوا ہے مگر ――"

حاضرین کے چہروں پر خون کی سرخی جھلکی۔ حکیم صاحب کے ساتھ سب بول اُٹھے:-

"مگر ――"

"مگر" حکیم صاحب نے فرمایا "علاج ہو سکتا ہے" ――

سُننے والوں میں سے بعض کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ بعض نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ―― حکیم صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی:

"علاج ہو سکتا ہے ―― لیکن ―― پینے، کھانے اور لگانے کی دوائیں بیکار ہیں" +

پھر اہل شوریٰ کے چہروں کا رنگ بدلا۔ اُن میں سے کسی نے گھبرا کر کہا:۔
"تو پھر حکیم صاحب؟ پھر کیا کیا جائے؟"
"کچھ نہیں" حکیم صاحب نے فرمایا +
"کچھ نہیں؟ کچھ بھی نہیں؟ کیوں حکیم صاحب کچھ بھی نہیں؟" سب نے گھبرا کر کہا +
حکیم صاحب نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا دھاگا جوڑا:۔
"سنیئے سنیئے۔ جو دوا بتاتا ہوں۔ اُس کو تلاش کیجئے۔ جہاں پناہ کے خون میں وہ ذرّات فنا ہو گئے ہیں۔ جن کی گردش اور حرکت اطمینان قلب اور حقیقی مسرت پیدا کرتی تھی۔ اطبا کی دوائیں اُن ذرات کو پیدا نہیں کر سکتیں علب معذور ہے۔ نہ وہ ذرات ایسی چیز ہیں کہ کسی معدن میں کسی پہاڑ پر کسی جنگل میں کسی جانور یا انسان کے خون میں تلاش کئے جا سکیں۔ یہ ذرّات روح سے بھی زیادہ غیر محسوس ہیں ——"
"پھر وہ کہاں ملیں؟" کسی نے گھبرا کر سوال کیا +
حکیم صاحب نے اُس جملۂ معترضہ پر توجہ نہ کر کے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھا:۔
"ایک ایسا انسان ڈھونڈ ہیئے جس کو جسم و جان اور دل و دماغ کا اطمینان بہمہ وجوہ حاصل ہو —— بہرہ وجوہ —— سمجھے آپ؟ اُس کی میلی قمیص جو اُس کے بدن پہ ہو۔ مانگ لائیے یا اُ تار لائیے جس طرح مل سکے لائیے اور جہاں پناہ کو پہنا دیجئے۔ —— اُس شخص کے جسم کے ذرّات صرف اسی طرح بادشاہ کے جسم میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ اور صرف یہی ایک علاج ہے" —— حکیم صاحب یہ کہہ کر اُٹھ گئے۔ اور وہ خاموشی جو سننے والوں پر طاری تھی دفعتاً بلند آوازوں میں بدل گئی۔ بہ یک وقت سب کے سب بولنے لگے:۔
"یہ کیا علاج ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے" +
"ہو کیوں نہیں سکتا"
"کہاں ملیگی؟ کون لائیگا۔ کوئی ایسا آدمی بھی کہیں ملیگا؟"
"ہمارے بادشاہ کی سلطنت ایسے خوش نصیبوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ تلاش کی جائے۔ آدمی بھی ملیگا۔ قمیص بھی ملیگی۔ کیوں نہ ملیگی؟"
"فوراً، فوراً کچھ مشکل نہیں۔ جانا چاہیئے۔ ڈھونڈنا چاہیئے" ————
چنانچہ مصاحبین میں سے دو اس کام کے لئے منتخب ہوئے کہ وہ جائیں اور ایک ایسی قمیص ڈھونڈ کر لائیں +

(۶)

دونوں روانہ ہوتے ہیں +
"کیوں بھئی ایسا آدمی کون ہوگا —— بھلا وزیر اعظم سے زیادہ خوش نصیب بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ دیکھا نہیں۔ وہ ہر وقت کس قدر بشاش رہتے ہیں" ایک نے کہا۔ "سچ کہتے ہو" دوسرا بولا "ہم نے تو کبھی اُن کو آزردہ خاطر

دیکھا نہیں" ٭

"تو پھر چلو اُن ہی کو پہلے جانچیں" ٭

(۷)

جہاں پناہ کے دونوں مصاحبین وزیر اعظم کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم ابھی شاہی محل سے تشریف لائے ہیں۔ ولیعہد سلطنت اُن کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اور چونکہ بظاہر بادشاہ مرض موت میں گرفتار ہیں۔ ولیعہد کی اُمیدوں کا ستارہ بہت روشن ہے۔ اور وزیر اعظم انعام و اکرام اور اپنے مراتب کی ترقی کا خیال کر کے بہت خوش ہیں۔ شاہی مصاحبین پر وہ ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوئے اپنی حرم سرا میں تشریف لے گئے۔ ابھی حرم سرا میں گئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ کہ اندر سے شہنائیوں اور خوش آواز باجوں کی آواز آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم خاصہ تناول فرما رہے ہیں۔ خاصہ کے بعد کچھ دیر آرام فرمائیں گے۔ اُسکے بعد اگر حرم سرا میں تفریح کا کوئی شغل شروع نہ ہو گیا۔ تو دیوان خانے میں تشریف لائیں گے ———

ایک گھنٹہ گذرا' دو گذرے۔ مصاحبین ہنوز منتظر ہیں۔ کہ دفعتاً محل کے اندر چیخ پکار اور شور و شغب شروع ہوا باہر کے خدام ڈیوڑھی کی طرف بھاگے۔ اور اندر کی مامائیں چیختی چلاتی دروازے پر آئیں "کیا ہوا۔ کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟" "بیگم صاحب ایک خواص کو چابک سے مار رہی ہیں۔ خواص ستون سے باندھ دی گئی ہے۔ اُس کی کمر پر ہزاروں کوڑے پڑ رہے ہیں۔ "سرکار" نے اپنے کمرہ کے کواڑ بند کر لئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کا غصہ' الامان والحفیظ! وہ تو اس وقت آپے سے باہر ہیں" ٭

"تو آخر ہوا کیا؟ خواص کا قصور؟ کچھ تو ہوگا" قصور؟ اجی بس قصور نہ پوچھو؟ ہوا یہ کہ وزیر صاحب کھانے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ نہ جانے کیسے یہ قطامہ اُن کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پھر کیا تھا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ بیگم صاحب نے سرکار کی داڑھی کھسوٹ لی۔ اور اب خواص کی مرمت ہو رہی ہے۔ سرکار نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ بیگم صاحب گرج رہی ہیں۔ خواص لہولہان ہے۔ تم پوچھتے ہو ہوا کیا؟ اس محل میں تو سو بیسویں کوئی نہ کوئی تماشا ہوتا ہی رہتا ہے ———

اجی بس رہنے دیجئے۔ سرکار کی سرکاری معلوم ہے۔ مالک کیا خاک ہیں۔ ان ہی حرکتوں پر کئی دفعہ بیگم صاحب کے ہاتھ سے پٹ چکے ہیں۔ وزارت اور وزیری حرم سرا کے باہر ہی ہے — اور اندر تو بس بیگم صاحب کا جوتا ہے اور سرکار کا سر!"

"لاحول ولا قوۃ!" مصاحبوں نے دبی زبان سے کہا۔ اور آہستہ سے محل کے پائیں باغ کا دروازہ کھول کر نکل گئے ٭

(۸)

"چلو بھئی! ملک التجار کے یہاں چلیں۔ اُس سے زیادہ خوش نصیب اس ملک میں کوئی نہیں

دولت اُس کی غلام ہے۔ بادشاہ کا وہ خاص دوست ہے۔ مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ اہل و عیال کی پابندیوں سے بھی آزاد ہے۔ سنتے ہیں کہ دن رات بہت پُر کیف زندگی بسر کرتا ہے ــــ آؤ ذرا اُس کو جانچیں ــ ــــ"

ملک التجار ابھی ابھی ہوا خوری سے واپس آئے ہیں۔ اُن کی سواری کے عربی گھوڑے دروازے پر کھڑے ہوئے دُمیں ہلا رہے ہیں اور ٹاپیں مار رہے ہیں۔ چوبدار اور خدّام طلاکار لباسوں میں دوڑتے پھرتے ہیں ملک التجار کا محل خالص مرمر کا ایک عالی شان قلعہ ہے۔ جوانی میں خوب عیاشیاں کر چکے ہیں۔ اب بوڑھے ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی مے نوشی کر لیتے ہیں۔ اور بس۔ اب تو دولت ہے اور وہ ہیں۔ دُنیا کی کوئی فکر نہیں!

"آغا صاحب! ذرا ہماری اطلاع کرا دیجئے"

ابھی رہنے بھی دو' اس وقت ملاقات کر کے کیا کرو گے۔ سیٹھ صبح سے بہت پریشان ہیں۔ رات اُن کا بھانجا ایک قیمتی ہیرا چُرا کر چلدیا۔ صبح سے سیٹھ اُسی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہوا خوری؟ ہوا خوری کیسی؟ بدحواس ہو رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اُس کمبخت کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ دو چار دن میں رو دھو کر بیٹھ رہیں گے۔ ہاں' یہ تو سچ ہے۔ ان کے جواہر خانہ کا کیا کہنا۔ ہزاروں ہیرے پڑے دمک رہے ہیں۔ ایک ہیرا نہ سہی نہ سہی' مگر اُن کو سمجھائے کون۔ ایک ذرا سا ہیرا کیا گیا گویا جان نکل گئی۔ بِلک بِلک کر رو رہے ہیں۔ عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہے ہیں۔ چار پہر گذر گئے۔ ایک کھیل بھی مُنہ میں اُڑ کر نہیں گئی۔ یہ حال ہے جیسے کسی کا بیٹا مر گیا ہو ـــــــ"

"دیکھئے! معلوم شد۔ بافندگی۔ جہاں پناہ کے مصاحبوں نے حیران ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھا +

(۹)

"نہیں بھائی۔ دنیاداروں کو چھوڑو۔ ادھر تو علیش کا کوئی دامن نہ ملیگا جس پر غم کے دھبے نہ ہوں! دولت کا سگا بھائی غم ہے۔ یہ چیز جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں' ملیگی تو دینداروں ہی میں ملیگی۔ چلو مفتی صاحب کی طرف چلیں" ــــــ

مفتی صاحب بادشاہ کی سلطنت کے سب سے بڑے مفتی تھے۔ علمِ دین کی دولت وہ مکّہ اور ازہر سے لے کر آئے تھے۔ زہد و اتقا اُن کو وراثتاً اپنے باپ دادا سے ملا تھا۔ شریعت اور سنّت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ مفتی بھی تھے اور شاہی مسجد کے پیش امام بھی۔ سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت بھی لیتے تھے۔ ملک کی آدھی آبادی اُن کی مرید تھی۔ ہزاروں عقیدتمند اُن کی صحبتوں میں حاضر ہوکر فیض حاصل کرتے تھے۔ اور عرفان کے خزانوں سے دامنِ مراد بھر کر لیے جاتے تھے۔ غرض وہ اُن کی پاک نفسی کا شہرہ تھا +

اس وقت وہ عشا کی نماز سے فارغ ہوکر صحنِ مسجد میں تشریف رکھتے ہیں۔ مُریدین کا حلقہ قایم ہے۔ جیسے شمع کے چاروں طرف پروانے۔ مفتی صاحب ابھی وظیفہ سے فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے مصاحبین کو آتے دیکھ کر مُریدین سنے نانو بدلے۔ آنے والوں کے لئے حلقہ کے اگلی صف میں جگہ چھوڑی گئی ــــ بادشاہ کے مصاحب خدا کے گھر میں بھی اگلی صف کے حقدار ہوتے ہیں ــــ

آملے والوں نے اپنے دل میں سوچا۔ "اللہ اللہ! ان سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ دنیا میں یہ احترام اور عاقبت میں روضہ رضوان! اور کیا چاہیئے۔ ان کے لئے دونوں جہان میں خوشی ہے خوشی ہے" ——

مفتی صاحب کا وظیفہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ ایک خادم گھر کی طرف سے کھاگا ہوا آیا۔ "حضرت" اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "ذرا مکان تشریف لے چلیں۔ پولیس والے چھوٹے میاں کی لاش لے کر آئے ہیں" ——

کیا، کیا، کیا کہا، چھوٹے میاں، کون چھوٹے میاں۔ لاش، کیسی لاش، کیا کہا۔ پولیس والے —— لا الہ اللہ ——" مریدوں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سنبھالا! مشکل سے مفتی صاحب گھر پہنچ پائے۔ پولیس کے آدمی دروازے پر بیٹھے تھے۔ مفتی صاحب کو سوال جواب کا ہوش کہاں تھا۔ مگر مریدوں کو پولیس والوں نے بتایا کہ صاحبزادے ایک طوائف پر مبتلا تھے۔ اسی کے گھر زہر کھا لیا —— اندر اور باہر ایک کہرام تھا۔ مفتی صاحب بیہوش پڑے تھے ——

بادشاہ کے مصاحبین اپنی آنکھوں کی نمی کو رومال سے خشک کرتے ہوئے باہر آ گئے ——

"یہاں بھی نہیں تو پھر کہاں؟" انہوں نے کہا۔ وہ شے جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں دولت کے دامن میں نہیں۔ دنیا کے پاس نہیں۔ مذہب کی گرہ میں نہیں —— پھر کہاں؟ —— دولت روتی ہے۔ عزت بسورتی ہے مذہب دیوالیہ ہے ——

پھر کہاں؟ ——

(۱۰)

ان سب کو چھوڑو۔ اُدھر چلو۔ جدھر دنیا ہے نہ دین ہے۔ آؤ کسی میخانہ میں چلیں۔ کسی پرانے شرابی کو ڈھونڈیں۔ کوئی ایسا شرابی جس کا نشہ کبھی نہ اترتا ہو۔ جو دنیا سے بے تعلق ہو۔ جو سارے علایق کو مے خانہ کے خم میں غرق کر چکا ہو۔ جس کو نہ مرنے کا غم نہ جینے کا فکر ہو۔ نہ دولت کی تلاش۔ نہ عزّت کی خواہش۔ نہ دوزخ کا خوف نہ جنّت کی جستجو!

وہ دونوں مے خانہ میں آ گئے۔ پھٹی ہوئی چٹائیوں پر، لوٹے ہوئے مونڈھوں اور کرسیوں پر۔ یہ دونوں نہیں تو فرشِ خاک پر، کوئی اکڑوں، کوئی دو زانو، کوئی کروٹ سے کوئی چت۔ کوئی دیوار کے سہارے۔ کوئی کسی دوسرے کو تکیہ بنائے ہوئے —— میخواروں کی ایک دنیا آباد تھی +

لاؤ۔ لاؤ۔ ایک اور۔ ہاں ایک اور۔ تلخ دو۔ میٹھی نہیں۔ تیز دو ہلکی نہیں۔ لاؤ۔ لاؤ۔ بھر کے لاؤ۔ آدھا نہیں۔ گراؤ نہیں۔ ادھر لاؤ۔ پلا دو۔ ڈال دو۔ انڈیل دو۔ لاؤ۔ لاؤ —— نشہ نشہ؟ نشہ کہاں ہے۔ کس کو ہے؟ کیا کہتے ہو؟ میں سو گیا۔ غلط ہے۔ خدا کی قسم غلط ہے۔ میں نشہ میں ہوں۔ یہ بھی غلط ہے۔ واللہ افترا ہے۔ کذب ہے —— موت۔ موت کیسی۔ ایک پیالہ میں زندگی ہے۔ ہاں۔ وہ بھرا نہ ہو تو موت۔ زندگی کو بھول جاؤ۔ موت کو یاد نہ کرو۔ لاؤ۔ لاؤ —— دوزخ؟ جنّت؟ یہ کیا خرافات ہے۔ ہم جنّت والے دوزخ کو کیا جانیں؟

جنت والوں سے دوزخ کا ذکر۔ کیسے بیوقوف ہو؟ لاؤ۔ لاؤ۔ بیمار ہیں؟ کون بیمار ہے؟ بادشاہ سلامت بیمار ہیں؟ کیوں بیمار ہیں۔ بیمار ہونے کو کس نے کہا تھا۔ کھول دو ایک قرابہ۔ پلا دو ایک مٹک بھر کے۔ اچھے ہوجائیں گے! جاؤ کہدیا اچھے ہوجائیں گے! بستر سے اٹھیں گے جوان ہوکر! حکیم صاحب سے کہو خوب پئیں اور پلائیں ـــــ اتنی پلائیں ـــــ اتنی پلائیں ـــــ !!! ـــــ مفتی صاحب، مفتی صاحب کا کیا ذکر؟ یہاں دیکھو کتنے مفتی موجود ہیں۔ ہم سب مفتی ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے ـــــ بادشاہ ـــــ جہاں پناہ!! ـــــ لاؤ ـــــ لاؤ ـــــ

"اندر آؤ۔ حقیقی مسرت کا ٹھکانا مل گیا۔ منزل مراد یہی ہے" دونوں کی امیدیں ہم آواز تھیں۔ "جو شے کہیں نہ مل سکی وہ یہاں ضرور ہے۔ ان میں سے کس کی قمیص حاصل کرنی چاہئے" مے خانہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر وہ مشورہ کرنے لگے ـــــ

ایک شخص مجمع سے ذرا بچا ہوا ایک چٹائی پر بیٹھا ہنس رہا تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک صراحی تھی۔ جھوم جھوم کر صراحی سے ایک ایک گھونٹ پیتا تھا۔ مسکراتا تھا۔ صراحی کو کلیجہ سے لگا لگا کر مسکراتا تھا ـــــ دونوں نے کہا۔ "آؤ اس شخص سے باتیں کریں"

"آپ کون ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا شغل ہے؟" انھوں نے مسکراتے ہوئے شرابی سے سوالات کرنے شروع کئے ـــــ

میں کون؟ شرابی! میرا گھر؟ شراب خانہ! میرا شغل شراب نوشی۔ میری زندگی شراب۔ میری جنت شراب۔ میری دنیا شراب۔ میری عقبیٰ شراب! اور کیا پوچھتے ہو؟ آؤ! دو گھونٹ پی لو!

"تم اس حال میں خوش ہو؟" دونوں نے سوال کیا۔

"خوشی؟ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟" شرابی نے کہا "پیسہ میری جیب میں نہیں۔ مفت کا ایک قطرہ مجھے مل نہیں سکتا۔ چار چار دن محروم رہتا ہوں۔ پیاس نہیں بھرتی۔ مگر اس مے خانہ سے نکالا جاتا ہوں ـــــ خوشی؟ ـــــ کاش میرے پاس کچھ دولت ہوتی۔ اتنی تو ہوتی کہ ہر روز پی لیا کرتا! اس شہر کے دولتمند سونے چاندی کے ڈھیر مٹی کے نیچے دبائے بیٹھے ہیں۔ اللہ نے اپنی نعمتیں کسقدر غلط تقسیم کی ہیں۔ ہم بھی اسی کے بندے کہلائے جاتے ہیں۔ اُن کو اتنا کچھ اور ہم کو کچھ نہیں! ایک قدح شراب کے قابل بھی نہیں! وہ پھولوں پر سوئیں ہم کانٹوں پر سوئیں! خدا اسی کو کہتے ہیں۔ جو ایک کو دے اور دوسرے کو نہ دے! مالک، خالق، معبود! شکوہ کرنا کفر ہے۔ شکایت کرنا گناہ ہے! ـــــ خوشی! ـــــ

جاؤ جاؤ۔ ہٹو! میرا مذاق اُڑانے آئے ہو۔ پیتے نہیں۔ پلاتے بھی نہیں۔ اتراتے پھرتے ہو۔ دھوکہ دینے آئے ہو۔ میری مفلسی مجھے یاد دلانے آئے ہو۔ مجھے ترسانے، تڑپانے! ہٹو ہٹو ـــــ ارے لاؤ ایک جام! لاؤ، لاؤ۔

"بس! کیا دیکھنے آئے تھے کیا دیکھا! شراب کی مستی اور کیف کہاں۔ وہ تو دولت کا ماتم کر رہا ہے۔ مسرت کو وہ بدنصیب کیا جانے! دُور سے پھول نظر آتا ہے۔ نزدیک جاؤ تو کانٹے ہی کانٹے ہیں! زندگی کے ریگستان میں کیا سب شراب ہی سراب ہیں ——" وہ دونوں مایوس اور حیران مے خانہ سے نکلے!

(۱۱)

"اب کدھر چلیں؟ —— شہر تو دیکھ لیا۔ چلو جنگل کی طرف چلیں۔ کیا معلوم پہاڑ کی کسی گھاٹی میں جنگل کے کسی گوشہ میں، خدا کا کوئی بندہ۔ جیسا ہم ڈھونڈھ رہے ہیں مل جائے"؟

ہفتوں وہ جنگلوں اور بیابانوں میں گھوما کئے۔ دیہات میں اور بستیوں میں۔ دریاؤں کے کنارے بسے ہوئے اور مندروں میں۔ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں وہ ڈھونڈھتے پھرے۔

ایک دن ایک گاؤں کی آبادی کے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک برگد کے سایہ میں اُنہوں نے ایک جھونپڑی کے سامنے ایک نوجوان فقیر کو بیٹھے دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی سخت تھی۔ لو چل رہی تھی۔ اِکّا دُکّا مسافر جو اس راستے پر گذر رہے تھے۔ جھونپڑی کے سامنے سایہ میں کچھ دیر دم لیتے تھے۔ فقیر اُن کو پانی پلاتا تھا۔ اپنی جھونپڑی میں سے کچھ بھنے ہوئے چنے لاکر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ وہ کچھ کھاتے تھے۔ دو گھونٹ پانی پیتے تھے۔ کچھ دیر ستاتے تھے۔ اور روانہ ہو جاتے تھے۔ اس نوجوان فقیر کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک نور تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں ایک کیف تھا۔ دونوں مصاحب گرمی اور لُو کی تکلیف سے تنگ آ چکے تھے۔ درخت کے ٹھنڈے سایہ اور فقیر کی شگفتہ صورت نے اُن کے قدموں کو جھونپڑی کے سامنے روک دیا۔ فقیر کے مٹکے کا ٹھنڈا پانی۔ برگد کی چھاؤں اور جنگل کا سناٹا یہ سب چیزیں ایسی تھیں۔ کہ وہ دونوں مسافر ستانے کیا بیٹھے بالکل بیٹھ ہی گئے۔ فقیر سے اُنہوں نے اجازت چاہی کہ دوپہر ڈھلنے تک وہ جھونپڑی کے پاس آرام کریں۔ لیٹے لیٹے اُنہوں نے فقیر سے باتیں شروع کیں۔

"کیوں بابا! تم کب سے اس جھونپڑی میں رہتے ہو"؟

"جب سے میں پیدا ہوا۔ اور میں پیدا اُس وقت ہوا جب دنیا کی خواہشیں میرے دل میں مر گئیں۔ اُن کی موت میری زندگی ہے" فقیر نے کہا۔

"اب تم کیا کرتے ہو"؟

"مسافروں کی خدمت کرتا ہوں۔ اور اس جھونپڑی میں پاؤں پھیلا کر سوتا ہوں" فقیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تمہیں کوئی فکر نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں؟" دونوں مصاحبوں نے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"فکر؟ خواہش فکر کی ماں ہے۔ اُس کے بطن سے یہ تکلیف دہ بچہ پیدا ہوا کرتا ہے۔ میں خواہش نہیں رکھتا پھر میرے گھر میں فکر کہاں سے آئے؟"

"تم اپنی زندگی میں مطمئن ہو۔ آرام سے ہو؟"

"میں مطمئن ہوں، خوش ہوں، آرام سے ہوں۔ میرا کسی ایسی چیز سے واسطہ ہی نہیں۔ جو غیر مطمئن، ناخوش یا بے آرام کر سکے"+

"خدا کا شکر ہے ہم نے تم کو پا لیا" دونوں بے اختیار بول اُٹھے "ہم کو تم ہی جیسے انسان کی تلاش تھی"+

پھر اُنہوں نے اپنا مدعا بیان کیا +

"بادشاہ بیمار ہے۔ اُس کے علاج میں تمہاری امداد کی ضرورت ہے"+

فقیر سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہنے لگا +

"بابا! میں بادشاہ کو کیا جانوں۔ میں جس دنیا میں ہوں۔ وہاں بادشاہ ہوتا ہی نہیں۔ خیر۔ تم کہو تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم بادشاہوں کی نہ سہی، انسانوں کی خدمت تو کرتے ہو۔ ہماری کچھ امداد کرو"+

"ہاں" فقیر نے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے۔ خوشی کے ساتھ تم کو دے سکتا ہوں۔ تمہارے کام آئے تو میری جھونپڑی اُٹھا لے جاؤ"+

خوش ہو کر دونوں نے کہا "بس ہمیں اپنی ایک پھٹی پرانی قمیص دیدو" +

"برسیں ہوئیں میرا جسم قمیص سے ناآشنا ہے۔ دنیا چھوڑی، دنیا والوں کا لباس چھوڑا۔ میرے جسم کی کھال میرا لباس ہے۔ شاید اسی لئے میں مطمئن بھی ہوں۔ بابا! قمیص میرے پاس نہیں!"

(۱۲)

بادشاہ اب تک بیمار پڑا ہے۔ مصاحبین ملکوں ملکوں ڈھونڈ ڈھونڈ کے آ گئے۔ کوئی ایسا نہ ملا جس کی قمیص بادشاہ کے مرض کا علاج ہو سکتی۔ اور ایک جو ملا اُس کے جسم پر قمیص ہی نہ تھی!!!

قاضی عبدالغفار

مقالۂ علمیہ

تحلیلِ نفسی اور بچہ کی تربیت

(۱)

ماہرانِ علم النفس عرصہ سے اس امر پر متفق ہو چکے ہیں کہ بچہ اپنی عمر کے ابتدائی تین سالوں میں جتنا علم حاصل کرتا ہے۔ زندگی کے باقی کسی سال میں اتنا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ پیدائش سے سنِ شعور تک بچے کی دماغی حالت میں بہت تبدیلیاں واقع ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہانتک کہ باقی عمر کے تجربات و تاثرات ابتدائی عمر کے تجربات و تاثرات کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ عام طور پر بچپن کا زمانہ سُنہری زمانہ اور بے پروائی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ مگر ماحول کے مطابق اپنے آپ کو عادی بنانے کے لئے بچہ کو جن حالتوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اُس کے لئے وہ نہایت ہی تکلیف دہ ہُوا کرتی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "تکلیف سب سے بڑی مصلح اور اُستاد ہے" تکالیف ہی بچہ کی آیندہ زندگی کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ اگر کسی نوجوان آدمی کی کسی دماغی تکلیف اور بدعادت کی تشخیص کی جائے۔ تو عہدِ طفلی کی کوئی تکلیف ہی اُس کا موجب نکلیگی۔ اس لئے بچوں کی صحیح اصولوں کے مطابق تربیت کرنے سے اُن کو ہم بہت سے ناخوشگوار تاثرات سے بچا سکتے ہیں۔

ابتدائی چار یا پانچ سالوں کے تاثرات ہی کسی بچہ کے عام مزاج کے بنانے میں کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت ہمیں اُن نوجوانوں میں ملتا ہے۔ جن کے اندر زمانہ بچپن کے عادات تاحال موجود ہوتے ہیں بچپن ہی کے زمانہ میں بچہ کا مزاج۔ مذاقِ پیشہ۔ ذوقِ علم۔ اخلاق اور مذہبی رجحانات بنتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مابعد کے بہت سے تغیرات کے باوجود ہم میں سے اکثر لوگ زندگی کی اُسی روش کو ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔ جس روش نے اُن کے بچپن کے ابتدائی چار یا پانچ سالوں میں اُن کے دماغ پر تسلط جمایا تھا۔

یہ باتیں ہمیں بچوں کی شعوری کیفیتوں کے مطالعہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ بچے عموماً اپنے حسیات کو بہت ہوشیاری سے دبا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی حسیات کا مطالعہ کرنے کے لئے سخت ہوشیاری اور چالاکی کی ضرورت ہُوا کرتی ہے۔ بچہ میں ابتدائی عمر ہی سے مخفی زندگی اختیار کر لینے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے اگر کسی نوجوان کا متواتر تجزیہ نفسی کیا جائے تو اُس کے بچپن کی داستیں۔ خیالات اور حسیات سب اُسے یاد آجائینگی ایک جوان لیڈی کو اپنے دو سالہ عمر کا ایک تجربہ بجنسہ یاد تھا۔ کہ کس طرح جبکہ وہ ایک دفعہ اپنی چھوٹی گاڑی میں جوش اور آزادی سے اُچھل رہی تھی۔ ایک مرد نے نہایت غصہ کی حالت میں آکر اُس کو اُچھلنے سے منع کیا۔ اور لوگوں کے لئے اس واقعہ کی یاد زیادہ ذکی الحس ہونے پر محمول کی جائے گی۔ مگر دراصل ماں اُس سے بہت

پیار سے سلوک کرتی تھی۔ اس لئے اُس مرد کی غضبناک جھڑکی اُس کے لئے غیر معمولی چیز تھی۔ جو ہمیشہ کے لئے اُس کے دماغ میں رہ گئی جس طرح زمانہ حال کی طبی تحقیقات "ایک تولہ احتیاط کا ایک من دوا سے زیادہ اچھا ہے" کے سنہری اصول پر زیادہ زور دیتی ہے۔ اسیطرح تجزیۂ نفسی اس اصول پر زور دیتا ہے کہ ابتدائی ایام میں اگر ہم بعض تاثرات سے بچّہ کو بچا سکیں۔ تو ہماری سوسائٹی میں عمدہ مرد و عورت پیدا کی جا سکتی ہیں۔ عمدہ تربیت بچّوں کو مابعد کی بہت سی تکالیف اور رنج و غم سے بچا سکتی ہے +

(۲)

والدین کا ہاتھ

بچّہ کی دماغی ساخت میں والدین کا ہاتھ بہت کام کرتا ہے بچّے بڑے ہو کر دیگر لوگوں کے ساتھ غیر شعوری طور پر وہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو بچپن میں اُن کا والدین کے ساتھ تھا۔ ہزاروں لوگوں کے سوانح حیات کے مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچّے اکثر نادانستہ طور پر اپنے والدین کی زندگی کے مطابق عمل کرنے کی طرف غیر ارادی طور پر راغب ہُوا کرتے ہیں +

جاہل والدین کا لڑکا خواہ کتنی عمدہ تعلیم ہی کیوں نہ حاصل کر لے ہمیشہ غیر شعوری طور پر جہالت اور کاہلی کیطرف شدید جبلّی رجحان رکھتا ہے + ابتدائی عمر کے تاثرات خواہ وہ تکلیف دہ ہوں یا راحت افزا بچّہ اُن کی غیر ارادی طور پر خواہش کیا کرتا ہے۔ بچّہ کے مزاج پر خاندان کے دیگر افراد کا اثر بھی بہت پڑتا ہے + سکول کی عمر تک پہنچتے بچّہ غیر ارادی طور پر اپنے والدین کی نقل اتنی تکمیل سے کر لیتا ہے کہ اُس کے خیالات اور حرکات اُسی طرح بن جاتے ہیں۔ اور وہ عمر بھر بچّے [illegible] سخت ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مگر والدین اس فرض عظیم [illegible] نہیں جانتے کہ وہ اس طرح بچّہ کی آئندہ زندگی اور اُس کی راحتوں کو خراب کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بہت سی اعصابی اور دماغی تکالیف اور بُری عادتوں کا سراغ ہمارے والدین کی اعصابی اور دماغی تکالیف میں ملتا ہے۔ اور اس کا سبب والدین کی لاعلمی اور غلطی ہُوا کرتی ہے + اس میں شک نہیں کہ والدین کا قصور بھی بہت تھوڑا ہے۔ کیونکہ وہ خود ان اصولوں سے واقف نہیں ہوتے۔ اور اسی طرح پر ہماری اس خرابی کی بڑی وجہ ہماری جہالت ہوا کرتی ہے +

ہمارے مشاہدے میں ایک ایسے آدمی کی مثال موجود ہے۔ جو زندگی میں مایوسانہ طور پر ناکام ثابت ہُوا تھا۔ وہ کسی جامعہ کا گریجوایٹ تھا۔ سکول کے عرصۂ طالب علمی میں وہ اپنے اردگرد کے آدمیوں سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ جماعت میں اگر اُستاد اُسے سبق پڑھنے کے لئے اُسے کہتا تو اُسے انتہائی تکلیف ہوتی۔ اُسے ہر وقت اپنی کمتری کا احساس شدت سے رہتا۔ اور وہ سڑکوں کے کنارے چلا کرتا تھا۔ اور جہاں کہیں ہجوم دیکھتا۔ فوراً اپنے آپ کو کسی کونہ میں چھپا لیتا تاکہ اُس پر لوگوں کی نظریں نہ پڑیں۔ آخر کار تجزیۂ نفسی سے

اُن چند امورات کا پتہ ملا جو اُس کی اس حالت کے ذمہ دار تھے۔ چار سال کی عمر میں وہ اپنے والدین کے حد سے بڑھے ہوئے پیار کا شکار تھا۔ والدین کے اس حد سے زیادہ پیار سے بچہ جلدی سیر ہوگیا۔ ایک دفعہ اُس کے والد نے اُس کے ننگے جسم کو فرطِ محبت سے دبوچ لیا۔ لڑکے نے والد کے اس فعل کو بے شرمی، جہالت اور بیہودگی پر محمول کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اُس نے اپنی ماں کو پھیری والے کے ساتھ نہایت گنوارانہ طرز اور ہتک آمیز بدکلامی سے پیش آتے دیکھا۔ اس فعل سے لڑکے کا اعتبار اپنے والدین سے اُٹھ گیا۔ اور ساتھ ہی عوام کو بھی وہ اسی شک اور بے اعتباری سے دیکھنے لگا۔ یہ واقعہ لڑکے کی طبیعت پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ اور لڑکے کی طبیعت سخت شرمیلی بن گئی۔ یہی حالت لڑکے کی ہمیشہ کے لئے قایم رہی۔

اس قسم کے خاندان بہت ہی کم ہونگے جہاں کہ والدین کا سلوک اپنے بچوں کے ساتھ آزادی اور رواداری پر مبنی ہو۔ اس قسم کے واقعات کا حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ عام طور پر لڑکے اپنے والدین کے متعلق جذبات کو تابعداری کے تحت پوشیدہ رکھکر والدین کو دھوکہ دیتے ہیں۔ البتہ جن حالتوں میں ڈر کا احتمال نہ ہو لڑکے آزادانہ طور پر اپنے والدین پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو۔ یہ ہمیشہ خیال رکھو کہ لڑکے غیر ارادی طور پر گھر سے باہر بھی اُسی طرز کی نمائش کرتے ہیں جو اُنہوں نے گھر کے اندر رہ کر سیکھی ہے۔ مگر غیر لوگ ان کے اس سلوک کو برداشت نہ کرسکیں گے جو گھر والے کرلیا کرتے تھے۔ جہاں کہیں ہم کسی لڑکے کو اپنے اُستاد سے نفرت کرتے دیکھیں گے۔ اس کی یہی وجہ ہوگی کہ اُستاد لڑکے کے غیر شعوری حصۂ دماغ میں اُس کے والدین کی تحکمانہ صورت اختیار کرلیتا ہے۔ بچہ کے دماغ میں تحکم کا پہلا تصوّر اُس کے والدین ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُستاد ایسے طالبعلم کے معاملہ میں عاجز ہوجاتے ہیں۔ جس کی خانداني زندگی استوار نہ ہو اور جو اپنے آپ کو اپنے گھر کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ نہ بنا سکا ہو۔

بچے کے غیر شعوری حصۂ دماغ میں والدین کے تحکمانہ طرز کے برخلاف نفرت موجود ہوتی ہے۔ پس جہاں کہیں کوئی لڑکے پر تحکمانہ صورت اختیار کرے گا۔ لڑکا اپنی پوشیدہ نفرت اُس کی طرف منتقل کردے گا۔ مگر جہاں لڑکا اپنے گھر کی عمدہ اور آزادانہ فضا۔ اور والدین کے عمدہ سلوک کے ساتھ ہم آہنگ بن چکا ہوگا۔ وہ ہر کہیں اور سکول میں بھی کامیاب زندگی گزار سکیگا۔ اور ہر ضابطہ کے ماتحت کام کرنے پر بخوشی آمادہ ہوجائے گا۔ اور ایسا بچہ ہی آگے چل کر کامیاب اور قناعت شعار آدمی ثابت ہوگا۔

(۳)

بچّے کی حیاتِ مُعاشقہ

مردوں میں ایک قسم ایسے مردوں کی ہے۔ جو اپنی زندگی میں بار بار عشق کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ مگر عورتوں میں اس قسم کے مریضِ عشق بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہ مرد پھر جلدی ہی اپنے نئے انتخاب سے اُکتا بھی جاتے

ہیں۔ اور پھر غیر ذمہ دارانہ حالت میں کسی نئے مطلوب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے آدمی کے تجزیہ نفسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دراصل اُسی حکایتی معشوق پر عاشق ہوتا ہے۔ جو اُس کے دماغ میں بچپن ہی سے مرتسم ہوتی ہے۔ اور وہ اُس کے زمانہ بچپن کے ابتدائی ایام کی ماں کا دھندلا سا عکس ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کو اُس زمانہ میں اپنی ماں کا ہر وقت اتنا قرب حاصل ہؤا کرتا ہے اور اُس کے جذبات محبت اُس کی ماں کے ساتھ اُس معیاری حد تک مکمل ہو چکے ہوتے ہیں۔ کہ اُس کے لئے عمر بھر یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی اور شکل کی عورت کے ساتھ مستقل طور پر اپنے آپ کو وابستہ رکھ سکے۔ اس قسم کا ایک مشہور واقعہ وہ ہے جبکہ ایک آدمی بادی النظر میں اپنی عورت کے ساتھ نہایت خوشگوار حالت میں دس سال تک عمر بسر کرتا رہا۔ اور اُس کی نسبت گرد و نواح میں مشہور ہو چکا تھا۔ کہ وہ کتنا وفادار خاوند ہے۔ تب یکایک اُس نے ایک دن اپنی عورت کو کہا کہ وہ چند سالوں سے ایک دوسری عورت کے ساتھ محبت کر رہا ہے۔ تجزیہ نفسی کے ذریعہ معلوم کیا گیا کہ دراصل اُس نے شادی کے بعد سے ابتک بہت سی عورتوں کے ساتھ خفیہ عشق کیا تھا۔ اُس نے بڑی شرم سے یہ تسلیم کیا۔ کہ وہ ہر اُس عورت سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ جو اُس سے مشفقانہ سلوک کرتی ہے۔ یہ حالت بھی باقی اُسی قسم کی حالتوں میں سے تھی جہاں بچپن میں بچّہ کے ساتھ ماں زیادہ محبت کرتی ہے۔ سُلاتے وقت اُسے ماں فرطِ محبت سے اتنا پیار کرتی اور چومتی تھی کہ وہ جوشِ مسرت سے سُرخ ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں زندگی میں جب کبھی کوئی عورت اُس کے ساتھ اُسی قسم کی شفقت سے پیش آتی تو فوراً اُس پر بچپن کی حالت طاری ہو جاتی۔ اور وہ اپنے آپ کو اُس عورت کے حوالے کر دیتا۔ اس قسم کے آدمیوں کو قابو میں لانا عورتوں کے لئے بہت آسان بات ہوتی ہے۔

والدین کا بچوں کے ساتھ محبت و پیار کرنا بھی ایک کافی مشکل اور غور طلب مسئلہ ہے۔ والدین کا اپنے بچے کو اپنی محبت سے محروم کرنا ایک سخت جُرم ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی برابر کا سخت جرم ہے کہ بچوں کو اسقدر زیادہ پیار کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ تمام عمر اُس پیار کے فقدان کو محسوس کرتے رہیں۔ اس معاملہ میں اکثر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ یا تو بچّہ کو بہت پیار سے پالا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا والدین سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ اور اُس میں شفقت کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور باقیماندہ عمر وہ سب سے اسی سلوک کا متمنی رہتا ہے۔ اس عادت نے ہزاروں لڑکوں کو تباہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کثرت سے آرام طلب بن جاتے ہیں۔ اور دنیا کے اس میدان عمل میں حقیقتوں سے منہ موڑ کر راحت طلبی اور عیش و عشرت کے پیچھے دوڑنے لگ جاتے ہیں اور پھر بھی کسی چیز میں حقیقی راحت نہیں پا سکتے۔ کوئی چیز اُن کی دلکشی و دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اُن کو ہر جگہ والدین کے سایہ اور سرپرستی کی ضرورت رہتی ہے۔ کیونکہ بچپن سے اُن کی عادت ایسی بن چکی ہوتی ہے خواہ وہ دس سال۔ بیس سال یا پچاس سال کی عمر کے ہوں۔ مگر وہ ہر وقت دماغی حالت میں بچّے ہی ہوا کرتے ہیں۔

تکالیف دماغی و اعصابی کے جتنے اسباب ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا سبب والدین کا بچّہ کے ساتھ زیادہ

پیار ہوا کرتا ہے۔ بیماری کی حالت میں اکثر والدین کو جو عام طور پر اپنے بچوں پر اتنے مہربان نہیں ہوا کرتے زیادہ توجہ اور اُنس سے پیش آنا پڑتا ہے۔ والدین کا یہ سلوک بھی بچوں کا غیر شعوری حالت میں بیماری کی طرف زیادہ رجحان پیدا کرتا ہے۔ تاکہ وہ اس طرح سے اُن کی توجہ و سلوک کا مرکز بن سکیں۔ یہ خواہش بڑی عمر کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو عجیب و غریب قسم کے فرضی دردوں اور بیماریوں میں مبتلا دکھا کر دوسروں کی ہمدردی اور توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ناپسندیدہ کاموں کے کرنے سے اپنے آپ کو معذور ظاہر کر کے خلاصی پا لیتے ہیں۔ لہذا ہم کو اپنے بچوں کے ساتھ ہر وقت ایک ہی طرح کا سلوک کرنا چاہئے۔ خواہ وہ بیمار ہوں یا تندرست تاکہ اُن میں یہ کمزوری سرایت نہ کرنے پائے +

جو والدین ضابطہ کے نرم ہوتے ہیں اُن کی اولاد سخت خسارہ میں رہتی ہے۔ آجکل کی شخصی آزادی و انفرادیت کو دیکھ کر والدین کا رجحان اپنے بچوں کو زیادہ آزادی دینے کا ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ بچوں کے افعال و حرکات سے زیادہ تعارض کرنا نہیں چاہتے۔ مگر یہ بھی اُن کی غلطی ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ جب اُن کے بچے بڑے ہو کر عملی دنیا میں قدم رکھیں گے۔ تو اُن کو ہرگز گھر کی سی آزادی میسر نہ آسکیگی۔ اور نہ کوئی اُن کی اُس آزادی کو برداشت کر سکیگا۔ پس اس قسم کے والدین کی اولاد لاڈلی ہو کر ضایع ہو جاتی ہے۔ اور اُن کو عادت پڑ جاتی ہے کہ اگر کوئی کام وہ اپنی مرضی کے مطابق نہ کر سکیں تو وہ اُس کام کو سرے سے کرتے ہی نہیں +

دوسری طرف تفریط کا یہ عالم ہے کہ جسمیں والدین اپنی اولاد کو جائز محبت۔ توجہ اور سرپرستی سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ محبت ایک فن (آرٹ) ہے۔ جو فقط والدین ہی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ جب لڑکے والدین کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ تو اُن میں محبت کی بہت گہری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جسے بہت زور سے اُنکو دبانا پڑتا ہے۔ اور اس طرح محبت کرنے یا کئے جانے کی جو فطری طاقت اُن میں ہوتی ہے۔ اُس کی تسلّی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ جو عمر بھر شادی نہیں کرتے۔ اُن کی سوانح عمری کو غور سے دیکھا جائے تو اکثر یہی وجہ نکلیگی +

چھوٹے بچوں کے لئے یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ کہ اُن سے اُس کی ماں جو اُس کے لئے ہر وقت فوراً آرام اور مسرت مہیا کرتی ہے۔ اور جو ہر وقت اُس کی نگرانی کرتی ہے یکلخت جدا کر دی جائے۔ اُس حالت سے جبکہ بچہ ماں پر بالکل انحصار رکھتا ہے۔ بچہ کو آہستہ آہستہ علیحدگی کے لئے تیار کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اگر بہت کم سنی کی حالت میں اُس کو ماں سے جدا کر دیا گیا۔ تو اُس کو اپنی ذات کے ساتھ محبت کرنے کی مبالغہ آمیز عادت پڑ جائے گی۔ اور اگر اُس کے بزرگ اُس کے لئے ناقابل رسائی ہوں۔ اور وہ خارجی دنیا سے تسکین حاصل نہ کر سکے۔ تو اُس کی تسکین حاصل کرنے کی بڑھتی ہوئی آرزو اپنی ذات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ یہی ابتدا ہے داخلی مزاج (————) کے بننے کی کہ لڑکے کی تمام تر توجہ اپنی حسیات کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ ایسا لڑکا بہت اغلب ہے کہ خارجی دنیا کی طرف سے سخت

بے پروا ہوجائے۔ بلکہ اُسے نفرت ہونے لگے۔ اور باقی انسانوں کے خلاف بھی اُس میں نفرت کا مادہ پیدا ہو۔ ایسی حالت میں اُس میں تنہا رہنے کا سخت رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔ اور اُسے اس قسم کی تنہائی میں خاص لطف آتا ہے۔ پھر اُس کی طبیعت میں انتشار اور بداخلاقی کی غیر معمولی رغبت پیدا ہوجاتی ہے۔ چونکہ اس طرح لڑکے کی تمام تر توجہ اپنے اوپر مرکوز ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اُس کی حسیات کو زیادہ تحریک قبل از وقت ملنے لگتی ہے۔ اور اس طرح لڑکے میں قبل از وقت جنسی اور جسمانی آرزوؤں کا جوش ظاہر ہونے لگ جاتا ہے۔ اور لڑکا اس نسبت سے بداخلاق بنتا چلا جاتا ہے۔ جس نسبت سے اُس کی آرزوئیں ناکام یا بغیر تسلی یافتہ صورت میں رہنے لگتی ہیں۔ اور اس قسم کی ایک سخت طاقت ور اور فطری آرزو طلب محبت ہے جس سے وہ ابتدا ہی میں محروم کیا گیا تھا۔

(۴)

بچے کی بداخلاقی

چھوٹے بچے کے لئے اُس کا جسم نہایت ہی دلکش چیز ہوا کرتا ہے۔ اور لڑکا اکثر اس دلچسپی کا اظہار کیا کرتا ہے۔ والدین جو اپنے بچوں سے اس جسمانی دلچسپی کو بذریعہ شرم تحکمانہ طرز اور ڈرا دھمکا کر چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے اس فعل سے لڑکے کے دل میں اور زیادہ اُس کے جسم کے متعلق خیالات مرتسم کردیتے ہیں۔ اور اس سے لڑکے کے دل میں جنسی کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ اور آئندہ چل کر ایسا لڑکا سوسائٹی کے سامنے خواہ کتنی ہی اخلاقی زندگی کیوں نہ بسر کر رہا ہو اُس کے غیر شعوری حصہ دماغ میں ایک خفیہ مگر نہایت تیز آرزوئے جنسی ہر وقت موجود رہا کرتی ہے۔

مصنوعی شرم وحیا دراصل ایک عامیانہ جذبہ ہے جسے ظاہراً احتیاط کی بنا پر تہذیب کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اور اس جذبہ کی اس شکل کے اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے۔ کہ لڑکا اپنے والدین یا سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے فطری جذبہ جنسی کو دبا کر اور شکل اختیار کرنا چاہتا ہے۔ بہت سے لوگ جو بعد ازاں جنسی جذبہ کے اظہار اور تسلی کے لئے نئے نئے اور غیر فطری طریقے اختیار کر لیتے ہیں اگر اُن کا تجزیہ نفسی کیا جائے تو بچپن کے کسی ایسے ہی غلط طریق اصلاح کا اختلاف اس کا موجب نکلیگا۔ ہمارے لڑکے صحیح معنوں میں تب آدمی بن سکتے ہیں۔ جب ہم والدین صحیح طور پر اپنے لڑکوں کے سامنے اہم جنسی مسائل علمی طریقے سے جذباتی رنگ سے جدا کرکے پیش کرینگے تاکہ لڑکا جنسی اور نوعی معاملات کو صاف اور سادہ طور پر دیکھ سکے اور اُس کے لئے یہ کوئی پُراسرار چیز نہ بن جائے جس کے افشا کا شوق اُسے ہر وقت لگا رہتا ہے جس طرح زندگی کے دوسرے اہم معاملات کو ہم سنجیدہ اور عمدہ طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی طرز میں یہ معاملات بھی وضاحت کے ساتھ لڑکوں کے سامنے بیان کردینے چاہئیں۔

(۵)

سزا بطور اصلاح

بچوں کی تربیت کے طریقوں پر غور کرتے وقت سزا کے جواز کا مسئلہ بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جسمانی سزا ہر جگہ ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ گو تاہم کبھی کبھی ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ جہاں اس کے جواز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اور اگر انصاف کی نظر اس مسئلہ پر ڈالی جائے تو دونوں صورتوں میں اعتراض کرنے کی کافی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس امر کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کس طرح لڑکا درد اور جنسی لذت کے درمیان تعلق قایم کر لیتا ہے۔ اور یہ اثر زندگی بھر اُس کے دماغ میں قایم رہ جاتا ہے۔ اکثر لڑکے غیر شعوری طور پر "مضروب" (ـــــــــ) بن جاتے ہیں۔ اور غیر ارادی طور پر مار کھانے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے ایسے بہت بچے دیکھے ہیں۔ جو ایک دفعہ مار کھانے کے بعد تمام امکانی کوشش دوبارہ مار کھانے کے لئے کرتے ہیں + دوسری طرف اکثر لڑکوں میں "ضارب" (ـــــــــ) بننے کا رجحان زیادہ غالب رہتا ہے۔ اور وہ دوسروں کو مارنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ اگر ماں غصہ کی حالت میں بچہ کو تھپڑ مارتی ہے۔ تو وہ اپنے اس فعل سے نہ صرف بچہ میں غیر فطری رجحانات کی نشوونما میں امداد کرتی ہے بلکہ وہ بچہ میں اعصابی بیماریوں کے پیدا ہونے میں بھی مدد کرتی ہے +

جسمانی سزا کا بطور اصلاح کامیاب ثابت ہونا والدین اور بچے کی دماغی حالت پر انحصار رکھتا ہے۔ اگر والدین بغیر کسی جذبہ کے اظہار کے بچہ کو تھپڑ مار سکیں تو اُس سے کچھ فوائد ضرور مرتب ہو سکتے ہیں۔ مگر دنیا میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو دوسروں کو بغیر اظہار غصہ یا کسی دوسرے جذبہ کے تھپڑ مار سکتے ہیں؟ بچہ والدین کی اس جذباتی مشتعل شدہ حالت کو دوبارہ دیکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ بچہ میں حیرت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ صرف نفرت کا سوال نہیں بلکہ غیر شعوری وغیرہ ارادی طور پر انتہائی مشتعل شدہ جذبہ کے اظہار کی حالت کو دیکھ کر بچہ کی مسرت اور جذبۂ حیرت کی تشفی ہوتی ہے۔ باپ یا ماں کو ناراض دیکھ کر بچہ خواہ تکلیف محسوس کرے۔ مگر اُس کے جذبۂ حیرت کی تسلی وتشفی غیر ارادی طور پر ضرور ہو جاتی ہے۔ اس لئے بچے عموماً بار بار اُس کام کے دُہرانے پر مُصر ہوا کرتے ہیں۔ جو اُن کے والدین کو دق کرے +

بچے سے بہت سی توقعات کے پورا کرنے کی خواہش یا بہت سے احکامات کے پورا کرانے کی خواہش کرنا سخت مضر ہوا کرتی ہے + بہت نفاست۔ انتہائی جفاکشی بہت ستھرا پن ڈسپلن وغیرہ وغیرہ جیسی خوبیوں کی بچہ سے توقع رکھنا بچہ کی فطرت اور جبلت کے مکمل اظہار اور نشوونما کے لئے سخت مانع ہے۔ اور نتیجتہً لڑکے کو معمولی چیزوں کو بہت اہمیت دینے کی عادت پڑ جانے سے اُس کا دماغی توازن قایم نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بہت سی عمدہ خوبیاں ہیں جن کے لئے ہمیں بچوں کو عادی بنانا چاہئے۔ مگر مبالغہ اور غیر معمولی اہمیت بھی

ہر شے کو بُرا بنا دیتی ہے۔ لہٰذا ہم کو درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور اس امر کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ بچّہ کو ہمارے سخت قوانین اور ضابطہ کے مطابق خوگر ہونے کے لئے اپنی فطرت کے ساتھ سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ بچّہ جدوجہد کا عادی بنے +

بچّوں کے اچھے کاموں کا بدلہ محبّت و پیار اور خاص خاص حقوق کی صورت میں دینا بہ نسبت سزا دینے یا نہ دینے کے اُن کے حق میں یقیناً بہت مفید ہے۔ مگر بچّوں کو نقدی کی صورت میں انعام دینا یقیناً بُرا ہے۔ کیونکہ اس سے بچّہ ہر اچھے کام کے عوض نقدی طلب کریگا۔ اور یہ عادت بعدازاں اُسے صرف نقدی ہی کا والہ و شیدا کرکے ہر عمدہ اخلاقی کام کی جزا زر ہی مقرر کردیگا۔ حالانکہ بچّے کو محبّت کی خاطر کام کرنے کا عادی زیادہ آسانی سے بنایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ بچّہ محبّت کا بہت شیدا ہُوا کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس طرزِ عمل پر بچپن ہی سے عمل شروع کیا جائے۔ اگر متذکرہ بالا طریق پر ابتدا ہی سے عمل شروع نہ کیا گیا ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں کوئی اعجازی اثر ظاہر نہیں ہونے لگتا کیونکہ کسی عادت کے بدلنے میں ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اور صبر و استقلال سے تدریجاً ترقی کی جاسکتی ہے +

(۶)

گھر کی فضا

بچّے کی عمدہ تربیت کے لئے ایک سب سے زیادہ اہم عنصر گھر کی ہم آہنگ فضا ہے۔ دماغی بیماریوں میں مبتلا شدہ والدین میں بہت کم ایسا دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ماں اور باپ دونوں ملکر بچّہ کی تربیت کریں۔ بہت دفعہ تو ماں بچّہ کو خود ہی بتا دیا کرتی ہے۔ کہ اُس کا باپ کتنا ذلیل۔ نا قابلِ اعتبار اور ذلیل انسان ہے + یا پھر والد ہی غیر ارادی طور پر بچّہ کو بتا دیا کرتا ہے۔ کہ اُس کی ماں کتنی وہم پرست۔ بُزدل۔ کمزور اور غیر مستقل ہستی ہے۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ والدین اکثر آپس میں اُس وقت جھگڑتے ہیں جبکہ اُن کے بچّے اُن کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا بہت دفعہ ایسے جھگڑے ہی بچّے کے کسی اعصابی تکلیف اور اُلجھن کی بنا بنتے ہیں۔ کیونکہ بچّہ جس کے لئے قبل ازیں والدین قابلِ عزت ہستی ہُوا کرتے ہیں۔ ان واقعات کو دیکھ کر والدین سے اعتبار کھو بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا والدین کو اپنے اختلافات اپنے بچّوں کی ساعت میں نہ فیصلہ کرنے چاہئیں۔ اور اگر وہ خواہ مخواہ آپس میں لڑنے کا تہیّہ کرچکے ہوں تو اُن کو ایسے موقع کا صبر سے انتظار کرنا چاہئے جبکہ اُن کے اس فعلِ بد کا نتیجہ اُن کے معصوم بچّوں کے دلوں پر مرتسم نہ ہوسکے۔ یہ والدین کا اہم فرض ہے اگر وہ بچّوں کی تربیت کا خیال اپنے دل میں رکھتے ہوں +

ایسی مائیں جو اپنے خاوندوں کی بے توجہی کا شکار بن چکی ہیں وہ اپنے فطری جذبۂ محبّت کو پورا کرنے کی خاطر اپنی تمام محبّت اپنے بچّوں کی طرف مبذول کردیتی ہیں۔ اس طرح ماں کو اپنے فطری جذبہ کے اظہار کا راستہ تو مل جاتا ہے۔ مگر اُس کا اثر بچّہ کے لئے سخت خراب ثابت ہوتا ہے۔ علم النفس نے اس قسم کی محبّت کے اثر بد پر

اب کافی روشنی ڈالی ہے۔ یہ دراصل وہ محبت ہے جس کا اصلی مستحق یا جائے استعمال اُس کا خاوند تھا۔ اگر ماں اُس وفورِ جوش جس کا اصلی جائے استعمال اُس کا عشق یا اُس کا خاوند ہونا چاہئے تھا۔ سے اپنے بچّہ کا بوسہ لے تو اس کا اثر بچّہ کے حق میں اُس کے جذبات جنسی کو قبل از وقت تحریک دینا ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچّہ کا خوابیدہ جذبۂ جنسی قبل از وقت بیدار ہو جائے گا۔ اور اس طرح بچّہ کے حسیات اپنی طاقت سے زیادہ استعمال ہو کر غیر فطری اور معکوس طریقِ تشفی اختیار کر لیں گے۔ والدین کی محبت جائز حد تک ہونی چاہئے۔ اور ہر وقت نشاطِ جذبہ کے بغیر بچّہ کے جسم کے کسی حصّہ کو چومنا۔ اُسے گود میں دبانا۔ دبوچنا۔ گدگدانا۔ چٹکی لینا۔ چھونا وغیرہ وغیرہ طریقِ اظہارِ محبت بچّہ کے لئے سخت مضر اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے حرکات بچہ کو عادی بنا دیتے ہیں اور زمانہ طفلی کے گزر جانے کے بعد بہت عرصہ تک غیر ارادی طور پر اس قسم کی باتوں کی اُسے خواہش رہتی ہے۔

عام طور پر والدین کے ناخوشگوار تعلقات بچّے کی جذباتی زندگی پر سخت بُرا اثر چھوڑتے ہیں۔ جھگڑا بیک وقت بچّے کے دل میں نفرت اور شوق کے جذبے پیدا کرتا ہے۔ لڑکا جب ظاہراً یہ دیکھتا ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے اُس پر حملہ ہو رہا ہے تو اُس کے دل میں اس حملہ کے برخلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ جذبات کے اس مشتعل شدہ صورتِ اظہار کا فریفتہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح شدّتِ نفرت۔ شدّتِ حسد وغیرہ وغیرہ کے جذبات مستقل طور پر خود اُس کے اندر بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کی توجہ جذبات کے اُن اظہار کی طرف راغب ہو جاتی ہے جس سے دماغی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح والدین کی خاندانی زندگی بچّہ کے جذباتی زندگی کی برہمی کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔

نئے بھائی یا بہن کی پیدائش بھی بچّہ کے لئے ایک اہم واقعہ ہُوا کرتا ہے۔ جس کا اثر بچّہ پر بہت کچھ پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ اپنے والدین کی محبت کا واحد مالک ہوتا ہے۔ والدین کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ بچّہ کتنی جلدی اپنے والدین کی اپنی طرف کم توجہی کو محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ اور نئے مہمان کی خاطر اپنے آپ کو طاقِ نسیاں پر دھرا دیکھ کر سخت برہم ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کی خصلت و عادت میں فوری انقلاب آنے کا سخت خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ گھر کے مشاغل میں جو لطف پہلے حاصل کیا کرتا تھا چھوڑ دیتا ہے۔ اور دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ لہذا بچّہ کو نئے آنے والے سے پہلے ہی اس تبدیلی کے لئے تیار کر لینا چاہئے۔ اور نئے بچّے کے فوائد اُس کے دل میں اچھی طرح ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ تاکہ اس طرح وہ نئے مولود کے ساتھ محبت کرنے لگے۔ اور اُس کی سابقہ دلچسپی ضائع نہ ہونے پائے۔ اور حسد و بغض کے جذبات اُس کے اندر پیدا نہ ہو سکیں۔

(۷)

احساسِ کمتری

چونکہ بہت سے خاندانوں میں مراتب کا لحاظ جاری ہے۔ اس لئے والدین غیر ارادی طور پر اپنے بچّوں کے

اندر یہ احساس پیدا کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ کہ وہ والدین کی اہمیت اور اُن کے بلند مرتبہ کا احساس اپنے اندر پیدا کریں۔ مگر ایسی حالتوں میں جبکہ بچّہ اپنے والدین کی برتری سے متاثر ہوتا ہے اُس کے اندر مقابلتاً اپنے بہت کم ہونے اور حقیر ہونے کا احساس بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ ایک خطرناک حالت ہے جو سراسر ناجائز اور غیر ضروری ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ وہ بچّہ کے مالک ہیں اور بچّہ اُن کی ملکیت ہے۔ اس لئے لڑکے کو ہر وقت فرمانبرداری پر کمربستہ رہنا چاہئیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بچّہ جماعتی فرد ہے۔ جو کسی صورت میں بھی والدین کی ملکیت نہیں۔ لڑکا خود اپنا مالک ہے اور وہ سوسائٹی کی ملکیت ہے۔ وہ ایک فرد ہے جو اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے؛ ہاں پیدا کیا گیا ہے پس وہ آزاد ہے۔ نہ کہ کسی خاندان کا غلام +

بچّہ جبلتاً اپنے قوٰی کا اظہار چاہتا ہے۔ اور بچّہ کی اس فطری خواہش کی رُکاوٹ تباہ کن ردِّ عمل پیدا کرتی ہے۔ لہذا بچّہ کو نقصان دہ کاموں کے کرنے سے روکنے کے لئے خود بخود مفید کام اُن کے لئے مہیّا کرنے چاہئیں۔ تاکہ اس طرح پر اُن کی قوّت اچھے کاموں میں صرف ہو۔ اس بات کا ہر وقت خیال رکھو کہ بچّہ میں کبھی یہ حِس نہ پیدا ہونے دو کہ وہ کسی طرح سے اَوروں سے کمتر ہے۔ یہانتک کہ پیدائشی معطّل عضو والے بچّوں کے بھی ذہن نشین کر دینا چاہئیے کہ وہ باوجود اس کمی کے بھی کسی سے کمتر نہیں۔ اور کہ وہ اپنے کسی دوسرے قوٰی کے نشو و نما سے اس کمی کی تلافی کر سکتے ہیں اور کہ اپنے قوا کے صحیح استعمال سے ہر بچّہ سوسائٹی کا بہترین فرد بن سکتا ہے۔ اور سوسائٹی میں عمدہ رتبہ حاصل کر سکتا ہے +

(۸)

لڑکا یا لڑکی

پُرانے خیالات والے گھروں میں ابھی تک یہ غلط خیال دلوں پر مسلّط ہے کہ لڑکیاں لڑکوں سے رُتبہ میں کمتر ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کی پیدائش پر اظہارِ رنج کیا جاتا ہے۔ عورتیں خود بھی اپنے آپ کو مردوں سے کمتر اور ذلیل مخلوق سمجھتی ہیں۔ پھر گھروں میں لڑکیوں کے لئے بہت سی آزادیاں دی جاتی ہیں۔ حالانکہ لڑکیوں کے لئے بہت سی ممنوعات وضع کر دیئے جاتے ہیں۔ اسیوجہ سے بہت سی عورتیں یہی خواہش کرتی ہیں کہ کاش وہ مرد پیدا ہوتیں + یہ بھی ایک بڑی وجہ عورتوں میں اعصابی بیماری کے پیدا ہو جانے کی ہے۔ کیونکہ جب کبھی کسی مرد یا عورت کے فطری حقوق میں خلل اندازی کی جاتی ہے تو نہ صرف اُن کی جسمانی حالت ہم ایسا کرنے سے خراب کرتے ہیں بلکہ اُن کی روح اور چال چلن کو بھی مجروح کر دیتے ہیں +

والدین کو یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ لڑکی ہر طرح سے اتنی ہی اچھی ہے جتنا کہ لڑکا۔ اور اگر ان میں کوئی فرق ہے تو صرف یہی کہ اُن کے طریق کار جُدا جُدا ہیں۔ سوسائٹی کی ترقّی کے لئے مرد و عورت میں کون برتر ہے۔ صرف اس لئے مرد کو ترجیح دینا کہ بعض کام جو اُن کے دائرۂ عمل کے لئے مخصوص ہیں۔ اچھے ہیں کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ

اس قسم کی دلیلوں میں جو عام طور پر مرد و زن کے ایک دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے پیش کی جاتی ہیں کوئی منطق نہیں ہوا کرتی۔ اگر کاروباری دنیا میں نظر دوڑائی جائے تب بھی عورت کی اہمیت زیادہ نظر آتی ہے۔ جبکہ ایک کامیاب آدمی کے کاروبار اور گھر کی اندرونی منتظمہ اور ہم آہنگ زندگی کو اکٹھا کیا جائے +

(۹)

والدین سے علیحدگی

اب آخر میں ہم سب سے زیادہ اہم مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں جس کی طرف ناتوجہی نے بہت سی زندگیوں کو خراب تباہ کر دیا ہے۔ یہ بچوں کا والدین سے تدریجاً علیحدگی کا مسئلہ ہے۔ اگر ہمارے لڑکوں نے اس بر سرِ پیکار دنیا میں کامیاب ہونا ہے۔ تو ان کی یہ علیحدگی نہایت ضروری امر ہے۔ لڑکے والدین کی حفاظت میں رہ کر انفرادی شخصیت و خود مختارانہ حیثیت کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ بڑے درخت کے نیچے اگر پودا لگا دیا تو وہ کبھی نشوونما نہیں پا سکیگا اور ہمیشہ مرجھایا رہیگا۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت تیز و تند آندھیوں کے ذریعے تخم کو اپنے والدین کے درخت سے دور دراز اُڑا کر جا پھینکتی ہے۔ تاکہ وہ وہاں آزادی سے بڑھ کر شاندار درخت بن سکے۔ ٹھیک اسی طرح والدین سے بچوں کی تدریجاً علیحدگی عمل میں لائی جائے تاکہ سوسائٹی کا مقصد وسیع پیمانہ پر پورا ہوتا رہے۔ اور محبت تنگ دائرہ سے نکل کر وسعت اختیار کرتی جائے۔ اور یہ بات فرد کے ذاتی فائدہ کے لئے بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ وہ اس طرح پر سوسائٹی کا مفید عنصر بن سکے +

وہ والدین جو اپنے بچوں کو ہر وقت اندرونی گھر کی فضا میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ بچوں کے سخت دشمن ہوتے ہیں۔ کیونکہ بچہ بعد ازاں پھر اس قابل نہیں رہتا کہ اُس کی گھر سے بیرونی دنیا کی طرف دلچسپی بڑھائی جا سکے لہٰذا والدین کو آہستہ آہستہ اپنے بچوں سے شکنجہ اقتدار ڈھیلا کرنا چاہئے۔ اور وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ وہ لڑکوں کے دماغ پر مکمل طور پر مسلط تو نہیں ہو رہے۔ والدین کو خود بخود اپنے بچوں کو علیحدگی کے فوائد اور اہمیت ذہن نشین کرا دینا چاہئے۔ اور گھر سے باہر نکل کر دنیا میں دلچسپی لینے کا عادی بنانا چاہئے + اس میں شک نہیں کہ یہ علیحدگی ابتدا میں نہایت رنجدہ ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ ایک اہم فرض ہے جس کے لئے ہم کو بہت ایثار کرنا چاہئے۔ اور یہ ایثار آنے والی نسلوں کی ترقی اور ارتقا کے لئے بہت اہم اور ضروری ہے +

اگر ہم اپنے بچوں کو ہر وقت اپنے پروں کے نیچے دبائے بیٹھے رہیں۔ تو ان کے لئے کامیابی کے بے شمار مواقع ضائع کر رہے ہوں گے۔ اور اگر ہم لڑکوں میں یہ عادت ڈالیں کہ وہ تھوڑے تھوڑے حقیر اور چھوٹے چھوٹے معاملہ کے لئے بھی ہمارے پاس امداد کے لئے دوڑے ہوئے آئیں تو ہم ان کو ان کی قوت فیصلہ کی نشوونما اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی قیمتی اور قابل قدر خصلت سے محروم کر دیں گے۔ اور خاص کر جبکہ ہم آیندہ زمانہ میں ہر وقت ان کو مشورہ و امداد دینے کے لئے اُن کے ساتھ نہیں رہ سکتے +

پس جیسے ہی ہم آہستہ آہستہ بچے کو اُس کے خارجی ماحول کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے جائیں ویسے ہی ساتھ ساتھ ہم کو اُن کی لگام ڈھیلی کرتے جانا چاہئے۔ ایسا کرنے سے ہم بچوں کو آیندہ کے لئے ایک مستقل ہستی بناتے جائیں گے۔ تاکہ وہ اپنے آزادانہ قیام کے لئے مسرتیں حاصل کر سکیں۔ ہم کو خود بھی اس کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور اس پر غور اور فکر کرنا چاہئے۔ اور بچے پر بجائے دباؤ ڈالنے اور غلط اقتدار قایم کرنے کے بچے کو ماحول کے مطابق صحیح عقلی طور پر اپنے آپ کو سنوارنے کے لئے تیار کرنا چاہئے۔

بچوں کی صحیح تربیت کے لئے یہ سب سے زیادہ ضروری امر ہے کہ والدین کے لئے اس مضمون پر نہایت صحیح اور مفید معلومات کثرت سے مہیا کئے جائیں۔ تاکہ وہ صحیح روشنی میں بچوں کی تربیت کا سب سے مقدس ترین فرض نہایت اہتمام کے ساتھ پورا کر سکیں۔

جرأت و بسالت

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

(از ادیب لبیب جناب عمر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی)

جرأت اُن اخلاق شریفہ میں سے ہے جن کے بغیر انسان بے قیمت اور نکما ہے۔ جرأت کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ انجام تو دور رہے کسی کام کا آغاز بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک فاتح میں جرأت کی ضرورت ہے۔ ایک حاکم میں جرأت کا ہونا لازمی ہے۔ رعایا کے افراد میں جرأت نہ ہو تو ظالم سے حق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ عالم میں جرأت نہ ہو تو اعلان حق نہیں کر سکتا۔ مصلحین میں جرأت نہ ہوتی تو بھی آدم کے بے شمار گمنام فرزندوں یا اربوں کیڑوں مکوڑوں کی طرح تاریکیوں ہی میں مر کھپ کر تمام ہو جاتے۔ اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ زندگی جرأت ہے۔ اور جرأت زندگی۔ اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو جرأت پیدا کرو۔ ورنہ دل کے بیٹھوں اور بزدلوں اور منہ بندوں کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں +

"اہل سپارٹہ یہ نہیں پوچھا کرتے تھے کہ دشمنوں کی تعداد کیا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ کہاں ہیں؟" (آگسٹ ثانی)

"بہادری کیا ہے اور شرافت کیا؟ اہل روم کے اعلیٰ طریق کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ اور موت کو اس امر کا افتخار بخشنا چاہئے کہ وہ ہم کو لے جائے" + (شیکسپیر)

"مجھے دشمنوں کی طرف منہ کر کے مرنے دو" + (بیرڈ)

"کوئی بڑا کام خوشامدیوں اور خوشامد پسندوں سے نہیں بن پڑا۔ جو ہر قدم پر حفاظت و ضمانت کے طلبگار رہا کرتے ہیں" + (جاسنج الیمیٹ)

"قسمت اُنہی کی دوست و رفیق بن جایا کرتی ہے جو جری ہوتے ہیں" (ڈرائیڈن)

جرأت کی ایک ہی قسم نہیں بلکہ اقسام ہیں۔ سب قسموں میں ایک ہی روح جاری و ساری ہے +

اس کے لئے جرأت درکار ہے کہ ایک نوجوان تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہو سکے۔ جبکہ دوسرے اور دل کے سامنے ستائش جوئی اور حصول قوت کے لئے رکوع و سجود کرنے اور تضرع و ابتہال سے کام لیتے ہوں۔ یہ بڑی ہی کا کام ہے کہ تم اپنے جسم پر چیتھڑے لگانے پھرو جبکہ تمہارے دوسرے ساتھی بنا سجا نے فاخرہ ست

مزین و مزیب ہوں۔ اس کے لئے ضرورت جرأت کی ہے۔ کہ انسان غربت و افلاس میں بھی امین و متدین رہے۔ جبکہ دوسرے دھوکے اور فریب سے دولت کما رہے ہوں۔ یہ جرأت ہی کا کام ہے کہ مناسب موقع پر "نہیں" کہا جائے۔ جبکہ دوسرے حاشیہ نشین "ہاں" کی صدا بلند کر رہے ہوں۔ یہ بھی جرأت ہی سے ہو سکتا ہے کہ تم اپنا فرض سکوت اور بغیر نام و نمود کے خیال کے انجام دو۔ جبکہ دوسرے شہرت پا رہے ہوں۔ اگرچہ اپنے مقدس فرائض سے تغافل کر کے ہی سہی۔ اس کے لئے بھی جرأت چاہئے کہ تم اپنی ذاتیت واقعی کو بے نقاب کر دو۔ اور اپنی نکتہ چیں دنیا کو دکھا دو کہ حقیقت میں تم کیا ہو۔ اس کے لئے بھی جرأت و جسارت کی ضرورت ہے۔ کہ بہت سی آراء کے مقابلہ میں شکست کھا کر مفتوح ہونا ہنسی ٹھٹھے کا نشانہ بننا۔ مزاح سننا۔ دل لگی کا بازیچہ بننا۔ اپنے اوپر پھبتی اڑوانا۔ بے وقوف و جاہل کہلوانا۔ بے عقل سمجھا جانا۔ غرض تمام مخالف دنیا کے مقابلہ میں سچی بات پر یکہ و تنہا قایم رہنا۔ کیونکہ:۔

وہ لوگ غلام ہوتے ہیں جو قلت افراد کی وجہ سے صداقت کا ساتھ نہیں دے سکتے +

ایک دیانتدار آدمی خراب نہیں ہوتا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایک کتا اس پر بھونکتا ہے +

یہ جرأت ہی تھی کہ انسان نے امانت الٰہی کا بار اٹھا لیا۔ جبکہ تمام کائنات نے اس مقدس و مبارک بار کو اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا +

ہم مضحکہ خیز طریق پر زندگی اس خوف سے بسر کرتے ہیں کہ ہم خود مضحکہ خیز خیال کر لئے جائیں۔ اپنی مردانگی اور عزت کے مقابلہ میں بزدل وہ شخص ہے۔ جو اپنے عہد و پیمان میں اس لئے جھوٹا ثابت ہوتا ہے کہ اس پر ہنسی اڑائی جاتی یا بولی ٹھولی کی جاتی ہے +

وہ نوجوان جو اپنی زندگی کی ابتدا میں اپنے خیالات منہ سے نکالتا ہوا ڈرتا ہے۔ اس کی زندگی کا خاتمہ بھی اس خوف پر ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے میلانات و خواہشات کے مطابق خیال کرتا ہوا بھی ڈرتا ہے +

ہم اپنے ہی کسی کام یا حرکت سے کس طرح لرزتے ہیں! حالانکہ ہم اس طرح رہتے ہیں جس طرح دوسرے رہتے ہیں۔ رسم و رواج یا تمہارے معالج اور تمہارے مذہبی رہنما تمہیں تو حکم دیتے ہیں لیکن خود اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ وہ اپنے اپنے سرکل آف تھانس (مرکزوں) سے ایک ذرہ برابر بھی ادھر ہو سکیں۔ لباس طریق رہائش۔ زمرہ خدام۔ سواریاں۔ گاڑیاں غرض تمام چیزیں فیشن کے مطابق ہونی چاہئیں ورنہ ہم ذات برادری سے خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ بھلا وہ کون مرد میدان ہے جو اپنے امور خانہ داری یا اپنے دیگر کاروبار ہی میں اپنے پسندیدہ اور سمجھے ہوئے طریقوں پر عمل کرے۔ اور رسوم و قواعد جاریہ کی دیوی کے دامن سے دست بردار ہو سکے +

یہ بھی جرأت ہی کا کام ہے کہ کوئی عوام میں کام کرنے والا شخص کسی ایسے تعصب کے سامنے جو لوگوں میں موجود ہو نہ جھکے۔ یہ بھی جرأت ہی کا کام ہے کہ کسی ایسی رسم کی پیروی سے صاف صاف انکار کر دیا جائے۔ جو

صحت جسمانی یا اخلاق کو صدمہ پہنچاتی ہو کسی پاس کے لئے کس قدر آسان بات ہے کہ وہ بجائے کسی امر کے اجرا میں ٹال مٹول کرنے لگے۔ اور تلون سے نام لینے کے مردانہ وار صداقت کے ساتھ اپنے پاؤں پر آپ جم کر کھڑا ہو جائے۔

"جھنڈوں کو پیچھے ہٹا لاؤ" ـــــــ کی جنگ میں ایک کپتان نے باآواز بلند کہا۔ جسے سنکر ایک علمبردار نے جس وقت کہ سپاہیوں میں بھاگڑ پڑ رہی تھی اور علمبردار مذکور دشمن کی طرف منہ کئے ہوئے سب کے آگے تھا کہا "نہیں! بلکہ آپ ہی سپاہیوں کو جھنڈوں کے پاس لے کر آئیے"۔

"جرأت۔ پھر جرأت۔ اور بغیر اختتام جرأت" ڈینٹن کا فرانس کے دشمنوں کو صرف اتنا ہی شریفانہ جواب تھا۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں ایک روز جبکہ فضا میں عالم سکون طاری تھا اور آفتاب چمک رہا۔ ورجینا کے شمالی جنگل میں جس وقت پیمائش کرنے والی ایک جماعت دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ یکایک لوگوں نے ایک عورت کی دلدوز چیخ سُنی۔ اور پھر یہ چیخیں پیاپے سُنائی دینے لگیں۔ تمام لوگ اپنا اپنا کھانا چھوڑ چھاڑ کے گھنے جنگل میں گھس گئے۔ کہ وہ ان چیخوں کا سبب دریافت کریں۔ عورت نے جب ان لوگوں میں ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کو جو اپنی جسمانی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے پورا جوان تھا۔ دیکھا تو یوں بولی: "اے جناب آپ ہی ہیں جو کچھ کر سکینگے آپ ہی ان مہربانوں کو سمجھائیے کہ للہ مجھے چھوڑ دیں۔ میرا بچہ۔ میرا غریب بچہ ڈوب رہا ہے اور یہ لوگ مجھے اس تک جانے نہیں دیتے۔" ان لوگوں میں سے ایک نے جو اسے پکڑے ہوئے تھا کہا: "اس کو چھوڑ دینا تو دیوانگی ہوگی۔ کیونکہ یہ عورت دریا میں کود پڑیگی اور چٹانیں اسے ٹکڑا ٹکڑا کر آن کی آن میں اسکے ٹکڑے اڑا دینگی۔" نوجوان لڑکے نے اپنا کوٹ بدن سے اُتار پھینکا اور کنارے کی کگر پر چڑھ گیا۔ ایک لمحہ تک تو وہ کھڑا چٹانوں اور طوفان خیز لہروں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر اس کے بعد ڈوبنے والے لڑکے کے لباس کا ایک حصہ دیکھ کر شور انگیز چٹانوں میں یکدم کود پڑا۔

"خدایا تیرا شکر کہ یہ شخص میرے لال کو بچا لیگا" ماں نے چلا کر کہا۔ اور عام تماشائی سب کے سب ڈھلوان کے کنارے کی طرف دوڑ کر چلے گئے۔ وہ عورت اس وقت یہ الفاظ بول رہی تھی:۔

"وہ ہے۔ ہائے میرا بچہ۔ میرا پیارا بچہ۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

لیکن باقی تمام نگاہیں اس نوجوان پر جو مضبوط دل اور قوی اُمید کے ساتھ نامساعد پر کی بہا لے جانے والی طوفانی موجوں میں جنگ کر رہا تھا۔ لگی ہوئی تھیں۔ اب ایسا نظر آتا تھا۔ کہ گویا وہ لڑکا ایک سخت چٹان سے ٹکرایا کہ اب ٹکرایا۔ جس پر پانی جھاگیں اُٹھا اُٹھا کر اچھل رہا تھا۔ کہ اتنے میں پانی کا ایک ریلا اس کو پھر دریا میں اندر کی طرف لے گیا۔ جس کی گرفت سے نکلنا ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ لڑکا دوبارہ نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ اور کہ نظر آیا۔ اگرچہ دریا کے نہایت خطرناک حصہ کے پاس تھا۔ یہاں پانی کا جوش بہت تھا

تک جانے کی جرأت نہ ہوئی تھی حتیٰ کہ [illegible] تی میں بھی اس خوف سے کہ کہیں آدمی تو آدمی کشتی کے بھی پرخچے نہ اُڑ جائیں۔ اس وقت نوجوان نے اپنی کوششوں کو دوچند کر دیا۔ تین بار تو یہ عالم ہوا کہ گویا بچّہ نوجوان کے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا۔ کہ اچانک کوئی اور عجیب لہر اُٹھی۔ اور بچّہ اُس کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ نوجوان ایک آخری کوشش کرتا ہے۔ اور بچّہ کو اس کا مضبوط دایاں بازو بلند اُٹھا لیتا ہے۔ لیکن خوف و خطر کی ایک چیخ ہر ایک تماشائی کے مُنہ سے نکل جاتی ہے۔ کیونکہ بچّہ اور وہ نوجوان دونوں کے دونوں چٹانوں سے ٹکرا کر نیچے کھولتے ہوئے پانی میں پھر گُم ہو گئیں +

"وہ ہیں" ایک عالمِ مدہوشی میں لمحہ بھر بعد معصوم بچّہ کی ماں نے بآوازِ بلند کہا۔" دیکھو! وہ محفوظ ہیں۔ خدایا میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں"۔ اور سچ مچ وہ دونوں بے گزند بھنور سے صاف نکل آئے۔ اور چند دقیقہ بعد کنارے کی ایک نشیبی جگہ پہ پہنچ گئے۔ جہاں سے ان کے دوستوں نے ان کو اوپر کھینچ لیا۔ بچّہ بیہوش تھا۔ مگر ابھی زندہ تھا۔ اور وہ نوجوان قریباً بے دم اور خستہ ہو چکا تھا۔ اطمینان و مسرت سے شکرگذار ماں بولی:-

"خدا ہی تمہیں اس کی جزا دیگا۔ وہ خود تمہارے آج کے کام کے عوض میں تمہارے لئے بڑے بڑے کام کرے گا۔ اور میری طرح ہزاروں کی دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہونگی" +

یہ نوجوان جارج واشنگٹن تھا +

جن دنوں جنرل جیکسن جج تھا۔ اور ایک چھوٹی سی نئی آبادی میں عدالت کیا کرتا تھا۔ ایک سرحدی قاتل اور چھٹا ہُوا بدمعاش وحشیانہ غصّہ کی حالت میں کمرۂ عدالت میں گھس آیا۔ اور عدالتی کارروائی میں گڑبڑ کرنے لگا۔ جج نے حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے لیکن ذمہ دار افسر میں اس تک جانے کی جرأت نہ تھی "مسلح فوجی دستہ بلاؤ" جج نے کہا "اور اس کو گرفتار کر لو" لیکن فوجی دستہ کے لوگ بھی اس بدمعاش کی دہشت سے تھرا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جیکسن نے "اچھا تو پھر عدالت پانچ منٹ کے لئے ملتوی کی جاتی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے اُٹھا اور سیدھا اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ اور اُس نے جلتے ہی عقابی آنکھ کے سحر سے واقعی اس بدمعاش کو مغلوب کر لیا۔ کہ اُس نے اپنے ہتھیار پھینک دئے۔ اور بعد میں اُس نے اپنی کیفیت یوں بیان کی کہ "اس (جنرل) کی آنکھوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ میں جس کی تاب نہ لا سکا" +

جمہوریہ فرانس کے رئیس کارناٹ کا اپنے عہدِ ریاست میں آخری کام یہ تھا کہ اُس نے فرنچ لیجن آف آنر کا تمغہ ایک ننھی سی امریکن لڑکی جو انڈیانہ میں رہا کرتی تھی۔ بھیجا تھا۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ جب پان ہینڈل ریل روڈ کی ایک گاڑی جس پر بہت سے مشاہیر فرانسیسی سوار تھے۔ اور وہ گاڑی شکاگو کے عالمگیر میلہ کے لئے چلی جا رہی تھی۔ کہ جینی کیری نے جو اُس وقت صرف دس برس ہی کی عمر کی لڑکی تھی۔ یہ معلوم کیا کہ سامنے کی طرف آگ لگی ہے۔ اور گاڑی جو خطرے کے قریب پہنچ چکی تھی اس آگ میں داخل ہو گئی تو بس فنا ہو کر رہ جائے گی۔ جونہی کہ اُسے یہ خیال آیا۔ وہ دوڑی اور ایک اونچے ٹیلے پہ چڑھ گئی۔ جہاں پہ وہ کسیقدر فاصلے سے

دیکھی جاسکتی تھی۔ وہاں پہنچکر اُس نے اپنا سُرخ فلالین کا کُرتہ جسم سے اُتار لیا۔ اور جس وقت گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی نگاہ کے سامنے آئی تو اُس نے اس لال کپڑے کو اِدھر اُدھر ہلانا شروع کر دیا۔ جسے ٹرین والوں نے بھی دیکھ لیا اور گاڑی روک لی گئی۔ اس گاڑی پر سات سو مسافر سوار تھے۔ اگر جینی جرأت اور خاطر جمعی سے کام نہ لیتی تو ان سات سو میں سے بہت سے موت کے منہ کا نوالہ ہو جاتے ✦

یہ امریکہ کی ایک انڈین لڑکی کی شجاعانہ فداکاری ہی تھی کہ جس نے کپتان جان اسمتھ کی جان بچالی۔ جب شاہ پوہاٹن نے اُس کی موت کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ اس کی تمام فوج باوجود اپنی پوری کوشش کے اس کو نہیں بچا سکتی تھی ✦

مورخہ ۱۰ مئی ۱۷۹۶ء کو نپولین نے لودی پر آسٹروی افواج کے بالمقابل ایک پل تعمیر کیا چودہ اتواپ حسب بیان دیگر تیس اتواپ پل کے ڈھانچ کے فرانسیسی حصہ کے خاتمہ پر چڑھائی گئیں۔ ان اتواپ کے عقب میں چھ ہزار جوانوں کی جرار فوج مسلح کھڑی تھی۔ نپولین نے چار ہزار گرانڈیل سپاہیوں کو پل کے سرے پر متعین کر دیا۔ جنگی صفوں میں مقابلتہ انجیلش کے طور پر تین سو گولی انداز بھی موجود تھے۔ جس وقت طبل جنگ پر چوب پڑی تو مشہور ترین حملہ آور دیواروں کی پناہ میں کنستروں اور گولیوں کی بارش میں آگے کو بڑھتے۔ اور پل کے دروازہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مدافعین کی سامنے کی صفوف اسیطرح کچھ رہی تھیں جس طرح درانتی سے خشک کھیتی کٹا کرتی ہے۔ فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ اور اُس نے شکست کھایا۔ سامنے کے بہادروں کا یہ حال دیکھ کر دوسرے سورماؤں کی طرف سے جو ان کے پیش نظر تھا جی چھوٹ چلا۔ تو اس وقت نپولین بغیر ایک لفظ کہنے یا ایک نگاہ طعن آمیز ڈالنے کے خود فوج کے سر پر جم گیا۔ اُسے آگے آگے دیکھ کر اُس کے معین اور فوجی سردار خود بخود اُس کے دائیں بائیں بازوؤں کی طرف جھپٹ کر پہنچ گئے۔ بس اب کیا تھا۔ کیونکہ فوج ایلی بارکشتوں کے پشتوں پر سے ہو کر جنہوں نے راستہ روک رکھا تھا اقدام کرنے لگی۔ اور برق رفتاری کے ساتھ جس کا شمار شاید ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ نپولین بڑھاتے بڑھاتے اپنی فوج کو دو سو گز آگے کھلے میدان میں لے گیا عین اسی مقام پر جہاں سے کہ پہلی بار اُس کی فوجوں نے شکست کھایا تھا۔ اور یہ وہ مقام تھا کہ آسٹروی افواج ان کی زد میں تھیں۔ یہ حادثہ اس قدر اچانک اور معجزانہ شان میں ظہور میں آیا کہ جس سے گھبرا کر آسٹروی توپچی اپنی اپنی توپوں کو جہاں جہاں تھیں وہیں چھوڑ چھاڑ کر بجائے اس کے کہ وہ آگے بڑھتے اور فرانسیسی حملہ کا مقابلہ کرتے الٹے پاؤں اضطراب اور گھبراہٹ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ واقعہ کیسے ظہور میں آیا محض نپولین کے جسورانہ حملہ سے یہیں پر نپولین کے قامت مختصر اور گول اندازوں کے بھاری بھرکم جسموں کے تقابل ہی میں نپولین کا عرف عام "ننھا جانباز" مشہور ہو گیا تھا ✦

جس وقت کالونا۔ کاسٹیفن۔ ذلیل مفسدوں کے جنگل میں پڑ گیا۔ تو انہیں نے اس سے بہ تمسخر دریافت کیا "کہئے اب آپ کی گڑھی کہاں ہے؟" اُس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جرأت سے کہا "یہاں"✦

محمد بن عبداللہ۔ رسول اللہ (صلواۃ اللہ علیہ) ایک درخت کے نیچے سوتے ہوئے تھے۔ آپ کی تلوار درخت میں آویزاں تھی۔ ایک دشمن جانی آیا۔ اُس نے آپ کی تلوار کو برہنہ کرکے آپ کو جگایا اور پوچھا بتا تجھے اب میری تلوار سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے نہایت سکون اور پوری جرأت سے کہا۔ "اللہ" یہ لفظ کچھ اس شان سے آپ کی زبان سے نکلا کہ تلوار ظالم کے ہاتھ سے نکل کر پرے جا پڑی +

یہ حضرت رسولِ عربؐ اور آپ کے تربیت یافتہ اسد اللہ الغالبؓ کی طمانیت قلب اور جرأت ہی کا معجزہ تھا۔ کہ ہجرت کی رات کو آنحضرتؐ کے مکان کا گھیرا ڈالے ہوئے دشمنوں کے حلقے سے زندہ بچکر نکل گئے اور صدیقؓ اکبر کے پاس پہنچ گئے۔ اور دشمنوں کی آنکھ میں خاک ڈالنے کے لئے علیؓ شیرِ خدا آپ کی جگہ جرأت و اطمینان سے چادر تان کر سو رہے +

ولنگٹن نے ایک سپاہی کو دیکھ کر جبکہ وہ دشمن کے ایک توپخانہ کے مقابلہ میں بڑھ رہا تھا۔ اور اُس کا چہرہ زرد تھا۔ کہا تھا "بہادر جوان" ہے کیونکہ یہ اپنے پیش آمدہ خطرہ کو جانتا ہے۔ اور پھر اسکا مقابلہ کرتا ہے"

لوتھر کے ایک دوست نے اُس سے کہا "وارمز میں بہت سے کارڈنلز اور بشپس (قدامت پسند عائد او مسیحی پیشوا) موجود ہیں۔ وہ تمہاری ہڈیوں تک کو جلا کر راکھ کر ڈالیں گے۔ اور تم سے وہی سلوک کریں گے جو اُنہوں نے جان ہس کے ساتھ کیا تھا" لوتھر نے جواب دیا "خواہ وہ لوگ کتنی ہی آگ بھڑکائیں اور آگ وارمز سے وٹنبرگ تک پہنچ جائے اور اس کے شعلے زمین سے آسمان تک اُٹھ رہے ہوں تو بھی میں خدا کا نام لے کر اس آگ میں سے ہو کر وہاں جاؤنگا۔ اور اُن کے سامنے ظاہر ہونگا"

لوتھر نے ایک دوسرے شخص سے کہا تھا "میں وارمز میں ضرور داخل ہونگا خواہ وہاں اتنے شیاطین و اشرار جمع ہوں جسقدر وہاں کے مکانات کی چھتوں پر اینٹیں ہیں"

ایک اور شخص نے لوتھر سے کہا "ڈیوک جارج یقیناً تمہیں قید کر لے گا" اُس نے جواب دیا "جانا میرا فرض ہے اور میں ضرور جاؤنگا۔ خواہ نو دن تک ایک نہیں لگاتار بہت سے ڈیوک جارج آسمان سے برستے رہیں" +

جب مخالفین رسول اللہؐ کی طرف سے پیاپے مدینہ پر یورشیں ہو رہی تھیں ایسے ہی ایک موقع پر آپؐ نے اپنے اعوان و انصار سے مشورہ لیا کہ محصور ہو کر دفاع کیا جائے یا میدان میں نکلکر مقابلہ۔ آپؐ کا رجحان طبیعت اس طرف تھا کہ قلعہ بند ہو کر دفاع ہی کرتے رہیں۔ مگر بعض پرجوش نوجوانوں نے مشورہ دیا باہم محصور ہو کر لڑنے کی بجائے میدان میں جان دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آخر یہی بات قرار پائی۔ آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ ہتھیار لگا کر باہر آئے۔ نوجوان اپنے تقدم علی الرسولؐ پر پشیمان تھے۔ اس لئے بولے ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں۔ اشجع العرب نے کہا "خدا کا نبی ہتھیار لگا کر یوں نہیں اُتارا کرتا"

اسیطرح ایک موقع پر جب دشمن کے غلبہ سے لشکر اسلام میں بھاگڑ پڑ گئی تو آپ نے اپنے خچر کی لگام دونوں طرف سے دو جاں نثاروں کو سپرد کر دی کہ خچر کو دشمن کی طرف آگے بڑھائیں۔ جب بڑے بڑے بہادر دشمن کو

پیٹھ دکھا رہے تھے۔ خدا کا رسولؐ دشمن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور یہ شعر اُس کی زبان پر تھا ؎

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

ایک مغربی روزنامہ نے ایک دفعہ (______________) متحدہ و متفقہ افسروں کو دعوتِ عام دی کہ امریکہ کی خانہ جنگی (سول وار) کے متعلق ایسے واقعات کو جو شجاعت کی بہترین مثال ہوں بالتفصیل اپنے اپنے مشاہدات کی بنا پر بیان کریں۔ کرنیل تھامس ونٹورتھ ہگنسن نے بیان کیا:۔ ایک دفعہ بیفرٹ کے مقام پر کھانے کے موقع پر۔ جس جگہ کچھ بدمعاش۔ اوباش اور مسخرے اور ڈاکو بھی جمع تھے اور شراب ناب بے دریغ لنڈھائی جا رہی تھی۔ وہاں پر ڈاکٹر مائنز نے (جو کہ اس وقت نام خدا ایک نازک اندام طفلک ہی تھا) شراب نہ پی تو اُسے کہا گیا کہ وہ یہاں سے جا نہیں سکتا جب تک کہ کم از کم وہ ایک "جام صحت" نہ پی لے۔ اور کوئی ایک کہانی یا راگ نہ سنائے۔ اُس نے جواب دیا۔ "میں گا تو سکتا نہیں۔ البتہ ایک جام ضرور پی سکتا ہوں خواہ شراب ناب کی جگہ آبِ صاف ہی کا۔ اور یہ جام صحت ہماری ماؤں کا جام صحت ہے"۔ حاضرین اس کے اس برجستہ قول سے اسقدر متاثر اور اپنی مسخرگی پر خفیف ہوئے کہ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُس کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے ایسی قابلِ تحسین اخلاقی جرأت کا اظہار کیا +

جیسا کہ قاعدہ ہے کہ مضبوط ترین آدمی میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ اسی طرح بڑے سے بڑے "بطل عظیم" میں بھی کہیں نہ کہیں بزدلی کا کوئی نہ کوئی شائبہ ضرور ہوتا ہے۔ پطرس میں یہ جرأت تو کافی تھی کہ وہ تلوار کھینچ کر اپنے آقا و مولیٰ کی طرف سے مدافعت کرے۔ لیکن اس میں یہ جرأت نہ تھی کہ "بڑے لاٹ" کے درباریوں کے تمسخر اور طعن و تشنیع کو برداشت کرتا۔ اس لئے اُس نے حقیقتاً اپنے مولیٰ حتیٰ کہ اُس سے روشناسی کا بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ اُس نے اس کی راہ میں موت قبول کرنے کا اعلان کیا تھا +

یوریپہ ہیپ کی طرح مت بنو کہ جو ہر ایک شخص سے دنیا میں رہنے کے لئے معافی مانگتا پھرتا تھا۔ یاد رکھو کہ بزدلی میں کوئی جاذبیت نہیں۔ اور خوف میں کوئی چیز قابلِ محبت نہیں۔ یہ دونوں حالتیں حسن کے لئے داغ بدہیئت اور سبب تنزل و تفقر ہیں۔ مردانہ جرأت ہی ہمیشہ سبب رفعت و اقبال ہوا کرتی ہے +

برونو کے متعلق جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُسے رُوما میں زندہ جلا دیا جائے تو اُس نے اپنے جج سے مخاطب ہو کر کہا "آپ میری قسمت کا فیصلہ سناتے ہوئے اس سے زیادہ خوفزدہ ہیں۔ جسقدر کہ میں اس فیصلہ کے سننے سے"۔ این آسکو کے ہاتھ پیروں کو مختلف سمتوں کی طرف اتنا پھیلا دیا گیا کہ اُس کے اعضا تمدد کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ باوجود اس کے وہ پیچھے نہیں ہٹی بلکہ اپنے جلاد کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے سکون کے ساتھ اُسے دیکھتی رہی۔ اور اپنے اعتقاد سے پھر جانے سے صاف انکار کر دیا +

سمیہ ایک کنیز مع اپنے غلام خاوند "یاسر" کے ابتدا میں مسلمان ہوئی۔ ان غلام مسلمانوں کے کئی مخالفِ اسلام آقاؤں نے جور و تشدد کئے۔ آخر برچھیاں لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور اُس کے اعضا کو اسی طرح مختلف

طرفوں کو پھیلا دیا اور پردے کے مقام پر ایک ظالم نے برچھا مارا کہ وہ مر گئی۔ لیکن ظالموں کی برچھیاں اُس کے ایمان کی جڑوں کو اُس کے دل سے نہ اکھاڑ سکیں۔

بلالؓ ایک حبشی غلام اور غلام زادہ تھے۔ ان پر بھی یہی مصیبت آئی تھی۔ جابر مالکوں نے صحرائے عرب کی تپتی ہوئی ریت پر بارہا لٹایا۔ اور وہیں مارا پیٹا کہ کلمہ اسلام سے انکار کر دے۔ مگر اسلام کے غلام کی زبان کلمۂ انکار سے ناواقف رہی اس کی اسی جرأت و استقامت نے اسے پیغمبر عرب کے گھر کا مہتمم بنا دیا۔ یہی غلام جب مرا تو دنیائے اسلام کے فاروق اعظم نے بقول مرحوم مولانا شبلی اس کی موت کو اپنے آقا کے اُٹھ جانے سے تعبیر کیا ؎

اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا اُٹھ گیا آج ندیم و حشم پیغمبر

عہد اموی کا جابر اور بدنام ترین گورنر اور جرنیل حجاج مکّہ پر غلبہ پا کر ابوبکر صدیقؓ کے نواسہ زبیر کے بیٹے عبداللہ کو پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔ یہ وہی عبداللہ ہیں جن کو تاریخ نے درجۂ خلافت دیا۔ اور امویوں کے مقابلہ میں خلافت کے لئے احق تسلیم کیا ہے۔ اس کی ماں صدیقِ اکبر کی لختِ جگر، جو سو سال کی پیرزال اور آنکھوں سے معذور ہے۔ حجاج اس کو اپنے دربار میں طلب کرتا ہے۔ وہ جانے سے انکار کرتی ہیں۔ حجاج کا پیغام دوبارہ آتا ہے کہ آؤ، ورنہ آئندہ وہ آدمی بھیجا جائے گا جو سر کے بال پکڑ کر گھسیٹ لائے گا۔ جواب دیتی ہیں، میں نہیں جا سکتی اُن کو بھیجو جو بال گھسیٹ کر لے جائیں۔ حجاج مجبوراً خود آیا۔ اور بولا "کہئے میں نے دشمن خدا (عبداللہ ابن زبیر) کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

اسمائؓ نے کہا تو نے اُس کی دنیا خراب کی۔ اُس نے تیری عقبیٰ بگاڑ دی۔ تو طعن سے اُس کو "ابن ذات النطاقین" کہتا ہے۔ بخدا ذات النطاقین میں ہوں۔ میں نے نطاق کے ایک حصہ سے حضرت رسول اللہ اور ابوبکر کا کھانا شب ہجرت کو باندھا۔ دوسرا اپنی کمر سے لپیٹتی تھی۔ تو سُن رسول اللہ نے کہا تھا کہ ثقیف میں دو کذاب ہوں گے۔ ایک کو دیکھ چکی ہوں۔ دوسرا تو ہے"۔

آپ کے بیٹے آخری جنگ کے لئے جب تیار ہوئے تو نابینا ماں سے ملنے آئے۔ گلے سے لگایا۔ دیکھا جسم پر لوہا منڈھا ہے۔ بولیں بیٹا مرنے سے ڈرتے ہو کہ زرہ پہنی ہے۔ اگر سچے ہو تو موت سے نہ ڈرو۔ اگر اپنے آپ کو حق پر نہیں سمجھتے تو ناحق لوگوں کو کیوں قتل کراتے ہو۔

جب عبداللہ مغلوب ہوئے تو حجاج نے آپ کی لاش کو سولی پر چڑھا دیا۔ کئی دن کے بعد ماں اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے آئیں۔ دیکھا لاش الٹی لٹکی ہے۔ جرأت سے بولیں۔ کیا اس سوار کے گھوڑے سے اُترنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔

"میرا خیال ہے کہ خوف نے تمہیں زیادہ دور جانے سے باز رکھا" ایک رشتہ دار نے کہا۔ جس نے چھوٹے نیلسن کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ جو گھر سے دور فاصلہ پر پڑا پھر رہا تھا "خوف"۔ مستقبل کے امیر البحر نے کہا "میں تو اسے

جانتا بھی نہیں"۔

اورنگ زیب ابھی بچہ ہی تھا۔ شاہجہان کے سامنے ہاتھیوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ ایک مست ہاتھی اورنگ زیب کی طرف بھی بڑھا جو گھوڑے پر سوار میدان میں کھڑا تھا۔ اور لوگ تو ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ مگر اورنگ زیب بھالا تانکر پیچھے ہٹنے کی بجائے ہاتھی سے مقابلہ کے لئے ڈٹ گیا۔ اور ہاتھی سے بھڑ گیا۔ اس کی ایسی ہی جرأتیں تھیں جنہوں نے اس کے لئے ہند کی شہنشاہی کا راستہ تیار کر دیا تھا۔ اور اس کے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا تھا۔ اسی اورنگ زیب نے جنگ برادران کے دوران میں ایک ایسے ہی نازک موقع پر مشیروں کے جواب میں کہا تھا ؎

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ   کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

سچ ہے کسی چیز کا ناممکن سمجھنا ہی اس کا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جرأت فتح ہے اور بزدلی شکست"۔

داؤد (علیہ السّلام) وہ سیدھا سادا اگڈریا لڑکا۔ جو تازہ ہی اپنا گلّہ چھوڑ کر آیا تھا۔ بغیر کسی محافظین کے تنہا بڑھا۔ اور اُس نے اپنے گڈریوں والے اور گوپئے کے ساتھ بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور دراز قامت جالوت کے مقابلہ میں آیا۔ جو زرہ بکتر اور دوسرے سلاح جنگ سے اونچی بنا ہوا تھا۔ اور پھر اسے شکست دی۔ یہ واقعہ جرأت و جسارت کا بلند ترین نمونہ ہے جو دنیا نے کبھی دیکھا۔

عرب کے مٹھی بھر لشکریوں نے جب اسپین پر حملہ کیا تو خشکی پر اُترتے ہی طارق عربوں کے جرنیل نے حکم دیا کشتیوں کو جلا دو۔ لوگوں نے کہا کہ اگر شکست ہوئی تو واپسی کیسے ہوگی۔ طارق نے کہا شکست کے بعد واپسی کے کیا معنی؟ موت ہوگی اور یہیں کیونکہ ؏ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست"۔

ویلنگٹن کا بیان ہے کہ واٹرلو کے مقام پر شدید جنگ کا مرکز ایک فارم ہاؤس تھا۔ جہاں ایک باغیچہ تھا۔ جو گھنی باڑ سے گھرا ہوا تھا۔ یہ مقام برطانوی فوجی حیثیت سے اسقدر اہم تھا کہ فوجیوں کے نام اس امر کے احکام صادر کر دیئے گئے تھے۔ کہ اس مقام کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ خواہ کتنی ہی مصیبت اُٹھانی اور قربانی کرنی پڑے۔ آخر کار گولہ بارود کم ہو گیا۔ اور بارکوں میں آگ لگ گئی حتیٰ کہ باغیچہ کی تمام دیوار شعلہ زار بن گئی۔ اُس وقت ایک ایلچی گولہ بارود کے لئے بھیجا گیا۔ اور فوراً ہی گولی بارود سے پُر دو گاڑیاں فارم ہاؤس کی طرف دوڑا دی گئیں۔ پہلی گاڑی کے گاڑی بان نے انگریز لڑکوں کی مشہور لاابالی جرأت کے ساتھ بھڑکنے اور بدکنے والے گھوڑوں کو مہمیز کی۔ کہ جا تو دا آگ کے انبار میں گھس گئے۔ خطرناک طور پر شعلے اُس کے اردگرد بھڑک رہے تھے۔ چنانچہ اس گاڑی کو آگ لگ گئی۔ اور بڑے زور کے دھماکے کی آواز بلند ہوئی۔ اور گاڑی۔ گھوڑے اور گاڑی بان کے پُرزے ہوا میں اُڑ گئے۔ اس نظارہ سے دوسری گاڑی کا ڈرائیور ایک لمحہ تک اپنے ساتھی کے انجام سے خوفزدہ رہا۔ لیکن پھر یہ دیکھ کر کہ بارود کے اس بھک سے اُڑ جانے میں لحظہ بھر کے لئے شعلے پیچھے کو ہٹ گئے تھے۔ موقع پا کر اُس نے ایک جان توڑ کر کوشش کی۔ اور اپنے گھوڑوں کو دھوئیں کے

باردوں کے اندر داخل کر دیا۔ اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی توپوں کی گھن گرج میں اس نے اپنے مہلک سامان کو اندر لے جا کر ان کے عقب میں شعلوں نے پھر حلقہ بنا لیا۔ اور پہلے سے زیادہ شدت سے بھڑکنے لگے۔

جنگ یمامہ میں (حضرت) سالم کو علم دیا گیا۔ تو ایک شخص نے کہا کہ "ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے۔ اس لئے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔" بولے "تو میں اس حالت میں قرآن کا بدترین حامل ہوں گا۔" چنانچہ علم کو داہنے ہاتھ میں لیا جب وہ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں لیا۔ وہ بھی کٹ گیا تو علم کو سینہ سے چمٹا لیا۔

فریڈلینڈ کی جنگ میں توپ کے گولے فرانسیسی افسروں کے سروں پر سے گذر رہے تھے۔ کہ ایک فرانسیسی افسر کسی قدر ان گولوں کی آمد سے ڈر سا گیا۔ نپولین نے اس کی اس خوفزدگی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "میرے دوست اگر یہ گولے تمہارے لئے مقدر کئے گئے ہیں۔ تو خواہ تم زمین میں ایک سو فیٹ گہرے گڑے ہوئے ہو۔ تو بھی یقیناً تم ان کا نشانہ بنو گے۔"

قرآن حکیم ہے کہ "لوگو! تم کہیں بھی ہو موت تم کو آ کر رہے گی۔ اگرچہ پکے پکے گنبدوں ہی میں کیوں نہ ہو۔"

جس وقت پیٹرزبرگ کے محاذ میں سرنگ تیار ہو گئی اور مہتابی تیار کر لی گئی۔ اور متحدہ افواج کی صفیں مرتب ہو گئیں کہ جونہی بارود کے بھک سے اڑ جانے سے راستہ بنے۔ فوراً دشمن پر حملہ کر دیا جائے لیکن دقیقے لمحات اور دسیوں لمحات سرنگ میں سے بغیر کسی قسم کے آواز کے دھماکے کے گذر گئے۔ حتیٰ کہ یہ توقف شاق گذرنے لگا تو لفٹنٹ ڈاٹی اور سرجنٹ ریس نے مہتابی کا معائنہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو بطور رضا کار پیش کیا۔ وہ لوگ طویل زیرزمین راستے میں سے خاموشی کے ساتھ بسرعت بڑھتے گئے۔ اس کے سوا انہیں کچھ علم نہ تھا کہ وہ دہشتناک موت کی طرف جا رہے ہیں۔ آخر انہوں نے آگ نہ لگنے کا سبب اور نقص معلوم کر ہی لیا۔ اور رسنے سرے سے تار کے توڑے کو آگ دکھا دی۔ کہ اس کے متابعد ایک خوفناک دھماکے نے زمین کو زیر و زبر کر دیا اور فتح کی طرف قدم بڑھانے کا گویا علم بلند کر دیا۔

جنگ کوپن ہیگن کے موقع پر۔ جس وقت نیلسن آغشتہ بخون اور مردوں سے پٹے ہوئے تختہ جہاز پر پھر رہا تھا۔ تو اس وقت اس نے کہا "یہ بہت گرما گرم کام ہے۔ ممکن ہے آج کا دن ہم میں سے کسی ایک کے لئے اسی لحظہ آخری دن ثابت ہو۔ لیکن میری یہ بات یاد رکھو کہ میں تو آج کے بعد کسی اور جگہ ہوں گا نہیں۔"

ٹرافالگر کی جنگ میں جب نیلسن کے گولی لگی اور وہ نیچے لیجایا گیا۔ تو اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ تاکہ وہ لوگ جو جدال و قتال میں مصروف ہیں۔ یہ نہ جان لیں کہ ان کا افسر مجروح ہو چکا ہے۔

سیلیمانکا کی جھڑپ میں جب سر ولیم نیپیر کی فوج پر دشمن کی توپیں گولہ باری کر رہی تھیں۔ تو اس کی ماتحت فوج بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ افسر موصوف نے دفعتہً فوج کو رک جانے کا حکم دیا۔ اور باغیوں کے چار سرکردہ لیڈروں کو [illegible]

[illegible]



اپنی مجاہدانہ عزائم کو فوراً اجاگر دو۔ خیالات محض اوہام اور خواب ہیں۔ جب تک کہ ان کے اثرات کو آزمایا نہ جائے۔ کیا تقابل میں تم کو دکھ ہوتا ہے؟ کام کرتے چلو۔ کیونکہ وہ جو تمہارا مدمقابل ہے بجز آدمی کے اور کچھ نہیں؛ دنیا میں اپنے لئے جگہ آپ فتح کرو۔ کیونکہ تمام اشیا ایک شجاع روح ہی کی خادم ہوجایا کرتی ہیں۔ مشکلات کا مردانہ مقابلہ کرو۔ بدقسمتی کا نقصان شجاعت سے اٹھاؤ۔ افلاس و تنگدستی کو شرافت سے برداشت کرو۔ ناامیدی کو بجرأت گوارا کرو۔ بہادر انسان کا اثر دور رس ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر ایک انسان میں شریفانہ جذبہ اس کی رگ رگ میں متعدی طور پر پیدا کردیتا ہے۔ ہر دن جو چڑھتا ہے وہ گمنام لوگوں کو قبر میں اُتار رہا ہے۔ وہ جو محض گمنامی میں رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بزدلی نے ان کو پہلی کوشش سے باز رکھا۔ اور وہ جو ابتدا کردیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی فائدہ مندی اور شہرت کے امکانات خواہ کتنے ہی گئے گذرے ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا قول ہے کہ کوئی بڑا کارنامہ متلون المزاج دو دلوں سے ظہور میں نہیں۔ جو ہر بات پر دوسرے کی ذمہ داری طلب کیا کرتے ہیں "۔ داخلی مناقشات جب ختم ہوچکے اور جب تھامس مور نے ٹھان لیا کہ وہ اپنے اصول پر قائم رہیگا تو اُس نے بشاشت قلب کے ساتھ جلاد کے تبر کے نیچے سر رکھدیا۔ اس کو بیوقوف بنایا کہ وہ کیوں تاریک۔ نمناک اور غلیظ محبس میں پڑا سڑ رہا ہے۔ جبکہ وہ بھی دوسرے اساقفہ کی طرح محض اپنے عقاید سے برأت کا اظہار کرکے آزادی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن تھامس مور نے موت کو بے عزتی پر ترجیح دی +

اس وقت اُس کی بیٹی نے دکھادیا کہ کس طرح محبت کی قوت خوف کو دل سے نکال دیتی ہے۔ وہ لڑکی اپنے باپ کی محبت میں ثابت قدم رہی۔ جبکہ دوسرے تمام لوگ حتی کہ اُس کی ماں نے بھی اپنی بیٹی باپ اپنے شوہر کو فراموش کردیا تھا۔ آخر کار جب تھامس مور کا سر کاٹا گیا اور ایک بانس پہ لٹکا کر اُس کی تشہیر کی جاچکی۔ تو اس کی لڑکی نے افسروں سے التجا کرکے باپ کا سر لے لیا اور وصیت کی کہ وہ سر اس کے ساتھ قبر میں دفن کیا جائے۔ اس کی درخواست قبول کرلی گئی۔ کیونکہ اس کی موت بھی اس حادثہ کے تھوڑا عرصہ بعد ہی واقع ہوگئی تھی +

جس وقت سر والٹر ریلے جلاد کی ٹکٹکی پر آیا تو بہت کمزور تھا۔ اُس نے تماشائیوں کے انبوہ عام کو مخاطب کرکے تقریر کی۔ کہا کہ قید کے آخری دو دنوں میں اسے لرزے کے دو دَورے پڑچکے ہیں۔ " اس لئے اگر تم مجھ میں کسی قسم کی کوئی کمزوری مشاہدہ کررہے ہو تو میں تم سے خواہش کرتا ہوں کہ تم اسے بجائے میری کمزوری یا بزدلی کے میری بیماری کی طرف منسوب کرو "۔ اس کے بعد اُس نے تبر اٹھایا اُسے بوسہ دیا۔ اور حاکم متعہد سے کہا " اگرچہ یہ (تبر) تند و تلخ دوا ہے مگر تمام بیماریوں کا شافی علاج ہے "۔

اپنا وقت ان رکاوٹوں کے خواب دیکھنے میں مت ضائع کرو۔ جن سے شاید تمہاری کبھی مڈبھیڑ نہ ہوگی۔ یا ان پلوں کے عبور کرنے کے خیالات میں محو نہ ہو جن تک تم نہیں پہنچے۔ دو دلاپن اور ہمیشہ تراذ دمیں لٹکتے رہنا جاہ پہ انسانی گرفت کو ڈھیلا کردیتا ہے +

ابراہیم لنکن کا عہد طفولیت۔ کم تعلیم اور بااثر دوستوں کے فقدان کے باوجود افلاس کے ساتھ ایک طویل سلسلۂ جدوجہد تھا۔ آخر کار جب اُس نے قانونی پریکٹس شروع کی۔ تو اس کے لئے سیاست کے کمزور ترین پہلو پر اپنی قسمت کی بازی لگانے کے لئے کچھ کم جرأت و جسارت کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اس وقت اُس نے اپنی تھوڑی بہت شہرت جو اُسے حاصل تھی۔ جوکھوں میں ڈالدی۔ اس وقت اُس کی رفیع المنزلت اخلاقی جرأت ہی تھی جس نے اسے بحیثیت صدر جمہوریہ امریکہ معاندانہ نکتہ چینی اور طویل سلسلۂ ابتلا کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھا۔ اور اس نے غلاموں کی آزادی کا فرمان۔ گرانٹ اور شاٹن کی حمایت میں سیاست دانوں اور پریس کے شور و غوغا کے باوجود شائع ہی کر دیا ✦

ان تمام حالات میں لنکن ایک ایسے امر غیر مرغوب کی حمایت کرتا ہؤا ہرگز متزلزل نہیں ہؤا۔ جسے وہ اپنے اعتقاد میں حق سمجھتا تھا۔ اُس وقت جبکہ ایک نوجوان قانون داں نے اپنی "روٹی" کو کھو کر مفرور غلاموں کی حمایت کرتا تھا۔ اور اس وقت جبکہ دوسرے قانون دان اس کام سے انکار کر دیتے تھے۔ لنکن ہی تھا کہ جب موقع پڑتا تھا تو ہمیشہ بدقسمت غلام کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ جبکہ فلاکت زدہ غلام مفرور پناہ کے لئے مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ تو لوگ ان کو بھی کہدیا کرتے تھے۔ کہ "لنکن کے پاس جاؤ۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا ہے اُس کی حمایت کرتا ہؤا نہیں ڈرتا"!

جس وقت ہم "ظاہر بر باد" صداقت کی طرفداری کرتے ہیں۔ اسی کو شرافت کہتے ہیں۔ صداقت کو ایسے ہی وقت میں شہرت و ترقی پر لانا مناسب اور معقول طریق کار ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی انسان حالتِ زبون میں صداقت کا ساتھ دیتا ہے۔ اور بزدل ڈر کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنی پست فطرتی پر شک و شبہ کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا مولیٰ سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے ✦

وینڈل فلپس نے گندے انڈوں۔ کٹی چھنی باتوں اور عوام کی تالیوں کی کیا پروا کی" آخر کار طعنہ زنوں نے اپنے کئے کا پھل پایا"۔ کیا بیچر اور گف کو سے۔ پھرے انگریز عوام نے خاموش کر دیا۔ جو ان دونوں کی زبان بندی کے لئے آئے تھے؟ نہیں وہ اپنی جگہ جمے رہے اور اُنہوں نے نہ سُننے کے خواہشمند ہزاروں کو سُننے اور توجہ کرنے پر مجبور کر دیا ✦

کیا اینا ڈکنن نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ جس وقت مالی گیورس کے پستول کی گولیاں اُس کے سر پر اُڑ رہی تھیں؟ نہیں۔ بلکہ اس عورت ہی نے اپنی جرأت اور دلیل و برہان سے ان پستولوں کے مُنہ کیل دیئے ✦

دنیا ایک کوئنکس کی جستجو میں ہے۔ جو اس حال میں دعوۂ الحق کرتا رہے۔ کہ بھری ہوئی بندوق کی نالی کا منہ اُسکے سر پر ہو۔ ایک گیریزن کی تلاش میں ہے۔ جسے نہ قید و بند کا خوف ہے۔ نہ عوام الناس کی سُولی کا ڈر جو اس کے دروازے پر کھڑی کی گئی ہو جس وقت جنرل بڈ نو ہزار فوجیوں کے ساتھ فسادات نیویارک کے سدباب کیلئے بھیجا گیا تھا۔ تو وہ اپنے ماتحتوں سے پہلے منزل پر پہنچ گیا۔ تو اُس نے وہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں کو

غصہ سے بے تاب عوام سے پُرپایا جنھوں نے غصہ میں آکر اتنک بہت سے لوگوں کو بازاروں کے لیمپوں کے کھمبوں ہی پر سولی چڑھا دیا تھا۔ ہٹلر اپنے ہمراہیوں کا انتظار کئے بغیر اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں مجمع بہت گھنا تھا اُس نے جاتے ہی قریب پڑے ہوئے راکھ کے ایک پیپے کو اوندھا لیا اور خود اُس پر چڑھ گیا اور یوں بولنے لگا۔

"پانچ نقاط ملک کے نمائندو! تم دوزخ کے کندے ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے افسروں کو قتل کر ڈالا"

بس اتنی سی تقریر کا اثر یہ ہوُا کہ خون کے پیاسے عوام الناس نے تنہا ایک شخص کے جسورانہ الفاظ کے سامنے ہمّت ہار دی اور وہ بھی ایک ایسے شہر میں جس کو شہر کا ذمہ دار افسر فرمانڈ وہ پولیس اور فوج کی کمک کے ساتھ بھی نہیں دبا سکا تھا ۔

"ہمارے دشمن ہمارے سامنے ہیں" تھرموپلیا کے مقام پہ اہل سپارٹا نے کہا۔ اس کا ٹھنڈا جواب لیونی ڈاس کی طرف سے یہ تھا "اور ہم اُن کے سامنے ہیں"

الیگزینڈر کی طرف پیغام آیا "اپنے ہتھیار ہمیں دیدو" لیونیڈاس نے اس کا جواب بھجوا دیا کہ "آؤ اور لیلو"

ایک (قدیم) ایرانی سپاہی نے کہا "تم ہمارے اُڑنے ہوئے تیروں اور چلتی ہوئی برچھیوں میں سورج کی کرن نہیں دیکھ سکو گے" لیسی ڈی مونین نے جواب دیا "تو پھر ہم اُن کے سائے میں جنگ کرینگے ۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں

پس اس میں کونسی حیرت کی بات ہے کہ اس دل گردے کے مٹھی بھر انسانوں نے عظیم ترین لشکر کے اقدام کو جو کبھی زمین پر چلا ہو روک دیا تھا ۔

جس وقت نپولین نے ایک مشہور نقشہ کے متعلق ہدایات دیں تو اس کے ایک سٹاف افیسر نے کہا "یہ تو ناممکن ہے" یہ سنکر قائد اعظم نے کڑک کر کہا "ناممکن! ہلّہ" "ناممکن تو احمقوں کی لغت کا لفظ ہے" جری آدمی ندرت کی تمثال ہے اس کا اثر مقناطیسی ہوتا ہے ۔ لوگ ایسے ہی انسانوں کی پیروی موت کی گود میں جانے تک کیا کرتے ہیں ۔

اکثر جری انسانوں ہی نے قبل اس کے کہ وہ عروج کو پہنچیں دنیا کو متزلزل کر دیا ہے ۔ یہ جرأت کی بات ہے کہ کسی کام کی ابتدا کرنا اور اُسے حصول کامیابی تک جاری رکھنا۔ نوجوانوں کو اُن کے مقصد تک پہنچا دیتا ہے ۔

سکندر اعظم چوبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوُا تھا۔ اُس نے تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں مرنے سے قبل معلوم دنیا کا کثیر حصہ فتح کیا تھا ۔

جولیس سیزر نے آٹھ سو شہروں کو تسخیر تین سو قوموں کو فتح کیا۔ تین لاکھ افواج کو شکست دی بڑا خطیب اور بہت بڑا مدبّر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ ابھی نوجوان ہی تھا ۔

شیکسپیر کہتا ہے "وہ شخص شہد پانے کا اہل نہیں ہے جو محال ہیں اس لئے پرے پرے رہے کہ مکھیوں کے ڈنک ہوتے ہیں"

"شجاع وہ شخص نہیں ہوتا جو خوف کا احساس نہ کرے۔ کیونکہ یہ حماقت اور ناسمجھی ہے۔ بلکہ شجاع وہی ہے جس کی

عجیب روح خوف پر غلبہ پاتی ہے اور وہ بہادری سے اس خطرہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ جس سے طبیعت بھی لرزجایا کرتی ہے۔ بہت سے روشن ودرخشاں نوجوانوں نے اپنی ذات یا دنیا کے لئے کوئی قابل قدر اور لائق ذکر کام انجام نہیں دیا۔ محض اس لئے کہ انہوں نے کسی کام کا آغاز ہی نہیں کیا +

اس لئے

کام شروع کرو۔ کام کی بسم اللہ کرو۔ کام کی ابتدا کرو +

لوگ تمہارے متعلق خواہ کچھ ہی خیال کریں۔ تم وہی کام کرو۔ جو تمہارے عقیدے میں درست ہو۔ تمہارے لئے ملامت وستائش کو برابر ہونا چاہئے " (پی تھاگوراز)

مجھ میں ہر ایک کام کرنے کی جرأت ہے جو ایک انسان کے شایانِ شان ہے۔ اور اس میں میرے سوا مجھ سے بڑھنے والا اور کوئی نہیں ہے "+ (شیکسپیئر)

کیونکہ انسان کے اعاظم اعمال اُس کی معمولی معمولی جدوجہدوں ہی میں بنائے جاتے ہیں۔ بہت سے دُھن کے پکے شجاع ایسے ہوتے ہیں جو احتیاج اور کمینگی کے باوجود برباد کن حملوں کے زیرسایہ انچ انچ پر اپنی دفاع آپ کررہے ہیں۔ بہت سی شریفانہ اور پُراسرار فتوحات ایسی ہیں جن کو آنکھ نہیں دیکھتی جن کا بدلہ اور انعام شہرت نہیں۔ اور نہ جن کے لئے نرشی سلام ہی ملتے ہیں۔ حیات۔ بدقسمتی۔ تنہائی۔ کس مپرسی اور افلاس میدان جنگ ہیں۔ اور ان میں ان کے ابطال موجود ہیں + (وکٹر ہوگو)

تم اپنی ذات اور دوسرے انسانوں کو آزادی دلاؤ اور پاک وصاف کرو + (ا۔سموئیل چار ۹۰)

مہر محمد خاں شہاب

"خون کی چاہت"

(از جناب سید وقار عظیم صاحب بی۔ اے)

(۱)

یوں تو خون کی چاہت ہر ایک کو ہوتی ہے۔ بھائی کو بھائی سے بہن کو بہن سے۔ ماں کو اپنے بیٹے سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہونا ضروری ہے۔ مگر موہن اور پاربتی کی محبت گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ ہر شخص انہیں دیکھ کر یہی کہتا کہ بہن بھائی میں پریم ہو تو ایسا ہو۔ دونوں میں کوئی برس دن کی چھوٹائی بڑائی ہوگی۔ پاربتی موہن کی پیٹھ پر کی تھی اور یہی بات اور زیادہ تعجب کی تھی کہ ان دونوں میں بچپن میں بھی کبھی کسی بات پر لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں ایک ہی ساتھ سوتے۔ کھانا بھی ایک ہی ساتھ کھاتے۔ جب ذرا بڑے ہوتے۔ گھر کی گائے بکریاں بھی دونوں ساتھ ہی چرانے لے جاتے۔ اور جنگل میں جا کر کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر محبت کی باتیں کرتے۔ گاؤں والوں کو بُرا بھی لگتا۔ کہ جب ہیرالال کے گھر میں لڑکا ہے تو لڑکی گائے چرانے کیوں جائے۔ مگر ہیرالال تو ان دونوں کی حالت جانتا تھا۔ اُس کے لئے مشکل تھا کہ ان دونوں کے ملے ہوئے دلوں کو کسی طرح بھی چھڑا سکتا گاؤں کی لڑکیاں پاربتی سے اس بات پر کئی مرتبہ خفا بھی ہوئیں کہ وہ اکیلی کنوئیں پر پانی بھرنے کبھی نہیں جاتی تھی۔ اور اُس کی سکھیوں کی آزادی میں فرق آتا تھا۔ پاربتی کی ماں جب کبھی اُس سے پانی لانے کو کہتی۔ تو موہن بھی ضرور اُس کے ساتھ جاتا۔ دونوں مل کر پانی کھینچتے۔ اور ایک چھوٹی سی ٹھلیا پاربتی لاتی۔ اور دو پیتل کے کلسے موہن۔ اسیطرح زندگی کے دن گذرتے چلے گئے۔ پاربتی اور موہن نے ابتک کوئی غم کا زمانہ نہیں دیکھا تھا۔ اُن دونوں کی سب سے بڑی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا تھا۔ اور یہ اُنہیں حاصل تھی +

(۲)

پاربتی اور موہن اب جوان تھے۔ ہیرالال امیر تھا۔ گھی دودھ گھر میں کھانے کو تھا۔ اپنے اپنے کام کے سوا بہن بھائیوں کو کوئی فکر نہ تھی۔ دونوں پر جوانی عجب بہار لائی۔ موہن ۱۴ برس کی عمر میں ایک اچھا خاصا سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ ہیرالال گاؤں کے زمیندار کے پاس کئی بار گیا اور اُس سے کہا کہ مہاراج! آپ ہر مہینے بڑے صاحب کے پاس جاتے ہیں۔ اُن سے کہہ کے موہن کو پلٹن میں بھرتی کرا دیں تو بڑی کرپا ہوگی۔ زمیندار صاحب ہیرالال کی بات کو ہمیشہ ٹال دیتے۔ ایک دن وہ اپنے کسی گاؤں سے آرہے تھے

گھوڑے پر سوار تھے۔ ساون کا مہینہ تھا۔ ابھی پھوار پڑ چکی تھی۔ آسمان پر دھنک عجب رنگ سے چمک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ زمیندار صاحب بڑے دھیرے دھیرے چلے آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ دو آدمی ذرا پیچھے رہ گئے تھے۔ جب اُن کا گھوڑا آم کے باغ کے سامنے پہنچا تو کسی نے اُن کی کمر میں رسی کا پھندا ڈال کر گھوڑے پر سے گھسیٹ لیا۔ پیچھے سے ایک آدمی اور آ گیا۔ اور زمیندار سے کہنے لگا کہ مہاراج! کل تمہارے آدمیوں نے ہمیں غریب جا کر بہت مارا تھا۔ اب جو بتاؤ کریں۔ ہم تو کسان آدمی ہیں۔ تمہاری رعایا نہ رہے تو کہیں اور جا بسیں گے۔ نہ برتن نہ بھاڑے جہاں چاہیں گھر بنا لیں۔ مگر آج تم سے اچھی طرح بدلا لیکر کہیں بھاگ جائیں گے۔ زمیندار صاحب بیچارے بڑے حیران تھے۔ کہ کیا کریں۔ کہ باغ کے بیچ میں سے ایک نوجوان لڑکا آگے نکلا اور ایک آدمی کی کمر پر اس زور سے لاٹھی ماری۔ کہ وہ کمر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا۔ زمیندار صاحب کی جان بچی اُنہوں نے موہن کو بڑے پریم کی نظروں سے دیکھا۔ اور کہا کہ موہن تم واقعی سپاہی ہو۔ اُس دن سے موہن زمیندار صاحب کے سپاہیوں میں داخل ہو گیا۔ وہ جہاں کہیں جاتے موہن اُن کے ساتھ جاتا۔ اس نوکری سے نہ موہن خوش تھا نہ پاربتی۔ دونوں اب دن رات ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ جب موہن زمیندار صاحب کے یہاں جاتا تو پاربتی اُسے بصد یاد کرتی۔ موہن بھی پاربتی کی جدائی بے حد محسوس کرتا۔ وہ دن میں کسی نہ کسی وقت موقعہ نکال کر گھر ضرور آتا۔ دونوں بہن بھائی خوب میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور کچھ عرصہ کے لئے پھر جدا ہو جاتے ✦

(۳)

جیٹھ کا مہینہ تھا اور پورن ماشی کا دن۔ آج پاربتی نے موہن کے لئے کھیر پکائی تھی۔ اُس نے اُس کا بچھونا نہایت صفائی سے بچھایا تھا۔ کہ اُس کا بھائی اُس پر آ کر سوئے گا۔ گھر بھر نے خوب جی بھر کے کھیر کھائی۔ سوائے پربتی کے۔ اُن ایک پڑوسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ وہاں چلی گئی۔ باپ اپنے دروازے کے آگے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ بہت سے گاؤں والے آ گئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کسی نے کہا کہ اب کے بڑے خوب آم ہیں۔ زمیندار صاحب کے بگیچہ میں سب پیڑ لدے کھڑے ہیں۔ اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بوڑھے پنچم نے ہیرا لال سے کہا۔ "بھیا ہیرا لال اب پاربتی سیانی ہو گئی ہے اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیئے"۔ ہیرا لال خود ہر وقت اسی دھیان میں رہتا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے سے یہ بات سُنکر اور بھی خیال پیدا ہو گیا۔ ہر شخص یہ تجویز سنکر بے حد خوش ہوا۔ لیکن بھولی بھالی اور حسین پاربتی پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ دنیا کے لئے شادی خوشی کا سامان ہے۔ ہر شخص اُس کے خیال سے خوش ہوتا ہے۔ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق نہ جانے کیا کیا خیال دل میں دوڑنے لگتے ہیں۔ لیکن حسین پاربتی کے دل میں اس وقت اپنے پیارے بھائی کی جدائی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ وہ شادی کو زندگی کا ایک دور سمجھتی تھی جس سے ابتک ہمیشہ قائم رہنے والی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ قائم رہنے والی خوشی اسے اپنے باپ کے جھونپڑے میں اپنے چہیتے بھائی کے چکنا اور سانولے چہرے کو دیکھ کر حاصل ہو جاتی

تھی۔ کہ جس طرح وہ دونوں بچپن میں ایک ساتھ رہے۔ جوانی اور بڑھاپے میں بھی اسی طرح رہیں۔ گاؤں والوں کی گفتگو سے اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کوئی زبردستی اس کے بھائی سے ہمیشہ کے لئے چھٹا رہا ہے۔ وہ اس خیال کو اپنے پاس بھی نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ گھبرا کے گھر سے باہر نکل آئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ موہن نے آج دس بجے سے پہلے گھر آنے کو کہا تھا۔ وہ بیتابی سے اُس سڑک کی طرف دیکھنے لگی جدھر سے روز موہن آیا کرتا تھا۔ چاندنی میں رات میں آج سے پہلے پاربتی کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گھور گھور کے سڑک کی طرف دیکھتی رہی۔ موہن اب تک نہیں آیا تھا۔ وہ اُس جامن کے پیڑ کے نیچے پہنچی جہاں وہ اور موہن کبھی ایک ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ پیڑ کے تنے پر اپنے نازک گال کو رکھ کر ٹکٹکی باندھ کر پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی نیلی گاڑھے کی ساڑھی کا پلو اُس کے سر پر سے سرک گیا۔ مگر پاربتی اس سے بے خبر تھی۔ شباب کا نشہ اور بھائی کی محبت دو بہت بڑے نشے تھے۔ چاند کی کرنیں چھن چھن کر اُس کے ایک رخسار پر پڑ رہی تھیں۔ چاند کے داغ اس وقت اتنے بھلے نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے پاربتی کے گالوں پر پتوں میں سے چھنی ہوئی روشنی کے دھبّے۔ اُس کا چہرہ کہیں روشن تھا اور کہیں تاریک۔ مگر چمک دمک ہر حصّہ پر برابر تھی۔ لیکن پاربتی ان سب باتوں سے بے خبر تھی۔ وہ آدھی رات تک اُسی جگہ کھڑی رہی۔ اُس کے دل کی دھڑکن اور بڑھی۔ مگر نگاہ برابر سڑک کی طرف تھی۔ پیڑ کے پاس سے ہٹی۔ کانوں میں گیدڑوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ دل ڈر سے کانپ گیا۔ موہن کی جدائی اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔ دل بے چین ہو گیا۔ اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل کر نرم نرم گالوں پر ڈھلکنے لگے۔ ڈھلتے ہوئے چاند کی روشنی نے اُن میں ایک خاص حسن پیدا کر دیا۔ پاربتی بھاگتی ہوئی گھر کے دروازے تک آئی۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ گھر کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اور سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ چھپتے ہوئے چاند کو دیکھ کر دل اور زیادہ بے چین ہونا شروع ہوا۔ نظر آسمان سے اُتر کر آہستہ آہستہ نیچے آنی شروع ہوئی۔ پہلے گاؤں کے باہر والے تاڑ کے پیڑوں پر پڑی۔ اُس کے بعد مہادیوجی کے مندر کے چمکدار کلس پر۔ سورج نکلتے وقت بارہا پاربتی نے اُس کلس کو ایک پجاری کی اعتقاد بھری نظروں سے دیکھا تھا آج پہلی بار اُس نے چاند کی روشنی میں دیکھا۔ دل اعتقاد سے بھر گیا۔ آنکھیں دور ہی سے آنسوؤں کے موتی مہادیوجی کی مورت پر چڑھانے لگیں۔ دل اُس طرف کو کھنچا اور رفتہ رفتہ آنسو غائب ہو گئے۔ چہرہ اُس وقت بھیگے ہوئے پھول کی طرح ہو گیا۔ گرمیٔ حسن سے تھوڑی دیر میں وہ نمی بالکل غائب ہو گئی۔ پاربتی کا چہرہ اور زیادہ چمکنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے چاند نے پھر ایک مرتبہ تڑپ کر اُس کی سادگیٔ حسن کو دیکھا اور آہستہ آہستہ آم کے پیڑوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ نور کا تڑکا ہوا۔ گاؤں میں ہر طرف آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ پاربتی کو کئی دو سیر جَو پیسنے تھے۔ سڑک کی طرف آخری نگاہ کرتی ہوئی چکی پر جا کر بیٹھ گئی۔ گا گا کر چکی پیسنے لگی۔ آج گانا اس نے نہایت آہستہ آہستہ گایا۔ مگر اس میں درد اور اثر روز سے کہیں زیادہ تھا۔ آٹا پیس کر کھڑی ہوئی تھی۔ کہ سامنے

سے موہن آتا ہؤا دکھائی دیا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ آنکھوں نے آنسوؤں سے استقبال کیا لیکن یہ آنسو خوشی کے تھے۔ موہن نے آکر منہ ہاتھ دھویا۔ پاربتی نے باسی کھیر سامنے لاکر رکھدی۔ اور ساری کے پلو سے مکھیاں اڑانے لگی۔ موہن نے باسی کھیر جس مزے سے کھائی اُسے وہی جانتا تھا۔ محبت کے ہاتھوں سے پرسی ہوئی کھیر امرت سے زیادہ تھی۔ رات بھر زمیندار صاحب کے ہاں رہنے کی وجہ سے آج اُس کی دن بھر کی چھٹی تھی۔ یہ دن پاربتی کے لئے اُسیقدر خوشی کا تھا جسقدر گذری ہوئی رات غم کی ٭

(۴)

پورے دو مہینے گذر گئے۔ پاربتی اور موہن کی محبت دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی۔ بھادوں کا مہینہ ہے آسمان پر کبھی بادل آتے ہیں اور برس کر چلے جاتے ہیں۔ کبھی بجلی چمکتی ہے اور تیزی کے ساتھ ادھر سے اُدھر نکل جاتی ہے کبھی دُھلے ہوئے آسمان پر دَھنک اسقدر خوشنما معلوم ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت اُسے دیکھا کرے ٭

یہی حالت آج کل پاربتی اور موہن کے دلوں کی ہے۔ کبھی مسرور کبھی غمگین۔ جدائی کا غم ہلکے ہلکے بادلوں کی طرح اُن کے دلوں پر آتا ہے۔ اور تھوڑے سے آنسو اُس غم کو بہالے جاتے ہیں۔ اُن کے دل کبھی اسقدر مسرور ہوتے ہیں جیسے بجلی کی چمک کسی تاریک وادی کو منور بنادے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تو اُن کے چہروں کی حالت بالکل دھنک کی سی ہوتی۔ خوشی کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا کبھی رخساروں پر خوشی کی سرخی جھلکتی۔ کبھی محبت کے جذبات آنکھوں کو موتی چور بنادیتے۔ کبھی دلوں میں خوشی کی لہریں اُٹھتیں اور دونوں بھائی بہن دیر تک اُن لہروں میں غرق ہوکر رہ جاتے۔ شام کا وقت ہے ابھی بارش ہوچکی ہے دونوں بھائی بہن گاؤں کے کنارے والی ندی کے کنارے بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔ پاربتی نے پانی کے اندر پاؤں لٹکا رکھے ہیں۔ اپنے پاؤں کے پنجوں سے پانی کو ہلاتی ہے۔ . . . دھنک آسمان پر سے قریب قریب غائب ہوتی جارہی ہے۔ اُس میں صرف سُرخ رنگ نمایاں ہے۔ اُس کا عکس پانی پر پڑرہا ہے۔ لیکن وہ رنگ ماند نظر آنے لگتا ہے۔ جب موہن اور پاربتی کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہروں کی سُرخی پانی پر پڑنے لگتی ہے۔ دونوں بھائی بہن کبھی اتنے زیادہ خوش نہیں نظر آئے تھے۔ یکایک پاربتی کے کندن جیسے چہرے کی سُرخی کم ہونی شروع ہوئی۔ موہن نے اُس تبدیلی کو محسوس کیا۔ چونک کر بولا "پاربتی کیا ہؤا۔ کس چنتا میں ہو"— پاربتی کا جواب خاموشی تھا—

موہن نے پھر پوچھا۔ "پاربتی بولو کیا ہؤا؟"

پاربتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ . . بولی "کچھ نہیں بھیا یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا ہم دونوں سدا اسیطرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں؟"

موہن۔ "پاربتی اس میں چنتا کی کونسی بات ہے۔ جب ہمارے تمہارے دل بالکل ملے ہوئے ہیں۔

تو ہمیں کون الگ کر سکتا ہے"۔

پاربتی نے آنسو پونچھے اور بولی کہ "بھیا یہ سب کچھ سہی مگر میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا ہمیں ساتھ نہیں رہنے دیگی"+

پاربتی اور موہن ابھی یہی باتیں کر رہے تھے۔ کہ سفید بگلوں کا ایک جوڑا آ کر ندی کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں پاس پاس بیٹھے رہے۔ اور پھر اُن میں سے ایک پورب اور دوسرا پچھم کی طرف اُڑتا چلا گیا +

(۵)

موہن اور پاربتی کے باپ کو ایک کام کے لئے پانچسو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ روپے کا انتظام کہاں سے کرے۔ موہن کو شادی کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پاس ہی ایک امیر امیر نے پانچسو روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔ موہن کو اپنا عہد توڑنا پڑا۔ پاربتی سے پہلے اُسے شکست ہوئی۔ مگر موہن اور پاربتی دونوں اس وقت مجبور تھے۔ باپ کا رنج نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ پاربتی جانتی تھی۔ کہ اب آپ کی زندگی ایک مستقل غم بن جائے گی۔ موہن نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پاربتی سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کریگا۔ گھر میں دلہن کے آتے ہی پاربتی نے اُس سے بھی ایسی ہی محبت کی جتنی موہن سے کرتی تھی۔ دو مہینے تک تو موہن اور پاربتی پہلے کی طرح رہتے رہے۔ لیکن موہن کی بیوی کو بہن بھائی کی محبت کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اگر موہن پاربتی سے محبت کرنی کم کردے تو وہ اُس سے زیادہ محبت کرنے لگیگا۔ اُس نے ہر قدم پر کانٹے بچھانے شروع کئے۔ پاربتی نے بھی یہ محسوس کیا۔ اُسے اس بات کا بیحد رنج رہنے لگا۔ وہ اور زیادہ کوشش کرنے لگی کہ اپنی بھاوج کو زیادہ خوش رکھے۔ مگر اس کا اثر اُلٹا پڑتا۔ شروع شروع میں موہن کے برتاؤ میں کچھ فرق نہیں آیا۔ لیکن کہاں تک موہن بھی اپنی بیوی کی باتوں سے اثر لینے لگا۔ پاربتی کی محبت دل سے کم ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نتیجہ ہوا کہ موہن نے اپنے گاؤں سے کوئی پندرہ کوس کے فاصلہ پر ایک دس بیگہ زمین لے لی اور ایک دن رات کو بلا کسی سے کہے ہوئے گھر چھوڑ کر چل دیا +

(۶)

پاربتی کا کنول جیسا چہرہ کمھلانے لگا۔ اُسے ہر وقت ایک بے چینی سی رہنے لگی۔ بھائی کا غم ایسا نہیں تھا۔ کہ وہ اُسے آسانی سے بھول جاتی۔ ہولی۔ دیوالی اور بسنت کی خوشیاں اُس کے لئے موہن سے الگ رہ کر ایک سوگ بن گئیں۔ تمام گاؤں کو پاربتی کی حالت پر بے حد رنج ہوتا۔ پاربتی بالکل دیوانی سی ہو گئی۔ وہ کبھی اُس جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوتی جہاں کھڑے ہو کر اُس نے موہن کا انتظار کیا تھا۔ اور جی کھول کر روتی۔ کبھی ندی کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتی۔ اُسے بگلے کا وہ جوڑا ابتک یاد تھا +

وہ روز صبح کو زمیندار صاحب کے باغ میں سے پھول توڑ کر مہادیو جی کے مندر میں جاتی۔ پہلے وہاں جا کر

اور نہایت دلکش ہے۔ منتخب تصویروں میں سے کرشن کی تصویر جہاں رادھا سر پہ پانی کی ٹھلیا اٹھائے ہوئے ہے اور کرشن اسے تنگ کر رہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سوہنی اور مہینوال کی تصویر نہایت ہی خوب ہے کرشن اور رادھا کی تصویر میں عیاں مسرّت ٹپک رہی ہے۔ اور مصوّر نے اسے بہجت افزا خیال کو پوری طرح نبھایا ہے۔ کرشن کی شبیہ نہایت حسین اور پاکیزہ ہے۔ دونوں کی حرکت اسقدر دلآویز ہے۔ گویا حسن و عشق کی لازوال طاقت مصروف رقص ہے۔ اس تصویر سے محبّت کا لافانی نغمہ پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا ہے۔ اور الہ بخش نے اس تصویر میں اپنی عقیدت اور ارادت کا بھی اظہار کیا ہے +

صرف رادھا اور کرشن کی جاوداں روایت نے ہی اس کے لطیف جذبات پر اپنا گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کے اپنے صوبے کے حسن و محبّت کے افسانے اس کے تخیل پر اپنا قابو پا چکے ہیں۔ جس کی مثال ہمارے سامنے سوہنی اور مہینوال کی تصویر ہے۔ یہ ایک پنجابی قصّہ ہے جو صوبہ بھر میں زبان زد عام ہے۔ پنجابی دولہا اور دلہن کی تصویر بھی نہایت دلکش ہے۔ دلہن رنگین لباس میں اپنے بچپنے کی گھر کی طرف آخری نگاہیں ڈال رہی ہے +

مصوّر نے دیہاتی زندگی کے بھی چند نہایت عجیب و غریب نمونے پیش کئے ہیں۔ مثلاً "پنجابی میلہ" "دیہاتی برات" "تین پشتیں" اور "قحط سے فراری" — ان تصویروں سے مسٹر الہ بخش کا کمال اور جدّت بالکل عیاں ہے صحیح زندگی کو نہایت خوبی سے مختلف الوان میں صفحۂ کاغذ پر نقش و نگار کیا ہے +

پنجابی مصوّر کا فن رسمی تخیل سے کہیں بالا ہے۔ اس نے یہ کمال لاہور کے ایک کہنہ مشق نقاش سے حاصل کیا ہے۔ اس نے حلقۂ تلمیذ کھولا ہوا تھا۔ جیسا کہ آجکل خود مسٹر الہ بخش نے مدرسۂ مصوّری لاہور میں جاری کر رکھا ہے۔ اس نے چند سال بمبئی میں صرف کئے۔ جہاں گجرات اور راجپوتانہ کے اہل فن نے اس پر اثر چھوڑا غالباً اس کے دماغ میں کرشن کی تصویر کا عکس گجراتی مصوّر کی وساطت سے اُترا تھا +

اس کی مصوّری کی طرز ادائیگی اور صحیح مبالغہ سے بالکل مطابقت کھاتی ہے۔ ہندوستانی روایات اور تمدّن کو بالکل صحیح رنگ میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ کانگڑہ جے پور۔ اور ناتھ دوارہ کے گذشتہ آرٹ میں اسکا خفیف سا پرتو موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس آرٹ میں وہ متانت زور اور شوکت نہیں۔ لیکن اس مصوّر کی دلی ارادت اور شاعرانہ تخیل اس کے منفوانہ فن اور وحدت کمال کی خامی کو چھپا لیتا ہے +

ہندو روایات کی تصویریں اور سکھوں کی تاریخ کے نقوش جو پنجاب اور شمالی ہندوستان میں رائج ہیں مسٹر الہ بخش کی مصوّرانہ فطرت اس کے ہم خیال ہے۔ اور پنجاب میں اس شاہراہ پر چل کر وہ اس دستور کو مستحکم کر رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دستور اس خطّہ کے لئے بالکل مناسب اور معقول ہے۔ راجپوت اور مغل آرٹ قریب قریب معدوم ہو چکا ہے اور ہندوستان کا بہترین حصّہ ایک دیگر آرٹ کی اختراع کے درپے ہے۔ لباس اور دیگر ظاہری نقوش میں بمبئی کے مصوّروں کا ایک حد تک ہمیں مشکور ہونا چاہئے۔ اب وقت ہے

کہ ہندوستانی آرٹ شمالی ہند سے نہایت اعلیٰ صورت پیش کرے۔ اور مجھے کمال مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ مسٹر الہ بخش اور پنجاب کے دیگر مصوّر اس اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں اور آرٹ جدید (یورپین) کو بالکل غیر متعصبانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور دنیا کے ہر ملک کے آرٹ کو ہندوستانی آرٹ میں اختلاط ہوتا ہوا دیکھ کر نقاد کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے +

مسٹر الہ بخش اپنے مفہوم کو نہایت لطیف مصوّرانہ جذبات میں ادا کرتا ہے۔ اور زندگی کا سادہ اور سحرکار تخیل اُس کی ہر ایک تصویر سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ہمعصر اور ہم وطن مسٹر عبدالرحمن چغتائی کا راستہ بالکل الگ ہے۔ اُس نے اپنے آرٹ کی دنیا علیحدہ استوار کی ہے۔ اُس کا نقش و نگار۔ اُس کی لطیف مصوّری اُن لطافت نگار مصوّروں کے نزدیک زیادہ قابل قدر ہے جو اسلامی شاعری تاریخ اور تصوف میں دلچسپی لیتے ہیں +

چغتائی اور الہ بخش دونوں انسانی تصویر کے توسط سے اپنے کمال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور عموماً ان کے ہر پیکرِ تصویر کی ابتدا انسانی شکل سے ہوتی ہے۔ لیکن قدرتی مناظر کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ بات نندلال بوس میں پائی جاتی ہے جو اپنی فطرت نگاری میں درختوں کی روح نکال کر صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ پنجابی مصوّروں میں یہ بات ڈھونڈے سے نہیں ملتی +

بہرحال مسٹر الہ بخش کی مصوّری جس میں اُس نے کرشن اور دیگر ہندوستانی روایات کو ہندوستانی اور یورپین آرٹ کو امتزاجی رنگ میں پیش کیا ہے۔ قابلِ تحسین ہے۔ اور یہ جدید آرٹ ہندوستان میں اتحاد کی صورت پیش کرتا ہے۔ اور ایک حد تک مقبول ہو چکا ہے۔ اور ہندوستانی روایات کے قدرداں اس مصوّر کی کامیابی کے لئے ہر وقت خواہشمند ہیں +

(ماڈرن ریویو) خلیل۔ بی اے

اُسے خوشی ہوتی تھی - اب اُس کے چمکدار کلس کو دیکھ کر آنسوؤں کی جھڑی اور تیز ہوجاتی - پاربتی نے موہن کے جانے کے بعد کھیر پھر کبھی نہیں پکائی - اُس کے ماں باپ نے سوچا کہ اب اُس کی شادی کی ضرورت ہے +

اُنہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کا علاج کچھ اور ہی ہے - سب نے مل جُل کر پاربتی کی شادی کرا دی - جس وقت برات رخصت ہو رہی تھی - اُس کا گھر بھر موہن کو یاد کرکے رو دیا - پاربتی اُس وقت رو بھی نہ سکی +

(۷)

پاربتی اپنے نئے گھر میں آئی - اُس میں وہ گُن تھے کہ گاؤں بھر کی چہیتی بن گئی - کنوئیں پہ پانی بھرنے جاتی تو گاؤں کی لڑکیاں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوتیں - جب وہ گائے بھینس کی سانی کرتی - تو وہ زبان سے اُس کی ساری کے پلّو اُس کے سر سے گرا دیتیں - ساس نندیں ہر وقت اُس کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتیں - اُس کا شوہر بھی اُس سے بہت خوش تھا - وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت سمجھتا تھا - پاربتی بھی اُن سب کے خوش رکھنے کی کوشش کرتی - اُسے سب طرح کا آرام حاصل تھا - صرف ایک رنج تھا اور وہ بچھڑے ہوئے بھائی کی یاد +

(۸)

ایک دن پاربتی کے شوہر نے اُس سے کہا کہ "دیکھو آج ہم اپنے دوست کی دعوت کریں گے - خوب اچھا اچھا بھوجن پکاؤ - پاربتی اپنے شوہر کا حکم ماننا اپنا سب سے بڑا دھرم سمجھتی تھی - "جو آگیا" کہہ کر کام میں معروف ہو گئی - پوریاں پکائیں - کئی طرح کی ترکاریاں - چٹنی - اچار تیار کئے - اُس نے آج کھیر بھی پکائی - کھیر پکاتے وقت اُس کے آنسو اُس میں ٹپک پڑے - اُس نے آنسو پونچھے اور کھیر نیچے اُتار لی - دعوت کا وقت آیا - پاربتی نے گھونگٹ نکال کر چوکے میں سب بھوجن پرس دیا - آیا ہوا مہمان اُسے کھانے لگا - پاربتی نے اُس کی آواز سنی اور سمجھا کہ کر وہیں گر پڑی - اُس کے گھر میں آیا ہوا مہمان اُس کا بھائی تھا - پاربتی بھی اُسی گاؤں میں بیاہ کر آئی تھی - جہاں موہن بھاگ کر آگیا تھا - پاربتی ہوش میں آئی - دونوں بہن بھائی مل کر خوب روئے - اس کے بعد موہن نے کھانا کھانا شروع کیا - وہ بیحد خوش تھا - پاربتی اُس کے لئے پانی لینے گئی - جب لوٹ کر آئی تو موہن نے ہنس کر کہا کہ "پاربتی آج کی کھیر اُس دن کی باسی کھیر سے زیادہ اچھی ہے" +

وقار عظیم

آرٹ:-

الٰہ بخش اور اسکی مصوّری

(ایک بنگالی نقاد کی رائے)

چند سال ہوئے کلکتہ کے سکول آف آرٹ کی نمائش میں میں نے الٰہ بخش کی مصوّری کے چند نمونے دیکھے جو مجھ پر اثر نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک مسلمان مصوّر کا کرشن کی روایت کو تصویر کا جامہ پہنانا کچھ زیادہ باعث دلچسپی نہ تھا۔ نیز نقاشی میں چند ایک عامیانہ عیوب بھی تھے ---- نقش و نگار میں رنگ نہایت ہلکے اور غیر معین تھے مصوّر کا قلم صرف انسانی حُسن کی طرف زیادہ مائل تھا لیکن تصویر کا مفہوم بالکل صاف تھا۔ اس لئے بحیثیت مجموعی اس کی نقاشی مقبول عام تھی ۔

امسال جو نمائش بھوانی پور میں منعقد ہوئی۔ اس میں میں نے ایک دفعہ پھر الٰہ بخش کی تصویر کو پبلک کے سامنے دیکھا۔ اس دفعہ پنجابی مصوّر کی تصاویر ہر ایک رنگ میں ... انگیز تھیں۔ دیوار پر ہر ایک تصویر بلند پایہ کی تھی ۔

میرے خیال میں اگر تصویر کے نیچے مصوّر کا نام نہ لکھا ہوتا تو کوئی شخص گمان تک بھی نہ کر سکتا کہ یہ ایک مسلمان مصوّر کے قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ بات کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے قدیم فنون لطیفہ اور داستانیں ادب نواز مسلمانوں کے دماغ سے کبھی بھی محو نہیں ہوئیں۔ مسلمانوں کی آبادی کا معتد بہ حصہ ہندو تمدن اور تہذیب کا قدر دان رہا ہے۔ علم موسیقی جہاں ہنود میں دھرپد اور دیگر کتھاؤں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ وہاں مسلمانوں میں کلاونت اور اُستادوں میں بطور ورثہ جاری ہے۔ بنارس میں نامبنے کے مجسمہ سازوں کی زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ہنود کے مندروں کے مورتیں بت عموماً مسلمانوں کے ہاتھوں کے تیار کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ایک مسلمان مصوّر ہندو روایتوں کو تصویر کا جامہ پہنا کر پیش کرتا ہے۔ تو یہ بات تحیّر خیز نہیں ۔

لیکن ہمارا مقصود اُس کی مصوّری کی اہمیت پر تنقید کرنا ہے۔ کرشنا کی تصویروں میں ماہر مصوّر نے ایک نہایت قدیم خیال کو نہایت فصیح طور پر پرورش کیا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اس کو اپنے فن میں کسقدر قدرت حاصل ہے۔ اجتماعی تصویریں مثلاً گوپیوں کی پوجا جس میں کرشن درمیان میں کھڑا ہے۔ اور ارد گرد گوپیوں کا جھمیلا پوجا کے لئے مختلف چیزیں طشتریوں میں رکھے ہوئے نذر کر رہا ہے۔ یہ تصویر بالکل بہزاد

اور نہایت دلکش ہے۔ منجملہ تصویروں میں سے کرشن کی تصویر جہاں رادھا سر پہ پانی کی ٹھلیا اٹھائے ہوئے ہے اور کرشن اسے تنگ کر رہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سوہنی اور مہینوال کی تصویر نہایت ہی خوب ہے کرشن اور رادھا کی تصویر میں عیاں مسرت ٹپک رہی ہے۔ اور مصوّر نے اسے بہجت افزا خیال کو پوری طرح نمایاں ہے۔ کرشن کی شبیہ نہایت حسین اور پاکیزہ ہے۔ دونوں کی حرکت اسقدر دلآویز ہے۔ گویا حسن وعشق کی لازوال طاقت مصروف رقص ہے۔ اس تصویر سے محبّت کا لافانی نغمہ پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا ہے۔ اور الٰہ بخش نے اس تصویر میں اپنی عقیدت اور ارادت کا بھی اظہار کیا ہے +

صرف رادھا اور کرشن کی جاوداں روایت نے ہی اس کے لطیف جذبات پر اپنا گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کے اپنے صوبے کے حسن ومحبّت کے افسانے اس کے تخیل پر اپنا قابو پا چکے ہیں۔ جس کی مثال ہمارے سامنے سوہنی اور مہینوال کی تصویر ہے۔ یہ ایک پنجابی قصّہ ہے جو صوبہ بھر میں زبان زد عام ہے۔ پنجابی دولھا اور دلہن کی تصویر بھی نہایت دلکش ہے۔ دلہن رنگین لباس میں اپنے بچپنے کی گھر کی طرف آخری نگاہیں ڈال رہی ہے +

مصوّر نے دیہاتی زندگی کے بھی چند نہایت عجیب وغریب نمونے پیش کئے ہیں۔ مثلاً پنجابی میلہ' دیہاتی برات' تین پشتیں' اور قحط سے فراری' ان تصویروں سے مسٹر الٰہ بخش کا کمال اور جدّت بالکل عیاں ہے صحیح زندگی کو نہایت خوبی سے مختلف الوان میں صفحۂ کاغذ پر نقش ونگار کیا ہے +

پنجابی مصوّر کا فن رسمی تخیل سے کہیں بالا ہے۔ اس نے یہ کمال لاہور کے ایک کہنہ مشق نقاش سے حاصل کیا ہے۔ اس نے حلقۂ تلمیذ کھولا ہوا تھا۔ جیسا کہ آجکل خود مسٹر الٰہ بخش نے مدرسۂ مصوّری لاہور میں جاری کر رکھا ہے۔ اس نے چند سال بمبئی میں صرف کئے۔ جہاں گجرات اور راجپوتانہ کے اہل فن نے اس پر اثر چھوڑا غالباً اس کے دماغ میں کرشن کی تصویر کا عکس گجراتی مصوّر کی وساطت سے اُترا تھا +

اس کی مصوّری کی طرزِ ادائیگی اور صحیح مبالغہ سے بالکل مطابقت کھاتی ہے۔ ہندوستانی روایات اور تمدّن کو بالکل صحیح رنگ میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ کانگڑہ سے جے پور۔ اور ناتھ دوارہ کے گذشتہ آرٹ میں اسکا خفیف سا پرتو موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس آرٹ میں وہ متانت زور اور شوکت نہیں۔ لیکن اس مصوّر کی دلی ارادت اور شاعرانہ تخیل اس کے منفردانہ فن اور وحدت کمال کی خامی کو چھپا لیتا ہے +

ہندو روایات کی تصویریں اور سکھوں کی تاریخ کے نقوش جو پنجاب اور شمالی ہندوستان میں رائج ہیں مسٹر الٰہ بخش کی مصوّرانہ فطرت اس کے ہم خیال ہے۔ اور پنجاب میں اس شاہراہ پر چل کر وہ اس دستور کو مستحکم کر رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دستور اس خطّہ کے لئے بالکل مناسب اور معقول ہے۔ راجپوت اور مغل آرٹ قریب قریب معدوم ہو چکا ہے اور ہندوستان کا بہترین حصّہ ایک دیگر آرٹ کی اختراع کے درپے ہے۔ لباس اور دیگر ظاہری نقوش میں بمبئی کے مصوّروں کا ایک حد تک ہمیں مشکور ہونا چاہئے۔ اب وقت ہے

کہ ہندوستانی آرٹ شمالی ہند سے نہایت اعلیٰ صورت پیش کرے۔ اور مجھے کمال مسرت حاصل ہوئی ہے۔ کہ مسٹر الہ بخش اور پنجاب کے دیگر مصور اس اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں اور آرٹ جدید (یورپین) کو بالکل غیر متعصبانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور دنیا کے ہر ملک کے آرٹ کو ہندوستانی آرٹ میں اختلاط ہوتا ہوا دیکھ کر نقاد کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے +

مسٹر الہ بخش اپنے مفہوم کو نہایت لطیف مصورانہ جذبات میں ادا کرتا ہے۔ اور زندگی کا سادہ اور سحرکار تخیل اس کی ہر ایک تصویر سے چلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ہمعصر اور ہم وطن مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کا راستہ بالکل الگ ہے۔ اس نے اپنے آرٹ کی دنیا علیحدہ استوار کی ہے۔ اس کا نقش و نگار۔ اس کی لطیف مصوری اُن لطافت نگار مصوروں کے نزدیک زیادہ قابل قدر ہے جو اسلامی شاعری تاریخ اور تصوف میں دلچسپی لیتے ہیں +

چغتائی اور الہ بخش دونوں انسانی تصویر کے توسط سے اپنے کمال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور عموماً ان کے ہر پیکر تصویر کی ابتدا انسانی شکل سے ہوتی ہے۔ لیکن قدرتی مناظر کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ بات نندلال بوس میں پائی جاتی ہے جو اپنی فطرت نگاری میں درختوں کی روح نکال کر صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ پنجابی مصوروں میں یہ بات ڈھونڈے سے نہیں ملتی +

بہرحال مسٹر الہ بخش کی مصوری جس میں اس نے کرشن اور دیگر ہندوستانی روایات کو ہندوستانی اور یورپین آرٹ کو امتزاجی رنگ میں پیش کیا ہے۔ قابل تحسین ہے۔ اور یہ جدید آرٹ ہندو مسلم میں اتحاد کی صورت پیش کرتا ہے۔ اور ایک حد تک مقبول ہو چکا ہے۔ اور ہندوستانی روایات کے قدردان اس مصور کی کامیابی کے لئے ہر وقت خواہشمند ہیں +

(ماڈرن ریویو) خلیل۔ بی اے

"دُھوپ"

(افسانہ)

میں سرتوز کا پیامبر تھا۔ کرنل سیکرم کے پاس جا رہا تھا۔ کرنل صاحب کے ہاتھ میں قلعہ سیم گڑھ کی کمان تھی۔ یہ قلعہ دکھن کے شمالی گوشہ میں ایک سنسان ٹیلے پر تھا۔ سیم گڑھ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میگزین مکمل اور اسلحہ خانہ مستحکم تھا۔

خط میں کیا تھا۔ یہ تو کاتب جانے یا مکتوب۔ مگر آپ نے بھی سنا ہوگا ع خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ غالباً گوالیار اور بندیلکھنڈ سے غنیم کے آمد آمد کی خوشخبری تھی۔

ستر میل کے سفر کے بعد میں آدھی رات کو سیم گڑھ کے قریب پہنچا۔ ریت کا دریا نربدا کے دوش بدوش لہریں لے رہا تھا۔ اور ایک ہجراں نصیب ٹیلہ پر قلعہ تصویر سکون اور مجسمہ سکوت بنا ہوا کھڑا تھا۔

قلعہ تک کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا۔ میں بہت سا چکر کھا کر جیسے ہی پھاٹک کے سامنے پہنچا۔ ایک گولی زناٹے کے ساتھ کان کے پاس سے گزر گئی۔ نشانہ چوک گیا۔ سنتری نے اپنی رائفل دوبارہ بھرنی شروع کی۔ حسن اتفاق سے غریب کو خیال آگیا کہ ذرا پوچھ تو لے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں جواب دے سکوں۔ چھروں کی بوچھار میرے اردگرد کی چٹانوں پر ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ میرے منہ میں جو کچھ آیا۔ بکنے لگا۔ مگر خاکی پوش سوار اور بھورے عرب کو دھندلی سی چاندنی میں پہچانتا تو کون پہچانتا۔ یہ بھی ہماری قسمت تھی کہ راکب مرکب دونوں بچ گئے۔

قلعہ کے بہادر اپنے کارتوس ہی ڈھونڈا کئے۔ اور میں سرپٹ اڑاتا ہوا پہنچ گیا۔ ایک انگریز افسر نے مجھے پہچان لیا۔ اور ساری ہل چل ختم ہو گئی۔

میں نے کرنل کی خدمت میں پہنچ کر ادب سے عرض کیا۔ میں باؤل ہوں اور سرتوز کا خط لایا ہوں۔

کرنل:- اردلی۔ اردلی۔ دوسرا چراغ لاؤ۔ جلدی کرو جلدی میز پر رکھ دو۔ باہر جاؤ۔ دروازہ بند (مڑ کر) لاؤ۔ خط لاؤ۔

خط کو ختم کرتے ہی کرنل صاحب نے ایک پرچے پر جلدی سے کچھ گھسیٹ گھساٹ دیا۔ اور آواز دی۔ اردلی! اردلی! اس نوٹس کو میجر گبن کے پاس ابھی لے جاؤ۔ جلدی۔ دوڑو (مڑ کر) میرا قاصد یا تو راستہ بھول گیا یا کورنگ کے سپاہیوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ آج دو مہینہ کے بعد تم پہلے شخص ہو جو سچی خبر لائے ہو۔

اتنے میں تمام فوجی افسر آگئے اور کرنل صاحب نے کہنا شروع کیا :-

حضرات ! میں نے مجلس رزم منعقد کی ہے۔ مجھے سندھی اطلاع ملی ہے کہ کورسنگھ اور گنڈھک راؤ کی فوجیں چل چکی ہیں۔ دونوں آرہے ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم لوگ اپنی معمولی سی جماعت کے ساتھ یہیں محصور ہو کر ساٹھ ہزار سپاہی اور آتش فشاں توپ خانوں کا مقابلہ کریں یا اپنی میگزین کو آگ لگا کر سوگڑھ کی طرف شان کے ساتھ پسپا ہو جائیں +

بڑی دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی۔ مگر بازی بوڑھے کرنل کی ہوئی۔ اور میدان بھی کرنل صاحب ہی کے ہاتھ رہا۔ تمام افسران فوج پسپا ہونے کے فیصلہ پر مایوس و غمگین ہو کر اپنے اپنے کمروں کو واپس گئے اور کرنل صاحب اپنے اردلی کی مدد سے سرکاری کاغذات کو محفوظ طور پر باندھنے لگے +

میں اجنبی تھا۔ بحث میں کیا حصّہ لیتا۔ چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ جب مجلس رزم ختم ہو گئی۔ تو سب چلے گئے کسی نے میری طرف دیکھا بھی نہیں +

میں اُٹھا کہ ذرا جا کر دیکھوں میرے چارپایہ دوست کو کس اصطبل میں جگہ ملی ہے۔ اور بے زبان تہران کی کی ناک چنے کی بالٹی میں ہے یا نہیں۔ سرول نے مجھے دونوں خوش خبریاں سُنائیں۔ "میں نے آپ کے گھوڑے کو کرنل صاحب کے اصطبل میں بندھوا دیا ہے۔ اور سیکرم صاحب کھانے پر بیٹھے ہوئے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چاہیے وہاں کھائیے۔ چاہے میرے ساتھ +

سرول کا کمرہ پھاٹک سے قریب ہی تھا۔ ایسا تھا کہ بم کا اثر بھی اس پر نہیں ہو سکتا تھا۔ سرول کھانے کے بعد سگار کے دھوئیں اُڑانے لگا۔ اور جوش میں کہنے لگا۔ اگر کوئی واقف آدمی چاہے تو تن تنہا اس قلعہ میں رہ کر لاکھوں آدمی کا مقابلہ کر سکتا ہے +

اتنے میں کرنل صاحب کا آدمی مجھے آکر بُلا لے گیا۔ سیکرم صاحب نے سوگڑھ کے راستے کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ اور اپنے فیصلہ کے متعلق اتنی تفصیل سے صفائی دینے لگے۔ کہ میں ستر میل کا تھکا ہوا مسافر اپنی کرسی ہی پر سو گیا +

صبح کو آنکھ کھلی تو سنسان کمرے میں دھوپ کا سیلاب موجیں لے رہا تھا۔ چاروں طرف غضب کا سناٹا تھا۔ میری گھڑی بند ہو گئی تھی۔ مگر قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ روانگی کا وقت گذر چکا ہے +

میں اُٹھ کر چلا تو نہ پہرہ دار تھا نہ سنتری۔ سارا قلعہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اور ہر ہر قدم پر پسپائی اور روانگی کے نقوش پھیلے ہوئے۔ اب لکیر پیٹنا بیکار تھا۔ میں کرنل کے اصطبل میں دوڑا ہوا گیا۔ کہ کارواں ابھی دور نہ گیا ہوگا .... اور میرے تہران کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ حد نظر تک نہ تو گھوڑے تھے نہ خچر۔ سچ ہے مصیبت کی گھڑی میں یہ جانور بھی اس قیمت کے ہو جاتے ہیں۔ کہ سونے کے برابر رکھ کر تول لئے جائیں۔ اب میں نے جلدی سے شاہی گری پر چڑھ کر اپنی دوربین لگائی۔ یا تو قافلہ بہت پہلے چل چکا

تھا یا طوفان میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔ اُفق پر ایک ہلکا ہلکا دھندلکا سا نظر آیا اور کچھ نہیں +

صاف ظاہر تھا کہ میں قافلہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ گرد بھی نہیں پاسکتا۔ اونا ایسے میدان میں پاپیادہ چلنا کم سے کم میری سمجھ سے باہر تھا۔ جہاں کچھ ہی دیر کے بعد گوالیاری سواروں کی چوکیاں بیٹھ جائینگی۔ اتنے میں مجھے سسرول کے الفاظ یاد آ گئے۔ اور میری ساری کوفت کافور ہوگئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ تاریخ رزم میں ایک نئے صفحہ کا اضافہ کرونگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ دھوپ اپنی بانت کا آدمی کسقدر منچلا اور رستم خصلت آدمی ہے!

چار میناروں پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں نے عہد کیا کہ جب تک دم میں دم ہے اس جھنڈی تک بادسموم کا کوئی جھونکا نہ پہنچنے دونگا +

روز کی تجویز یہ تھی کہ میگزین میں آگ لگادی جائے۔ ڈیڑھ لاکھ کارتوس اور باروت کی پانچ سو تھیلیاں مع تمام سامان کے برباد ہو جائیں۔ تاکہ غنیم کو فتح قلعہ کے ابدمشت خاک کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو مگر میرے نظام عمل کی روشنی میں دیکھئے تو میگزین کا ایک ایک ذرہ ہیرا اور موتی تھا۔ سوال یہ تھا کہ میگزین کہاں ہے اور کیسے بچے۔ اگر کچھ دیر اور گذر گئی تو فتیلہ سلگتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ اور . . . پھر حسرت ہی حسرت رہ جائے گی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ توپ خانہ کہیں سرداب میں ہے۔ مگر زمین دوز تہ خانے کا راستہ کہاں سے ہے اس کی چھانوں بھی میرے دماغ میں نہ تھی۔ اور ہر قدم یہی خیال مارے ڈالتا تھا کہ اب فتیلہ نے لو دکھائی۔ توپخانہ اُڑا۔ اور سیم گڑھ صفحہ ہستی سے معدوم ہوکر رہ گیا +

میں جستجو کرتے کرتے تھک گیا۔ چاہتا تھا کہ باہر جاؤں اور وہاں سے اس یک لمحی آتش فشاں کا نظارہ کروں۔ کہ اتنے میں کتے کی دردآمیز آواز سُن کر ٹھٹک گیا۔ آواز رہنما تھی اور میں اسی کے سہارے اُترا اور پچھم کے کونے والے بُرج تک پہنچا۔ اندر والی دیوار کے ایک زاویہ میں مجھے ایک دروازہ سا دکھائی دیا۔ وہ مقفل تھا +

دو ہی تین لکوں میں زنگ آلود قفل کا فیصلہ ہوگیا۔ میں سیڑھیوں سے اندر اُترا۔ اور آواز کے سہارے سرداب تک پہنچ گیا۔ یہیں سے تہ خانہ شروع ہوتا تھا۔ کتا ایک زنجیر میں بندھا ہوا تھا۔ اور جانے والے میری ہی طرح اس کو بھی بھول گئے تھے۔ میں نے رہا کیا +

ابھی کتا اچھی طرح چھوٹا بھی نہ تھا۔ کہ کمرے میں ایک ہلکی سی لپک ہوئی۔ اور ایک آتشین سانپ ایک کالے تودے کی طرف رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ بے اختیار میرے دونوں پانوں جلتے ہوئے فتیلہ پر پڑے اور وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ مگر جب تک پورا اطمینان نہیں ہو گیا۔ میں بارود خانے سے باہر نہیں آیا +

اب میں نے قلعہ کی چھان بین شروع کی۔ سب سے پہلے سودی خانے میں آیا۔ چاول دال اور نمک کے بورے اور گھی کے کنستر گنتی سے زیادہ رکھے ہوئے تھے۔ انگریزی بسکٹ مکھن۔ سوکھا ہوا گوشت مچھلی اور پنیر کے ڈبے بھی کثرت سے تھے۔ میری خاطر جمع ہوگئی کہ جو ہو سو ہو بھوکا نہ مرونگا۔ میں نے مرغیوں کو دانہ دیا اور باہر نکل آیا +

میں نے چاروں طرف پھر کر دیکھا تو محاصرہ کے وقت قلعہ کو کہیں سے کچھ کھٹکا نہ تھا۔ دبیز چٹانیں ہر طرف سینہ سپر تھیں۔ صرف پھاٹک پر تھوڑا سا خطرہ تھا۔ پھاٹک دُہرے تھے۔ ایک بیرونی تھا اور ایک اندرونی۔ دونوں میں بیس گز کا فاصلہ تھا اور دونوں کے درمیان ایک پُل تھا۔ یہ پل زنجیروں پر تھا۔ اور قلعہ کے اندر سے چرخی چلاتے ہی سمٹ کر پشتہ اور فصیل کا پل ہو جاتا تھا۔ اب تو مجھے بھی کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ کوئی دو ایک قلعہ میں محصور ہو کر لاکھوں محاصرین کو دست بابچہ رکھ سکتا ہے +

میں ہر طرح پر مطمئن تھا۔ آرام کی تمام چیزیں جمع تھیں۔ کھانے پینے کا سب سامان لیس تھا۔ مگر کمی تھی تو تمباکو کی۔ کرنل صاحب اور میجر صاحب، ڈاکٹر صاحب اور لفٹنٹ صاحب کی خانہ تلاشیاں ہوئیں۔ مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب میں نے سرول صاحب کے کمرے کی چھان بین شروع کی۔ وہاں بھی حسرت کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ واپس ہُوا ہی تھا کہ آواز آئی۔ ٹھہرو کون ہے؟

سنسان قلعہ میں وہم وگمان و اُمید کے بالکل خلاف یہ آواز سن کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ کون ہے ٹھہرو ٹھہرو۔ آواز میں غصہ تھا۔ سنتری باہر نکالو +

میں نے سمجھ لیا کہ کوئی مریض ہے۔ بخار کے ہیجان میں بک رہا ہے۔ غالباً اب مجھے نرس کے فرائض بھی انجام دینے ہوں گے۔ آواز والے کمرے میں داخل ہُوا۔ تو میں حیران رہ گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ ایک گوشے میں پنجرے کے اندر ایک پہاڑی مینا تھی۔ اور بس۔ مجھے دیکھتے ہی پھڑ پھڑ بتائی۔ ٹھہرو سنتری باہر نکالو۔ سرول صاحب نے خوب سکھایا پڑھایا تھا۔ لہجہ بالکل آدمیوں کا سا تھا۔ اور حیرت ہوتی تھی کہ ایک مشت پر انسانی تکلم کا مقابلہ کرتی ہے۔ میں نے پنجرہ اُتار لیا۔ بسکٹ کھلایا۔ پانی پلایا۔ اپنے کمرہ میں لاکر آزاد کر دیا۔ پلی ہوئی تھی۔ گلگشت میں مصروف ہو گئی +

اب میں نے اپنی توپوں کا امتحان لیا تو مسرت کی انتہا نہ تھی۔ گولوں کی زد میں نربدا کا ساحل بھی آجاتا تھا۔ میں نے توپخانہ سے ۱۲ توپیں لاکر برج میں لگائیں اور اس طور پر لگائیں کہ ایک ہی وقت میں فلیلوں کی گرہ میں آگ دی جانے تو سب توپیں ایک ساتھ ہی دغ سکتی تھیں۔ دھوپ کی توپ یہی تھی +

تین دن گذر گئے اور غنیم کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ آخر تنہائی سے گھبرا کر میں شکار کھیلنے نکلا۔ تر تر سے نربدا کے کنارے پڑے ہوتے تھے۔ میں نے دو شکار کئے۔ اور فوراً ہی واپس چلا +

ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ دس پندرہ سواروں کی ایک ٹولی ملی۔ غالباً پیش خیمہ والے جوان تھے۔ میرے پاس رائفل تو تھی۔ مگر بطوں کے شکار میں پانچ سات کارتوس جو لیکر چلا تھا سب ختم ہو گئے تھے +

اس خیال سے ڈھارس ہوئی کہ ابھی تک کسی نے مجھ کو دیکھا نہ تھا۔ میں دریا کے کنارے کنارے چلتا ہُوا، لہریہ دار پگڈنڈی پر پہنچا۔ یہاں سے میں نے جھانک کر دیکھا کہ میری کمینگاہ سے وہ سوار صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہوں گے۔ میں اپنی کمینگاہ سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے ایک سوار جاتا ہُوا دکھائی دیا۔ اب تو میں دو

چکیوں کے بیچ میں تھا ✦

پیچھے پلٹنا ناممکن تھا۔ لہذا میں بھی سوار کے نقشِ قدم پر تیزی سے چلا۔ اب مجھے خیال آیا کہ پھاٹک بھی کھلا ہوا ہے۔ کہیں وہ سوار ہمت کر کے اندر پہنچ گیا تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میں سوار کے گھوڑے کی دُم کے ساتھ لگا ہوا دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ وہ رُک گیا ✦

دروازہ کھولو کھولو بھی۔ انگریزوں کا راج جاتا رہا ✦

اتنے میں بڑے تحکم کے ساتھ دیوار سے آواز آئی :-

"ٹھہرو سنتری نکالو" میں نے پہچان لیا کہ میری بیناہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بقیہ گھوڑوں کی ٹاپ فضا میں گونج رہی تھی۔ اور پہلو والا سوار بھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرے وجود سے بالکل بے خبر تھا۔ میں کرتا تو کیا۔ تنہا تھا صرف ایک ہی تدبیر سمجھ میں آئی ✦

میں بھی اُچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہو رہا۔ اچانک سوار کی کمر مضبوطی سے تھام لی۔ اور دونوں پاؤں سے گھوڑے کو اتنی تیز مہمیزیں دیں کہ وہ نیم دیوانہ ہو کر پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ اس جست و خیز میں ہم دونوں ریگ کے بوروں کی طرح زمین پر گرے۔ مگر سوار نیچے تھا۔ اور میں اوپر۔ دشمن کا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ اور وہ مردہ سا ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی پھاٹک اندر سے بند کر لیا ✦

بقیہ سوار بھی پہنچ گئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ پھاٹک کھول دو ہم دوست ہیں۔ اور میری بینا کہہ رہی تھی "ٹھہرو ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ سنتری باہر نکالو" ✦

میں نے فوراً ہی اپنے شکار کے ہتھیار لے لئے۔ اُس کو باندھ دیا۔ اور اپنی دھوپ کی توپ کا رُخ باہر والے سواروں کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک ترجمان کہہ رہا تھا۔ انگریز تمام لڑائیوں میں ہار گئے۔ اقبال ختم ہو گیا ✦

میں نے فتیلہ داغ دیا بارہ توپیں ایک ساتھ سر ہوئیں۔ دُور کی زد تھی۔ لہذا گولیاں اور چھرے سواروں کے سر سے گذر گئے۔ مگر پورا پورا اثر ہوا۔ اور دو ہی منٹ میں دشمن ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ✦

اب میں اپنے ناخواندہ مہمان کی طرف پلٹا۔ مگر شکر ہے کہ وہ مر چکا تھا۔ ہتھ گاڑی میں رکھ کر میں اُس کو لایا اور دیوار سے لاش نیچے پھینک دی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا گیا ✦

دشمنوں کو اپنی ہوشیاری دکھانے کے لئے میں نے تمام لیمپ جلا دئے۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کو گردش دیتا تھا۔ اب میں نے جگہ جگہ آگ بھی سلگا دی جس کا دھواں باہر والوں کو خوب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے قلعہ کے اکثر حصّہ میں بگل بھی بجائے۔ اور مختلف احکام بھی دئے۔ یہ ایسے ہتھکنڈے تھے جو میں نے محاصرہ کی پوری میعاد تک جاری رکھے۔ اور جن کا اثر میری اُمید سے بھی زیادہ ہوتا رہا۔ طرّہ یہ کہ میں نے ایک آدھ

مرتبہ توپیں بھی داغ دیں۔ اور دھوپ بالکل کھل ہوگئی۔ پھر تو چادر تان کر سویا +

صبح کو اُٹھتے ہی میں نے دیکھا کہ غنیم کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ چار چھ سو پیادے اور سوار پہنچ گئے ہیں۔ راوٹیاں پڑ گئی ہیں۔ لوگ نہانے دھونے میں مصروف ہیں +

دن خیریت سے گذر گیا۔ مگر شام آتشیں لباس پہنے ہوئے آئی۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور گھوڑوں کے ہیجہ سے میدان گونجنے لگا۔ دریا کے قریب چھاؤنی پڑ گئی۔ بیچوبے۔ شامیانے۔ پالیں اور راوٹیوں سے ایک نئی بستی تین میل کے گرد سے میں بس گئی۔ قلب میں درباری سرخ خیمہ اپنی پوری شان سے استادہ تھا۔ اسی خیمہ کی بیچ والی توپ پر راودے مہاراج کا سُرخ جھنڈا جس میں مچھلی بنی ہوئی تھی لہلہا رہا تھا +

دن میں جو اِکّے دُکّے فوجی میری رائفل یا چھوٹی توپ کے زد میں آجاتے تھے۔ وہ واپس ہو کر اپنے ساتھیو کو خبر بھی نہیں دے سکتے تھے۔ شیر اجل کا لقمہ ہو کر ایسے ہضم ہوتے تھے کہ شیر کو ڈکار بھی نہیں آتی تھی +

دن کو میں سو لیا تھا۔ اس لئے رات کو آسانی سے جاگتا رہا۔ مگر ایک بجے کے قریب نیند آ ہی گئی۔ تین بجتے بجتے میرے کتّے نے مجھے جگایا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہی دیکھا کہ ایک سیاہ پوش باہر کے دروازے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ میری رائفل بھری ہوئی تھی۔ میں نے کئی فیر کئے۔ مگر وہ صاف نکل گیا +

پو پھٹی تو معلوم ہوا کہ سیاہ پوش ایک لفافہ چھوڑ گیا ہے۔ میں نے جھٹ پٹ اُٹھالیا۔ اسمیں لکھا ہوا تھا:۔

"سیم گڑھ کے شریف اور بہادر سپاہیوں کو نمسکار" +

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ انگریزوں کا راج ختم ہو چکا ہے۔ ہندوستان کا کوئی آدمی ہندو مسلمان اب انگریز کا نمک نہیں کھاتا۔ مگر تم کھاتے ہو۔ کیا تم بلیچھوں اور کافروں کے کہنے سے اپنے بھائیوں کا خون بہاؤ گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ آج رات کو چپکے سے پھاٹک کھول کر اپنے بھائیوں کو اندر بلا لو۔ نہیں تو گنڈک راؤ کے غصہ کی آگ تم کو جلا دیگی۔ پھاٹک کھول دینے جانے کی شہادت میں اندر تین سُرخ لالٹین اور پھاٹک پر دو لالٹین جلا دینا +

خط پڑھتے ہی میرا لائحہ عمل تیار ہو گیا۔ میں نے پانچ لالٹینیں تیار کرلیں۔ تھوڑا سا سو بھی لیا۔ سب توپیں لیس کرلیں اور وقتاً فوقتاً جو سپاہی میری رائفل کی زد میں آتے گئے اُن کو بھونتا بھی رہا +

رات کو تین بجے تک سناٹا رہا۔ مگر تین بجے ایک جاسوس سیاہ کپڑے پہنے روشنی کے دائرے تک آیا۔ اور پھاٹک کو آغوش مادر کی طرح کھلا ہوا دیکھ کر چپکے سے واپس گیا +

آدھ ہی گھنٹے کے اندر بہت سے لوگ پہنچ گئے۔ ایک آدمی نے بڑھ کر پوچھا۔ "کہو بھائیو سب ٹھیک ہے"؟ +

میں نے کہدیا۔ ہاں بھائی سب ٹھیک ہے۔ بے کھٹکے اندر آ جاؤ +

اب سپاہیوں کی ندی موجیں لیتی ہوئی بڑھی۔ بہت سے نمک حرام باغی اب بھی انگریزی وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ یہ سب بڑھے چلے آئے۔ مگر اندر والا پھاٹک میں نے مضبوطی سے بند کر لیا تھا۔ اس پھاٹک

پر آ کر دشمن مر گئے۔ اور افسر نے دستۂ شمشیر سے کھٹکھٹا کر کہا۔ اپنے بھائیوں کے لئے یہ پھاٹک بھی کھول دو ۔

پیچھے والے برابر شور کر رہے تھے کہ ہم پلٹے جا رہے ہیں بڑھے چلو ۔

آگے والے کہہ رہے تھے۔ ٹھہرو۔ یہ پھاٹک بند ہے ۔

پل پر اتنی بھیڑ تھی کہ پیچھے مڑنا کیسا یونہی سانس گھٹ رہی تھی۔ ہلنا جلنا ممکن نہ تھا ۔

باہر والوں نے توپ منگوائی۔ چاروں طرف چیخ پکار مچ گئی۔ میں نے چاہا کہ پل والی چرخی چلاؤں۔ مگر ان چار دنوں میں چرخی زنگ آلود ہو چکی تھی۔ ٹس سے مس بھی نہ ہوئی ۔

اب میں نے بگل بجا کر احکام دیئے۔ اور دھوپ کی تمام توپ ٹوپ ایک ساتھ داغ دی۔ غنیم کے توپخانہ میں ہلچل اور تمام فوج میں کہرام مچ گیا۔ تھوڑی دیر میں سارا میدان صاف تھا۔ صبح کو مجروحین اور مُردے سب ہٹا دیئے گئے ۔

چھاؤنی میں آٹھ کا گجر بجا۔ اور میں نے دیکھا کہ دس بارہ آدمیوں کی ایک ٹولی سفید جھنڈا لئے ہوئے سیم گڑھ کی طرف روانہ ہوئی۔ سفید پرچم صلح کی نشانی ہے۔ اگر جماعت پاسِ قلعہ سے زیادہ قریب آ جاتی تو سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ لہذا میں نے باہر والے پھاٹک سے بیس گز آگے ہی لکڑی کے تختوں سے ایک حد مقرر کر دی ۔

پیامی جماعت سرحد پہ آ کر رُک گئی اور بڑی دیر کی گفتگو کے بعد خط وہیں چھوڑ کر لوٹ گئی۔ پہلے دن کی چٹھی بہت سلیس اور میٹھی تھی۔ دوسرے دن غصہ کا پیام تھا۔ جس کا جواب میں نے بھی ادب کے ساتھ دیا اور اس مرتبہ قصد کر لیا۔ کہ خود ہی اپنا پیامبر ہو کر دشمن کے ہاتھ میں بنفس نفیس جواب رقعہ پہنچا دونگا ۔

فطرت نے بھی میرا ساتھ دیا۔ رات آئی۔ اور اتنی کالی آئی کہ لیلےٰ کے سیاہ بال بھی اس کے سامنے پانی بھرتے۔ کالی رات اور پھر ابر آلود۔ آپ خود ہی تصور کیجئے کہ اس سے بہتر اور کونسی نقاب ہوتی۔ میں دبے پاؤں قلعہ سے اُترا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ سُرخ خیمہ تک پہنچ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ سرخ جھنڈے پر قبضہ کرنے کے بعد رقعہ وہیں چھوڑ کر چلا آؤنگا۔ مگر وہاں جھنڈا ہی نہ تھا۔ غالباً اس خیال سے اُتار کر محفوظ کر لیا گیا تھا کہ رات کے کہر سے خراب نہ ہو ۔

لیکن میرے ہی پو بارہ تھے۔ چاروں محافظ اطمینان سے خرّاٹے لے رہے تھے۔ اسلحہ ایک طرف پڑے تھے۔ میں چیتے کی طرح لپک کر خیمہ میں پہنچ گیا۔ ایک سُنہری مسہری پر بیس ہزار جوانمردوں کا سردار گیدڑ ک راؤ سیاہ صورت۔ چیچک کے داغ۔ بھرا ہُوا جسم۔ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے بجلی کی طرح سرخ جھنڈے پر قبضہ کیا۔ پانوں کی ڈبیہ کے پاس طلائی دستہ کی ایک سبری بھی تھی اُٹھا کر بغل میں لگائی۔ اور اپنا رقعہ سب سے نیچے میں باندھ کر گنڈک راؤ کے تکیہ میں تیچے کی نوک بھونک دی۔ تاکہ جاگنے کے بعد اس کو معلوم ہو جائے کہ اتنی فوج کی کمان اور چیز ہے۔ اور دشمن کے قبضہ میں آ جانا اور بات ہے۔ یہ صرف میری شجاعت تھی کہ وہ بال بال بچ گیا ۔

سُرخ شامیانے کے پاس ہی مٹی کا وہ ٹیلہ تھا جس پر آج قلعہ پر گولہ باری کے لئے توپ چڑھائی گئی تھی۔ ایک طرف چھرّے اور گولیاں رکھی تھیں۔ دوسرے پہلو میں باروت کے بورے تھے۔ توپ بھری ہوئی تھی۔ میں نے چاہا کہ توپ کی قسمت پر ایسی مُہر لگا دوں کہ اس کی ابتدا انتہا کی آئینہ دار بن جائے۔ باروت کے بورے میں نے دہانہ میں بھرنا شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ لبریز ہو گیا۔ جیسے میں مڑ کر چلا اُدھر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ ہم دونوں ایسا لڑے کہ دست و گریبان ہو کر زمین پر آ رہے +

اب بڑی مشکل تھی میں چاہتا تو پستول یا سبری سے قصہ تمام کر دیتا۔ مگر میرا قیدی میرے ہاتھ میں سُرخ جھنڈا دیکھ کر بالکل حلقہ بگوش ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں ایک بے زبان کی جان لینا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے اُس کا رُخ اپنے قلعہ کی طرف کیا۔ اور پیچھے سے دھکیلتا ہُوا لے چلا۔ باہر کے پھاٹک پر پہنچ کر قیدی رہا کر دیا گیا۔ اور میں سیم گڑھ میں محفوظ تھا +

اب میں پاؤں پھیلا کر سویا۔ مگر صبح کاذب ہوتے ہی برج پر آ کر بیٹھ گیا۔ کہ ذرا توپ سر ہونے کا تماشہ دیکھوں۔ جب اچھی خاصی صبح ہو گئی تو توپچیوں کی ایک جماعت توپ کے تودہ کے پاس آ کر ڈٹ گئی۔ مگر کسی حاکم کا انتظار تھا +

میں نے سوچا کہ اگر گنڈرک راؤ کا انتظار ہے۔ تو راؤ صاحب اپنی ہی فکر میں حیران ہوں گے۔ کہ شیطان عفریت بھوت یا پ[illegible]خط دے گی رسبری یا جھنڈا لے گیا۔ یا کیا ہوا؟ بارے خدا خدا کر کے راؤ صاحب آ گئے۔ اشارہ سے اجازت دی گئی اور توپچی نے آگ دے دی۔ سامعہ شگاف دھماکا ہوا۔ کوّے چیخنے لگے گھوڑے بھڑک اُٹھے اور توپ ہزاروں ٹکڑے ہو گئی +

گنڈرک راؤ بچ کر نکل گئے۔ مگر جب دھواں چھٹ گیا تو نہ توپ تھی۔ نہ توپچی۔ پائین تودہ پر البتہ زخمیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں [illegible] ہی مالِ غنیمت یعنی سُرخ جھنڈے کو برطانوی جھنڈے کے نیچے نصب کر کے پھریرا کھول دیا۔ ہزاروں دوربینیں قلعہ کی طرف لگ گئیں +

اب چار پانچ دن یونہی گذر گئے۔ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوتی۔ چھٹے دن کور سنگھ کی فوج کا پیش خیمہ بھی آ گیا اور دوپہر تک پوری فوج آ گئی۔ مگر کور سنگھ اور گنڈرک راؤ کی احتیاط اور بے پروائی۔ چالاکی اور کاہلی جوش نظمی اور بدانتظامی ایک دوسرے کی ضد تھی۔ سارے انتظامات بڑے سلیقہ سے ہوئے اور چھاؤنی پڑ گئی +

چالاکی کی انتہا یہ ہوئی کہ شفق کی سُرخی میں گولہ باری شروع ہو گئی۔ اور اگر سیم گڑھ کا قلعہ بھرا ہُوا ہوتا تو قدم قدم پر ڈاکٹروں کی ضرورت پڑتی۔ مگر مجھکو کیا پڑی تھی کہ باہر نکلتا۔ کتے اور مینا کو محفوظ کر کے میں بھی گن پروف (ایسی عمارت جس پر گولوں کا اثر نہ ہو سکے) کوٹھری میں آرام سے بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی گولہ اندازی موقوف ہو گئی +

دوسرے دن پھر سویرے ہی سے گولہ باریاں ہوئیں اور زیادہ شدت کے ساتھ ہوئیں۔ مجھکو تمام دن کوٹھری

میں رہنا پڑا۔ اور تیسرے دن تو قیامت ہی ہو گئی۔ دونوں فوجوں نے ایک ساتھ چاند ماری شروع کر دی +
قسمت ہو تو ایسی ہو۔ تیسرے دن شام کو گرد و باد کا طوفان آیا۔ راوٹیاں اُڑنے لگیں۔ جانور بھاگنے لگے۔ اور سارا انتظام خراب ہونے لگا۔ ہوا کم ہوئی تو پانی برسنے لگا اور ایسا برسا کہ جل تھل ہو گیا +

اب میں نے کورسنگھ کی فوج کی پڑتال کا ارادہ کر لیا۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر چل نکلا۔ مجھے فوجی لباس خانہ سے ہندوستانی افسر کی وردی مل گئی تھی۔ فضا کا احسان اور فطرت کا فیض تھا۔ کہ میں تمام میں گھوم لیا۔ توپوں میں لوہے کی میخیں لگا دیں اور بچتا ہوا صاف نکل آیا۔ مگر قسمت کے شکنجوں سے کیسے چھوٹتا۔ قلعہ کی پاس والی چڑھائی پر چڑھ ہی رہا تھا کہ چوکیدار سوار وں میں گھر گیا +

اب کسی صورت سے رہائی ممکن نہ تھی۔ اس کھیل میں ایک آخری پتا تھا۔ جو میں چل دیا +

"تم کون ہو؟"

"میں قلعہ کا سپاہی ہوں۔ باغی ہوں۔ اور کورسنگھ کے لئے خوشخبری لایا ہوں +

افسر۔ اپنی خبر مجھ سے بتاؤ +

میں۔ ہرگز نہیں۔ صرف کور صاحب کو بتاؤں گا +

میرے ہتھیار لے لئے گئے۔ اور صلاح مشورے کے بعد مجھے سپہ سالار کے پاس لے چلے +

گورسنگھ۔ تم کون ہو؟

میں۔ میں حیدرآبادی ہوں۔ باپ ترک تھا۔ ماں کشمیری +

گورسنگھ۔ کیا خبر ہے +

میں نے بڑی چرب زبانی سے قلعہ کی تباہی بتائی۔ اور کہا کہ اگر اسی وقت میرے ساتھ ایک دستہ جائے تو میں قلعہ پر قبضہ کرا دوں۔ سردار اقرب خاں بلائے گئے۔ اور ہم سب روانہ ہوئے۔ طوفان کی طاقتیں ختم ہوئیں ہوا درست ہو چلی تھی۔ پانی تھم گیا تھا۔ اور بادل کے مضطرب ٹکڑوں سے چاند بار بار جلوہ بار تھا۔ باہر والے پھاٹک سے سب لوگ ایک ساتھ داخل ہونے مگر ——— میں پل پر پہنچکر ذرا ٹھٹکا اور جست کر کے اندر والے پھاٹک میں آ گیا۔ اقرب خاں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے آتے ہی چرخی چلا دی۔ دس بارہ دن تیل دینے سے سارا زنگ دور ہو گیا تھا۔ پل کے تختے سمٹ کر لپٹتے بن گئے اور کشتوں کا ڈھیر کھڈ میں جا رہا +

اس فتح سے میں اپنے جامے میں نہ تھا۔ طوطا بھی مور بنا ہوا تھا۔ اور میرا ہم نفس کتا بھی اپنی گلی کا شیر تھا۔ جیت کی خوشی میں میں نے جتنی لالٹینیں مل سکیں میں نے سب روشن کر دیں۔ اور بارہ فیر کی سلامی داغ کر اطمینان سے سو رہا +

دوسرے دن صبح میں نے دیکھا کہ کنورسنگھ کے خیمہ سے ۲۰ گز اس طرف ایک لانبا بانس گاڑا گیا ہے۔ اور اس پر ایک سیاہ بیل لٹکا ہوا ہے۔ گویا دشمنوں کی کھال کھینچکر بھس بھرنے کا پیام تھا +

اب کیا تھا۔ میں نے گولہ باری شروع کی۔ نہ تو گنڈک راؤ کو پتہ تھا۔ نہ کنور سنگھ جانتے تھے۔ کہ سلیم گڑھ میں بہت بڑی بڑی توپیں محفوظ ہیں۔ اور اُن کی پوری چھاؤنی اندر ہے +

میں نے گولہ باری اور آتش فشانی شروع کی۔ توپیں دیر یہ میں سر ہوتی تھیں۔ اس واسطے کہ میرے دس پانچ ہاتھ پاؤں تو نہ تھے۔ مگر ہر گولا اپنے نشانے پر ٹھیک پہنچتا تھا۔ تہلکہ مچ گیا۔ ہل چل پڑ گئی۔ قیامت تھی قیامت۔ پاؤں اُکھڑ گئے اور چھ گھنٹے کے بعد دشمنوں کو بہت دور ہٹ کر راحت ملی +

شام ہوتے ہوتے دونوں طرف کے غازیوں کو سکون ملا۔ مگر ظاہر تھا۔ کہ اب دھوپ نہیں چل سکتا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ پردۂ شب میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ سکرم صاحب کے کمرے میں قلم دوات اور کاغذ کی فکر میں گیا کہ فاتحین کے لئے قلعہ محصور کی روداد لکھتا جاؤں۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ستارے چمک اُٹھے +

سکرم صاحب اپنی روانگی کی جلدی میں ایک لفافہ بھول گئے تھے۔ میں نے چھٹ پٹ کھولا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اور تو اور یہ معلوم کر کے مسرتوں کی معراج ہو گئی کہ باہر والے پھاٹک سے کچھ ہی دور زمین دوز رخنائیں بارود سے بھری ہوئی موجود ہیں۔ جنہیں قلعہ کے اندر سے موقع پر آگ دی جا سکتی ہے۔ اور دونوں ایک ساتھ اُڑائی جا سکتی ہیں +

رات کے ٹھیک بارہ بجے کنور سنگھ کی فوج دریا موج نے حملہ کر دیا۔ جب فصیل پر سیڑھیاں لگ گئیں تب میری آنکھ کھلی۔ فوراً ہی میں نے اپنے آخری حربے سے کام لیا۔ اور دونوں خندقیں داغ دیں۔ اس زور کا دھماکا ہوا کہ کان پھٹتے پھٹتے بچ گئے۔ سارا قلعہ ہل گیا۔ پلستر کے پرخچے اُڑ گئے اور۔ بے شمار غنیم دام اجل میں آ گئے +

پھر تو صبح تک وہ سناٹا تھا کہ سوئی کی آواز بھی سن لیجئے +

آدھی سے زیادہ بے خبر فوج کام آ گئی۔ دو ہی دن میں ہیضہ اور چیچک کی وبا بھی زور شور سے پھیلی۔ گنڈک راؤ نذر خندق ہو چکے تھے۔ کنور سنگھ کی ہمت بھی پست ہو گئی +

محاصرہ اُٹھ گیا۔ مرہٹے جس راہ سے آئے تھے۔ اُسی طرف چلے گئے۔ میں ایک ٹٹو پر سوار ہو کر طوطا ہاتھ میں لئے ہوئے اور کتے کو رکابداری سپرد کر کے چل نکلا۔ ٹٹو کے ایک طرف چنے کی بوری تھی۔ دوسری جانب چاول تھے۔ تین ہی چار دن کے بعد میں انگریزی پڑاؤ پر پہنچ گیا +

میری داستان اگر سچ ہے۔ تو تاریخ رزم میں نقش ثانی بن کر باقی رہے گی۔ بہرطور میری ترقی بھی ہو گئی۔ فوجی تمغہ جات بھی کثرت سے مل گئے ——— کیا اب بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ سب دھوپ لیفٹیننٹ کے سوا کچھ تھا نہ کچھ ہے +

کاشی پریاگی

افسانہ

شہلا

از جناب نظر ہاشمی

(۱)

میں ایک پل پر بیٹھا ہوا بہتے ہوئے پانی کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ندی تھی جس کا پاٹ کچھ اتنا زیادہ چوڑا نہ تھا۔ برسات کا شباب تھا۔ بارش بڑے زوروں سے ہو رہی تھی۔ نزدیک پاس کے تمام کھیت جل تھل ہو گئے تھے۔ سیلاب کے آنے سے گاؤں میں تراہ تراہ مچی ہوئی تھی۔ یہ کوئی نئی مصیبت نہ تھی۔ حالانکہ ہر سال دیہات والوں کو یہ مصیبت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ مگر اس سال کا سیلاب سیلاب بلا تھا۔ کم از کم سو برس کے اندر اندر ایسا سیلاب کبھی نہیں آیا تھا۔

گاؤں کا ایک بڈھا پھوس جسے لوگ "لال بجھکڑ" کہتے تھے جس کی عمر تقریباً ایک سو دس برس کی ہوگی۔ اس سے البتہ معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ ایسا ہی سیلاب آیا تھا جس سے بہت سے گاؤں نذر سیلاب ہو گئے تھے۔ لال بجھکڑ کہتے تھے کہ خود میرے گھر کی انگنائی میں پانی چلا آیا تھا ــــ مگر اس مرتبہ تو یہ حالت تھی کہ گاؤں کے اندر چھوٹے چھوٹے ڈونگے چلتے تھے۔ ندی سے کچھ دور اوپر ملاحوں نے اپنی جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ شام کے وقت تمام ملاح اپنی کشتیوں کو کنارہ سے لگا کر باندھ دیتے تھے۔ تاکہ گاؤں والوں کو اگر رات کے وقت ضرورت پیش آئے۔ تو کشتیاں بآسانی پہنچ جائیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ہفتہ بھر میں پانی اتر جائے گا۔ اور گاؤں پانی سے صاف ہو جائے گا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پانی کسی صورت سے کم نہ ہوتا تھا۔

(۲)

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونوں آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے۔ درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہوا سرسبز پتوں کو گدگدا رہی تھی۔ بیدمجنوں کی خاموش پھننگ پر ایک طائر بیٹھا گاؤں کے انقلاب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ پانی میں لہریں صاف چمک رہی تھیں۔ پلٹ کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی۔ اس کے دامن میں ایک پھونس کی جھونپڑی تھی اور ادھر ادھر ملاحوں کی جھونپڑیاں بھی پاس پاس پڑی تھیں۔ پھونس کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ بڈھا ملاح کوئی ساٹھ سال کا دبلا پتلا پوپلا آدمی تھا۔ اس کے شانے چوڑے چکلے تھے۔ اور چہرے سے ابھی صحت کے آثار ٹپکتے تھے۔ اس وقت وہ نشہ کی ترنگ میں تھا۔ اس کی خوبصورت لڑکی شہلا جو حسن کی مجسم تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ہی جھونپڑی میں رہتی تھی ــــ وہ اپنا باپ کا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔

"کشتی !" ـــــ ندی کے دوسرے کنارہ پر کوئی چیخ رہا تھا "کشتی !"

بڈھا ملاح چونک کر اُٹھ بیٹھا مگر نشہ کی حالت میں تھا۔ زمین پر گردن ڈال کر پھر دہیں لیٹ گیا۔ شہلا اپنی جھونپڑی سے چل کر فوراً کشتی کے پاس آ پہنچی۔ اُس نے کشتی کی رسّی کھولی اور آگے پانی میں بڑھانے کی کوشش کرنے لگی۔ کشتی ساحل پر کیچڑ میں پھنسی تھی۔ شہلا اسے آگے بڑھانے کی بار بار کوشش کرتی تھی۔ مگر ناکام رہی۔

میں ایک ٹیلے پر بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا دل تڑپ اُٹھا۔ میرے دلی جذبات اس بات پر متقاضی ہوئے کہ میں شہلا کی اس نازک وقت میں امداد کروں۔ میں جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا اُس کی کشتی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا:۔

"شہلا! یہ کشتی جسے تم آگے پانی میں بڑھانا چاہتی ہو۔ کیا میں اس میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں ؟"

شہلا۔ خاموش تھی۔ اور عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے پھر اپنے پہلے سوال کو پیش کیا۔

شہلا نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ اور کہا "نہیں! نہیں! آپ کو تکلیف اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کام کو بآسانی میں کر سکتی ہوں۔

میں نے دیکھا کہ شہلا نے اپنی انتہائی کوشش کشتی کے ہٹانے میں صرف کر دی۔ دفعتاً کشتی کیچڑ سے ہٹ کر پانی میں چلی گئی۔ شہلا اپنی رسی وغیرہ رکھ کر خود کشتی میں سوار ہوگئی۔ اور چپو چلاتے ہوئے اُدھر روانہ ہوگئی جدھر سے آواز آئی تھی۔

(۳)

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پرندے اپنے آشیانوں میں دبک سکڑ بیٹھ گئے۔ زُلفِ شب کمر تک پہنچ گئی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں اپنے چمن میں بیٹھا غرقِ تصوّر تھا۔ دل میں ایک کھٹک محسوس کر رہا تھا۔ مجھے شہلا کی صورت رہ رہ کر یاد پڑتی تھی۔ اُس کو دیکھے ہوئے مشکل سے چھ گھنٹے ہوئے ہوں گے مگر دل اُس کے دیکھنے کو بےچین ہو رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ شہلا ایک حور ہے اور انسان کے گھر میں پیدا ہوئی۔ ایک لعل ہے جو گودڑ میں چمک رہی ہے۔ میری روح اُس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ اُس کی سادگی اور بےپروائی نے دل میں ایک پُر لطف خلش ہو رہی تھی۔ پروازِ خیال چھری کی طرح ذبح کر رہی تھی۔ میں بنچ پر ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک ابر کے ٹکڑے نے چاند کو آغوش میں لے لیا۔ ہوا میں صبح کی خنکی پیدا ہو چکی تھی اور تارے ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہونے شروع ہوگئے تھے۔ میں بنچ پر پڑا وداعِ شب کا منظر دیکھ رہا تھا۔

(۴)

شہلا اپنے خانہ باغ میں ندی سے کوسوں دور پھولدار درختوں کے کنج میں بیٹھی پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ کبھی وہ پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتی۔ سر پر رکھتی اور چھوڑ دیتی۔ ہوا کے جھونکے نے ایک شاخ کے دو پھول

آپس میں آ کر مل گئے اور پھر جدا ہو گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر شہلا تڑپ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے نازک پھولوں کو پکڑ کر چومنے لگی۔ اس کے جذبات میں ایک خاص قسم کا اضافہ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے محبت کی پوری پوری تصویر کھنچ گئی۔ شہلا کے مزاج میں بیحد سادگی تھی۔ اُس کا حسن ظاہری زیبائش سے بالکل پاک تھا۔ اُس کا لباس لونڈرسے، اُس کا ہاتھ چوڑیوں سے۔ اُس کا سینہ زیور سے کوسوں دور تھا۔ مگر پھر بھی ایک مجموعہ تھی اُن خوبیوں کا جس پر قدرت خود فخر کر رہی تھی۔ سیاہ چمکیلے بال۔ خوبصورت چہرہ کی کروٹوں میں آ پڑے تھے۔ اور اُس کو مطلق خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ آم کا درخت سر پر چھایا ہوا تھا کوئل کی آواز نے اُس کو چونکا دیا۔ پریشان بال درست کئے۔ نگاہ اُٹھی تو سامنے ایک نوجوان کو گم سم کھڑا دیکھا۔ وہ نگاہیں جو اُٹھیں حیا کا مخزن تھیں! جذبۂ نسوانیت نے اُنہیں جھکوا دیا . . .

شوق اور بے چینی نے پھر نیچی نگاہیں بلند کیں۔ اور دفعتاً دو متضاد کیفیتیں شہلا کے قلب پر گزریں۔ حیا کا طوق گلوگیر تھا۔ محبت کی چنگاریاں شرر بار ہونے لگیں +

(۵)

مجھے شہلا کی ابتدائی بے پروائی اور سادگی اچھی طرح یاد ہے۔ وہ حسن وعشق کے جذبات سے بالکل ناآشنا تھی۔ اُس نے الفت و محبت کا نام تک نہ سُنا تھا۔ مگر اب جبکہ وہ ایک خود بینی و خود آرائی کا مجسمہ بنی ہے۔ خود میرے ہی اظہار تمنا نے غرور و تمکنت پیدا کیا۔ مجھے حسرت موہانی کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

حقیقت یہ ہے کہ شہلا میں اُس روز سے ایک نمایاں فرق ہو گیا تھا۔ اُس کا چہرہ اُداس معلوم ہوتا تھا آنکھوں میں غمگینی تھی۔ انداز میں نہ وہ بے ساختگی تھی نہ شوخی۔ میرا دل اُس کی طرف اب اور بھی کھنچا جاتا تھا۔ اُس کی سوگوار صورت مجھ پر اور ستم ڈھا رہی تھی۔ اور اب میں پہلے سے زیادہ مضطرب و پریشان تھا۔ میں نے شہلا کو پہلی مرتبہ ساحل پر دیکھا تھا — دوسری مرتبہ میں نے اُس کو چمن میں پھولوں سے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو گئی اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے ایک مکان میں گھس گئی۔ میرا دل اب اور بھی بے چین ہو گیا۔ میں دیر تک کھڑا رہا۔ لیکن پھر اُس کی صورت نظر نہ آئی +

(۶)

پانی کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ موسم برسات کا تھا۔ آدھی رات کے وقت موسلادھار بارش میں جب سیاہ گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ میں زمین پر ایک جامن کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ پانی سے سارا جسم بھیگ گیا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے ایک جھونپڑی کی شمع کو دیکھ رہا تھا۔ میرا تمام جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ دفعتاً بجلی چمکی اور میں نے اپنے سے ذرا دور کسی کو کھڑا دیکھا۔ اشتیاق آمیز آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر بجلی چمک کے چھپ گئی۔ دل بے قابو ہو گیا۔ یقین و استغراق کی حالت یہ تھی کہ آنکھ ہٹنے کا۔ نظر پلٹنے کا۔ اور پلک

جھپکنے کا نام دلیتی تھی۔ گر برسات کی گھنگھور گھٹا تھی سیاہ بادل آسمان پر گھر رہا تھا۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ یکایک پھر بجلی چمکی منتظر آنکھوں نے اس پھول کو دیکھا۔ زمین جس کے قدموں کو بوسہ دے رہی تھی۔ دل خوشی کے مارے اُچھل پڑا۔

سردی سے سارا جسم کانپ رہا تھا۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ انتہائی کوشش کے بعد میں نے (کانپتی ہوئی آواز میں) آہستہ سے پوچھا!

"شہلا! تم یہاں کیسے آگئیں؟"

شہلا ابتک خاموش تھی۔ اُس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور کہا:۔

"کمار! پانی میں کیوں بھیگ رہے ہو۔ میری جھونپڑی میں چل کر بیٹھو۔ بارش جب تھم جائے چلے جانا"

یہ وہ آواز تھی جس نے میرے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ میرے دل میں ایک پُر لطف خلش ہونے لگی۔ میں کانپتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہؤا۔ چاہتا تھا۔ کہ اپنے دل کی داستان شہلا کو سُنا دوں' اپنے قلب کی بے چینی کو اُس سے بیان کر دوں۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور ہوا کے سامنے اپنے کپڑے خشک کرنے لگا۔ موسلادھار بارش اب کم ہوگئی تھی۔ مگر تھم تھم کر بوندیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے شہلا سے پوچھا۔ "شہلا! تم کب تک یہاں رہو گی؟"

شہلا۔ (ذرا گردن جھکا کر) ہاں! میں اُس وقت تک رہوں گی جب تک پانی نہ اُتر جائے۔ مگر اس کے پوچھنے سے آپکا مطلب؟

میں۔ یوں ہی! میرا کوئی خاص مطلب نہیں +

شہلا۔ آخر کچھ تو!!!

میں۔ کچھ نہیں!

شہلا۔ آخر۔ . . . . .

میں۔ میرا خیال ہے کہ پانی کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ سیلاب بڑھتا جا رہا ہے۔ ندی سمندر کے مانند پھیل گئی ہے اس حالت میں تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے +

شہلا۔ واہ! کیا خیال ہے۔ میری طبیعت تو کبھی اس بات کی متقاضی نہ ہوگی۔ کہ میں ایسے مصیبت کے وقت میں کسی انسان کی ہمدردی نہ کروں۔ اگر اس وقت ندی کے اُس کنارہ سے کوئی کشتی مانگے تو کیا مجھے لے جانے میں دریغ کرنا چاہئے؟ نہیں! نہیں! ہرگز نہیں۔ میرے دوست یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے +

میں۔ میرا مقصد یہ نہیں! میں چاہتا تھا کہ بہ نسبت یہاں کے تم اپنے باغ میں رہتیں تو بہت بہتر تھا +

گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا۔ کہ دفعتاً ندی کے دوسرے کنارہ سے کسی نے پکارا۔ کشتی! شہلا اُٹھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ کمار! لو اب تو میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ! پھر ملاقات ہوگی!!

میں مایوسی سے شمشہلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے دل کی بُری حالت ہو رہی تھی میری آنکھوں سے آنسو بہت قریب آ کر رُک گئے۔ شمشہلا اس کو خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ مگر نہایت خاموشی کے ساتھ ساحل تک بڑھتی چلی آئی۔ ندی کے دوسرے کنارے سے ابتک آوازیں آ رہی تھیں۔ دو ایک کشتیاں اَور بھی ملّاح کھیتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ شمشہلا نے بھی اپنی کشتی کی رسّی کھولی اور اُس میں سوار ہوگئی میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ اور چپّو چلاتی ہوئی بڑی تیزی سے روانہ ہوگئی +

آسمان بالکل صاف ہوگیا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ ایک ابر کا ٹکڑا جو ابتک چاند کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھا چھوڑ کر الگ ہوگیا۔ چاندنی روشنی میں پانی کی لہریں جھل جھل چمک رہی تھیں۔ میں ٹکٹکی باندھے پانی میں کشتی کو دُور تک دیکھتا رہا۔ کشتی جب آنکھوں اوجھل ہوگئی۔ میں نے بھی واپسی کا ارادہ کیا۔ آسمان کے روشن ستارے اور چاند میری بیکسی اور تنہائی کو دیکھ رہی تھی۔ میں اُن کے چمکدار چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ میں اپنے باغ میں پھولوں کے ایک کنج میں بنچ پر آ کر لیٹ گیا۔ رات کی خاموشی میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تاروں سے اپنے دردِ دل کی داستان سُنا رہا تھا میں استغراق کی حالت میں کبھی آنکھیں بند کرتا تھا کبھی کھولتا تھا۔ رات آدھی کے قریب گذری تھی۔ اور مخلوق پردہ دنیا پر بے خبر نیند کے اثر میں تھی مسلسل شب بیداری اور اختر شماری نے میری حالت خراب کر دی تھی چاہتا تھا کہ کسی طرح کچھ دیر کے لئے ان تعلقات سے بے خبر ہو جاؤں۔ مگر پھر کہتا تھا کہ یہ کیفیت نہایت پُرلطف ہے نہ سوؤں۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا۔ رات اپنی تیسری منزل بھی طے کر چکی تھی۔ ہوائیں صبح کی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ چار بجے کے قریب چاند کا روشن چہرہ اور بزم انجم پھیکی پڑ گئی۔ میں اُٹھ کر گھر چلا آیا +

(۷)

اسیطرح دو تین دن گذر گئے۔ میں روزانہ شام کو شمشہلا کی جھونپڑی کے پاس جاتا تھا۔ مگر اُس سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ایک روز میں اُس کے باغ میں جہاں وہ دن میں ایک دوبار گھومنے چلی جاتی تھی۔ اس کو دیکھنے گیا۔ مگر وہاں بھی اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں مصائب و آلام میں پھنسکر زندگی سے عاری ہوگیا تھا۔ میرا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ آخرکار ایک روز شام کو میں گھبرا کر گھر سے باہر نکلا۔ میرے ہاتھ میں وہ پیاری بانسری تھی جسے میں اکثر بجایا کرتا تھا۔ میں بانسری کو ہاتھ میں لئے اسی پل پر جا کر بیٹھ گیا اور بجانے لگا۔ اس کی سُریلی آوازیں فضائے آسمانی میں گونج رہی تھیں۔ ندّی کے کنارہ اس وقت وہ عالم تھا۔ کہ ہر چیز خاموش تھی۔ مگر آسمان اپنے آغوش میں چمکتے ہوئے تاروں کو لئے ہوئے تھا۔ چاند اس کی گود میں چمک رہا تھا۔ میں اپنی بانسری بجانے میں مست تھا۔ مجھے دنیا و مافیہا کی بالکل خبر نہ تھی۔ دفعتاً میری پشت کی جانب سے کسی نے اپنے دو ہاتھوں سے میری آنکھوں کو چھپا لیا۔ میں دیر تک ششدر رہا۔ میرے ہاتھ تیزی سے اُٹھ کر اُس کی کلائی تک گئے۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک خفیف سی تھرتھراہٹ تھی۔ چوڑیوں کے بجنے کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں نے

میں نے نہایت دھیمی آواز سے کہا "شہلا"!

میں نے ایک لرزتی ہوئی آہ سنی۔ اُس کے ہاتھ میری آنکھوں سے سرک آئے۔ میں نے اپنے بالوں میں ایک پتے کی طرح کپکپاتے ہوئے ہاتھ کا اتصال محسوس کیا۔ پیچھے مڑکر اُس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ یکایک کسقدر بدل گیا تھا! آنکھیں بہت دور گڑی ہوئی تھیں اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ رہی تھیں۔ لب کسقدر زرد تھے۔ زلفیں پیچھے کی طرف لہرا رہی تھیں۔ گویا ہوا سے جنبش میں ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل بے چین ہو گیا۔ میں نے اُس کو اپنے قریب آہستہ سے کھینچا۔ اُس کا ہاتھ بلا مقاومت میرے قابو میں آگیا۔ اُس کے تمام جسم نے ہاتھ کی متابعت کی۔ اور اُس کا سر نرمی سے میرے سینے سے آلگا۔ اُس کی زلفیں میرے دہکتے ہوئے ہونٹوں سے مل گئیں +

میں نے شہلا سے پوچھا۔ "شہلا! تم اتنے دنوں تک کہاں روپوش تھیں؟"

اُس نے ذرا گردن اُٹھائی اور اپنے آپ کو سنبھالا۔ میری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر نہ دیکھ سکی۔ مسکرانے کی کوشش کر کے اُس نے کہنا چاہا:-

"میں نے بہت کوشش کی کہ تم سے ملاقات ہو جائے ————" اُس کے نیلے نیلے ہونٹ قابو میں نہ تھے۔ پھر اُس نے کہا۔ "میں نے کوشش کی ———— نہیں کمار! مجھ سے نہیں کہا جاتا!"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ آواز میں ہر لفظ پر رعشہ تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں چپ ہو گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اور میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُسی طرح نظر بچا کر اپنے زیریں لب کو چباتی ہوئی بیٹھی تھی۔ کہ کہیں آنسو نہ ٹپک پڑیں۔ اس کی سوگوار صورت پر ایک دلدوز بیچارگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت خستہ و پریشان ہے۔ میں اُسے چھیڑ کر گفتگو پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اس سے میں نے کہا "شہلا! خاموشی کھولو"۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں میری طرف اُٹھیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اُن میں التجا تھی۔ افشائے راز تھا۔ سوال تھا۔ لیکن میں اُن کی تحریک کی تاب نہ لا سکا۔ ایک خفیف شعلہ کی لپٹ جلتی ہوئی سوئیوں کی طرح میرے اندر دوڑ گئی

شہلا کے ہونٹوں کی ایک خفیف جنبش سے مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اُس کی حالت ذرا سنبھلی۔ وہ مجھ سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔ مگر اُس کی طبیعت میں اب تک بے چینی تھی۔ وہ بار بار میرے چہرے کی طرف دیکھتی تھی۔ اور آنکھیں نیچی کر لیتی تھی۔ شہلا کی کشتی سامنے بندھی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ابر کے گھر جانے سے آسمان پر ایک تارہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ دور کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے جو جھونپڑیوں میں جل رہے تھے۔ البتہ کچھ مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تھی اور چھپ جاتی تھی۔ بادل اب زور زور سے گرجنے لگا تھا +

شہلا مجھ سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی تھی۔ ساحل پر ملاح اپنی کشتیوں کو رسی سے مضبوط باندھ کر اپنی جھونپڑیوں

میں چلے گئے تھے۔ بہت سے چراغ جو جھونپڑیوں میں جلتے تھے۔ بجھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ سب کاہل سے فرصت پاکر بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ ندی کا پانی بڑے زور شور سے بہ رہا تھا۔ بادل کی گڑگڑاہٹ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً ندی کے دوسرے کنارہ سے مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ "کشتی لاؤ! کشتی!"

شہلا نے میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ چند لمحہ تک خاموش رہی۔ پھر اُس نے خود ہی کہا۔ "کمار! کیا تم میرے ساتھ اس کشتی پر اُس پار چلو گے؟"

میں شہلا کی اس جرأت پر بہت دیر تک متحیر رہا۔ میں نے شہلا سے کہا:۔

شہلا! مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر اس وقت پانی میں قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے"۔

شہلا نے مجھ سے کہا:" یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو چلیں۔ ورنہ میں خود جا رہی ہوں"۔

شہلا کی یہ ہمت دیکھ کر میری ہمت بڑھی۔ میں نے شہلا سے کہا۔" اگر تمہارا ارادہ یہی ہے تو چلو۔ مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے"۔

شہلا کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے رسی کو کھولا اور کشتی میں سوار ہو گیا۔ چپوؤں کو ایک بار پانی میں ڈال دیا میں شہلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ فرطِ مسرت سے ذرا کھلے ہوئے تھے۔ لبوں پر ایک دلکش فاتحانہ تبسم تھا۔ میں چپوؤں کو بڑی تیزی سے چلا رہا تھا کشتی کے چاروں طرف تاریک موجیں رقص کر رہی تھیں آناً فاناً کشتی بھنور میں پہنچ کر ہچکولے کھانے لگی۔ میرے ہاتھوں سے چپو چھوٹ گئے۔ میں نے شہلا سے کہا:" لو اب کشتی ڈوب رہی ہے"۔

شہلا مسکرائی۔ اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نازک ہونٹوں سے چوما۔ اپنے سر کو میرے آغوش میں ڈال دیا۔ اور کشتی پانی میں غرق ہو گئی!

میری زندگی کے کچھ دن اور باقی تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں موت کے منہ سے نکل کر ہاتھ پاؤں مارتا ہوا ساحل سے آ لگا۔ میری زندگی بالکل بیکار تھی۔ شہلا کے بعد میرا جینا بالکل بے لطف تھا۔ اگرچہ میں ابھی مایوس نہ ہوا تھا۔ مدت تک تلاش جاری رکھی۔ لیکن آخر مجبور ہو گیا کہ اُس سے ملنے کی اُمید ہاتھ سے دیدوں شہلا میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ ایک دن چند سال بعد راستہ میں مجھے ایک عورت کی جھلک دکھائی دی۔ جس کے چہرہ کو دیکھ کر وہ خد و خال آنکھوں میں پھر گئے۔ جو میرے دل پر نقش ہیں۔ ممکن ہے مجھے دھوکا ہوا ہو۔ مگر جو جذبہ شہلا نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا۔ وہ عمیق اور پرسوز جذبہ پھر کبھی نہ ابھرا۔ اُن آنکھوں کی جگہ جن کی محبت بھری نظریں کئی بار مجھ پر پڑی تھیں۔ اور کسی کی آنکھوں نے نہیں لی۔ وہ ہاتھ جسے میں صرف ایک دفعہ ہونٹوں تک لے گیا۔ ممکن ہے خاک ہو گیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور خود میں، میرا کیا حشر ہوا؟ مجھ میں اُن پرسہ... اُمنگوں میں سے کیا رہ گیا؟ ہاں! ایک مستقل نکوہش ایک غیر فانی بیکلی جو کبھی نہ ختم ہوئی محبت کے آنسوؤں کا وہ دریا جو آنکھوں سے بہتا تھا کبھی نہ رُکا!

نظر ہاشمی خانپوری

چار کتابیں

مزاحیہ:-

بیکاری!

از جناب سید ابو طاہر بی۔ ایس۔ سی (اٹک)

"دفتر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا آپ نے باہر لٹکا ہوا بورڈ نہیں دیکھا؟" یہ صاف جواب سُن کر میرے پیر تھرتھرانے لگے۔ مجھکو خوب معلوم تھا کہ ایک پرانا کلرک کل ہی مرا ہے۔ اور اُس کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اس لئے میں اپنی قسمت آزمائی کرنے یہاں آیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ مُردے کی بو سونگھ کر یا تو غسال آتے ہیں۔ یا تلقین پڑھانے والے مولوی یا کفن کھسوٹ خیراتی۔ اور یا اُس مرحوم کے لڑکے اگر وہ دولتمند تھا۔ مگر متوفی کلرک سے ہمیں ان متذکرہ بالا لوگوں میں سے ایک بھی مناسبت نہ تھی۔ ہم تو صرف اپنے اُس حق کو لینے آئے تھے جو بڈھا کلرک اپنی درازیٔ عمر کی وجہ سے غصب کئے بیٹھا ہُوا تھا۔

ہم متواتر چار سال سے بی اے کی دیوار پر اُچک اُچک کر نشانہ لگا رہے تھے۔ مگر ہر مرتبہ وار خالی ہی جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نوکری کی سنہری کونشستیں اُڑانے کی کوشش بھی کئے جاتے تھے۔ اور جس طرح صبح اُٹھ کر چہل قدمی کرنے جایا کرتے تھے اُسی طرح روزانہ کا مشغلہ یہ بھی تھا کہ کسی نہ کسی دفتر میں بھی پہنچ جاتے تھے اور بابو جی یا چپراسی صاحب جو کوئی بھی ملتے تھے۔ تو اُن سے "جگہ خالی ہے" کا سوال کر بیٹھتے تھے۔ اور اسی بہانہ اندر قدم رکھ کر اُن تمام بابوؤں کا جائزہ بھی لے لیا کرتے تھے جو کرسیوں پر بیٹھے ڈیسکوں پر گردن جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اپنے رجسٹروں میں مستغرق نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے تھے۔ مگر حقارت سے جس پر ہم شرما کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ شاید اُن کو بلا عرضی دئے ہوئے۔ اور دفتروں کے چکر لگائے بغیر یہ آسامیاں مل گئی تھیں۔

جب چار سال سے متواتر یہی مشغلہ ہو تو ہم کیوں نہ شہر کے دفتروں کی ڈائرکٹری اور جنتری بن جائیں۔ شہر کے تمام بابوؤں کی قسموں اور صورتوں کے ہم اتنے ہی بڑے عالم بن گئے تھے جتنے بڑے ہماری یونیورسٹی کے ایک پروفیسر درختوں اور جانوروں کے عالم تھے۔ ہم نے دیکھا کہ یا تو تمام بابو جوان ہیں یا ادھیڑ۔ اور اگر کچھ بوڑھے ہیں بھی تو وہ اپنے قویٰ کے لحاظ سے ہم نوجوانوں سے بھی زیادہ جینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اب ہمارے سامنے ایک راہ تھی۔ تخفیف کی وجہ سے دفتروں میں کسی نئی جگہ کا پیدا ہونا ناممکن تھا۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت کا سدھرنا بھی ایک امر موہوم تھا۔ اس لئے ہم کو تلاش تھی ایسے بابوؤں کی جو اس دنیا سے لمبی رخصت لینے والے ہوں۔ خوش بختی سے ایک دفتر میں ایک کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہُوا ایک بابو ہم کو نظر آیا۔ جس کے متعلق یہ

پیشینگوئی کی جاسکتی تھی کہ یہ عنقریب چولا بدلنے والا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بوڑھا بھی تھا اور سوکھا بھی۔ اور کھانستا اس طرح تھا جس طرح کوئی دمے کا بیمار۔ واقعی زندگی اور نوکری اُس پر بڑا ظلم تھا۔

آپ ضرور یہ خیال کریں گے کہ ہم اس بابو کی موت کے متمنی تھے۔ مگر جناب یہ خیال تو کیجئے کہ بچپنے ہی میں ہماری شادی کردی گئی تھی۔ اور جب تک بی اے میں پہنچیں ہم تہائی درجن بچوں کے باپ ہوچکے تھے۔ اُس پر آفت یہ تھی کہ جس وقت ہم اپنے فرسٹ ایڈیشن صاحبزادے کے رجسٹرڈ پبلشر بنے ہیں۔ اُسی وقت ہمارے والد اس دارفانی کے دفتر سے عالم جاودانی کے دفتر میں منتقل کردیئے گئے۔ قدرت نے شاید اُن کو مدد زاید میں خیال کیا ہو۔ وہ تو کہئے کہ ہماری بیگم صاحبہ جو حد درجہ کی حاسدہ تھیں ہم کو اپنا زیور بیچ بیچ کر پڑھا رہی تھیں۔ اور یہ اُنہیں کی کوششوں کا طفیل تھا کہ ہم لڑھکتے۔ فیل ہوتے۔ سستاتے۔ دم لیتے اور گرتے کھاتے کسی نہ کسی طرح بی اے فیل کہلائے جانے کے مستحق ہوگئے تھے۔ ورنہ میٹرک بھی نہ ہوسکتے۔ اُن کا مقصد دراصل ہم کو فائدہ پہنچانے کا نہ تھا۔ بلکہ ہمارے محلہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو خود تو بی اے تھے۔ مگر برائے نام دراصل اُنہوں نے اس ڈگری کے اختیارات اپنی اہلیہ کے نام منتقل کردیئے تھے۔ جو نسوانی رسالوں میں اپنا نام مسز محمود بی اے لکھا کرتی تھیں۔ قبضہ مخالفانہ اسی کو کہتے ہیں۔ بس یہی خیال ہماری بیگم صاحبہ کو بھی بے چین کئے رہتا تھا۔ کہ کب ہم بی اے پاس ہوں اور کب وہ ان الفاظ کو جھپٹ کر اپنے نام کے آگے لگائیں۔ اور اپنے ہمسایہ سے سر اٹھا کر بات کرسکیں۔ اُنہوں نے اسی انتظار میں مضمون نگاری بھی شروع نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ کب کی کہنہ مشق ہوگئی ہوتیں۔ اور نیرنگ خیال کے نیازش لطیف نمبر کے خاص کالموں میں جگہ پاچکی ہوتیں۔ اب جبکہ چار سال کی پیہم کوششوں سے ہم بی۔ اے پاس نہ کرسکے۔ اور اس طرح اپنی بیگم کے دوپٹے کے لئے بی اے کی بیل نہ فراہم کرسکے تو وہ ناراض ہوکر اپنے میکے چلی گئیں۔ پھر بتلایئے ہم اگر نوکری کے لئے زیادہ تگ و دو نہ کرتے تو کیا کرتے۔

ہاں تو اب ہم نے اپنی کوششوں کو صرف ایک دفتر کے لئے وقف کردیا تھا۔ اور وہ دفتر وہی تھا جس میں وہ بڈھا کلرک اپنی زندگی کے باقی دن کھانس کھانس کر گذار رہا تھا۔ الانتظار اشد من الموت ایسے ہی موقعوں پر کہا گیا ہے۔ ہر روز صبح کو دفتر کے قریب جانا۔ کھڑکی میں سے جھانکنا اور بڈھے کلرک کو حسب دستور اُسی جگہ بیٹھے ہوئے پاتا ہمارے لئے سخت امتحان تھا۔ مگر اُمید پہ دنیا قائم ہے۔ مہینوں کی لگاتار کوشش کے بعد ایک روز ہم نے دیکھا کہ وہ کرسی خالی ہے۔ اللہ ہم نے خیال کیا کہ ہمیں ہماری آنکھیں غلطی تو نہیں کررہی ہیں مگر وہ تو حقیقت تھی۔ ہم جلدی سے دفتر کے برآمدے میں پہنچے۔ اور ایک نوجوان بابو صاحب جو تھکن اُتارنے کے لئے باہر کھڑے سگریٹ کے دم لگا رہے تھے۔ اُس کے متعلق استفسار کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اُنکو سانس کا دورہ پڑا ہے۔ اس لئے وہ گھر پر ہیں۔

"کے روز کی چھٹی لی ہے"

"تین روز کی"

"صرف تین روز کی؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ اس لحاظ سے تو مرض کی کچھ بھی اہمیت نہیں معلوم ہوتی کم از کم پندرہ روز کی تو چھٹی لینا چاہئے تھی۔

"وہ کہاں رہتے ہیں؟" ہم نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کوئی کام ہے"

"نہیں" میرے منہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔ "ہاں ذرا عیادت کو جاتا" میں نے بعد کو لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" ہم کو مجبوراً کہنا پڑا۔ اور اس طرح کہنا پڑا کہ گویا ہم اُس کے ان بے جا سوالات پر تاؤ پیچ کھا رہے ہیں۔

"معاف کیجئے" اُس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس لئے پوچھا کہ آپ کو میں نے اس سے قبل کئی دفعہ اُدھر سے گذرتے دیکھا۔ مگر صاحب سلامت ہوتے نہیں دیکھی تھی"۔

"کوئی ضرورت نہیں تھی جناب" ہم نے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے۔ ہاں تو آپ کو اُن کے مکان کا پتہ بتا دوں؟"

"اگر آپ مناسب سمجھیں"۔

"میرا تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر ہاں آپ کو بڑی دقت سے پتہ چلیگا۔ خوب یاد آیا۔ مجھے بھی ایک گھنٹہ کے بعد وہیں جانا تھا۔ میں ابھی چلا چلونگا آپ ہی کے ساتھ"۔

"مگر آپ میری وجہ سے کیوں حرج کرتے ہیں"۔

"حرج کا ہے کا حضرت۔ یہ تو میرا فرض ہے کہ آپ کی رہبری کروں"۔

"آپ اُن کے کوئی عزیز ہیں"

"میں اُن کا داماد ہوں"

"ارے رے" ہم نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ تو برا ہوا" ہم سوچنے لگے۔

"آیئے جناب اندر آ جایئے۔ بس چند منٹ آپ کو انتظار کرنا پڑیگا" اُس نے اس آواز میں کہا کہ ہم نے گھبرا کر اپنے قدم سیڑھیوں پر رکھ ہی تو دیئے۔ اور اندر کمرہ میں جا کر کرسی پر بیٹھ ہی تو گئے۔

"میں ابھی حاضر ہوا" کہہ کر وہ چک اُٹھا کر دوسرے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔

یہاں عیادت کس کو منظور تھی۔ اُس بڈھے کلرک سے جان پہچان بھی نہ تھی۔ مکان کا پتہ پوچھکر ہم آفت میں پڑ گئے۔ اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ان حضرت سے اپنا پیچھا کس طرح چھڑائیں۔ ابھی کسی راستے پر پہنچے

بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے نئے دوست ملک الموت کی طرح دوسرے کمرے میں سے چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے نکلے اور ہمارے سر پر پہنچکر ہنس دئے۔ اور "تشریف لائیے جناب" کہہ کر ہماری راہنمائی کرنے کو آگے بڑھ گئے ✦

مجبوراً ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ مگر اُس وقت دماغ کچھ ایسا کند تھا کہ کوئی ترکیب بھی ذہن میں نہ آئی۔ آخر اِس خیال سے کہ کہیں اُن کا مکان جا نہ آجائے۔ اور اس حالت میں ہم کو مجبوراً عیادت کے لئے جاکر ندامت نہ اُٹھانا پڑے۔ ہم نے اُس وقت فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا ✦

"آپ کا کیا اسم مبارک ہے جناب"! اُنھوں نے ہم سے سوال کیا۔ جس کو ہم نے اپنی محویت کے عالم میں مخل ہوتے دیکھ کر اُس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور ایک برطانوی مدبّر کی طرح اس مشکل کو حل ہی کر لیا۔ ہم نے اپنے چاروں طرف نگاہ اُٹھا کر آیندہ روند کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے سے ایک صاحب اس تیزی سے چلے آرہے تھے کہ اُن پر یہی اطلاق کیا جاسکتا تھا کہ . . . . کسی حادثہ کی بنا پر ڈاکٹر کو بلانے جارہے ہیں۔ اور یا کسی جگہ دعوت میں تشریف لئے جارہے ہیں۔ شکر تھا خدا کا کہ ہم اُن کی اِس بادِ رکا پہلے سے حساب لگا کر اُن کے راستہ کی پٹڑی سے علیحدہ ہٹ آئے تھے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اتصال باہمی سے ہمارے ماتھے اور ناک میں سے کسی کو ضرور ضرب شدید کا حامل ہونا پڑتا۔ جب وہ ہمارے قریب سے پنجاب میل کی طرح سے نکل گئے۔ تو میں نے فوراً ہی اپنے دوست سے مڑ کر کہا:-

"اوفوہ دیکھئے پہچانتے بھی نہیں"

"کیوں کون ہیں"؟ اُنھوں نے گھبرا کر پوچھا ✦

"ارے صاحب اِن کی تلاش میں میں چھ ماہ سے گھوم رہا تھا میری سونے کی گھڑی نہ معلوم کہاں لے کر غائب ہو گئے تھے"✦

میں نے آواز میں ارتعاش پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "بھائی معاف کرنا میں پھر حاضر ہونگا۔ یہ موقع غنیمت ہے ورنہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے . . . . . . جلدی جلدی کہہ کر اور اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں پلٹ پڑا اور اپنے فرضی چور کے پیچھے 'اجی حضرت۔ جناب۔ جناب! کتنا ہی ڈالیگا۔ میرے دوست بھی اس دلچسپ پلاٹ سے مفت محظوظ ہونے کے لئے میری اُمید کے خلاف میرے پیچھے آنے لگے۔ اسی دوران میں میری صداؤں کا اتنا اثر تو ہوا کہ وہ بادپا شخص ٹھٹکا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اور جب میں نے "ذرا سنئے" کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ بھی شامل کیا تو وہ رُک گیا۔ میں آناً فاناً اُس شخص کے پاس پہنچا اور "بھائی بچانا" اس انداز سے کہا کہ وہ پریشان ہوکر میرا چہرہ دیکھنے لگا ✦

"اس کے پاس بم ہے"! میں نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو منفا لیس کی سوئی

کی طرح اس صورت سے کھنچے آ رہے تھے۔ کہ اس شخص کو پختہ یقین ہو گیا اور وہ میرے اضطراب سے متاثر ہو کر دوڑ کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے میں اس انداز سے دوڑنے لگا کہ گویا تعاقب کر رہا ہوں۔ ہم دونوں تقریباً دو فرلانگ دوڑنے کے بعد سڑک کے ایک سہ راہے پر پہنچے جہاں سے میں نے اپنے قدم سست کر کے ایک پان والے کی دوکان کی طرف رُخ کر دیا۔ اور وہ شخص متواتر دوڑتے گیا۔ یہانتک کہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اتفاق سے اُسی دوکان پر اُسی دفتر کا چپراسی بھی بیڑی کا بنڈل خرید رہا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور اس کی سگریٹ سے تواضع کرنے کے بعد باتوں ہی باتوں میں اُس بڈھے کلرک کا نام پتہ اور بیماری کا حال پوری طرح سے معلوم کر لیا۔ البتہ جس ڈاکٹر کا وہ علاج کر رہے تھے۔ اُس کا پتہ اور نام نہ معلوم ہو سکا۔ ورنہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اُس سے جا کر ان کے مرض کے متعلق دریافت کرونگا کہ آیا سخت ہے یا یونہی سا ہے۔

شام کے وقت جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تو میں اُن کے مکان کو تلاش کر کے اُس کے آس پاس جا کر اس طرح منڈلانے لگا کہ آیندہ وہ ندیں سے کوئی میرے اوپر شک نہ کرے۔ اُس کمبخت داماد کی طرف سے البتہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ مگر کوئی اہم بات نہ معلوم ہو سکی۔ اُس روز سے میرے یہ مشغلے بن ڈیوٹی ہو گئی۔ صبح کو دفتر کی دیوار کے اوپر سے جھانکنا۔ اور شام کو اُن کے مکان کے گرد طواف کرنا۔ حیرت تو یہ تھی کہ ان کے مکان کے اندر ایسا سناٹا تھا کہ نہ تو کسی کے بولنے کی آواز آتی تھی اور نہ رونے کی۔ گھر کے اندر سے کچھ آدمی نکلتے ضرور تھے۔ مگر ان کے چہرے اور دوسری حرکات سے کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ اور نہ اُن کے ہاتھوں میں دواؤں کی شیشیاں ہوتی تھیں۔ اس لئے میری اُلجھن بڑھتی جاتی تھی۔ اُن کے مکان کے قریب لے دے کے صرف ایک بنئے کی دوکان ہی تھی۔ جہاں گاہکوں کی اتنی کثرت رہتی تھی کہ کچھ پوچھتے ڈرتے جھجکتا تھا۔

ایک شام کو سڑک کی لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک درخت کے نیچے ٹھیک اُن کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا میں حسب معمول جاسوسی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشتر اس کے کہ میں مڑوں نو وارد نے سلسلۂ کلام بھی جاری کر دیا۔

"کہئے آپ کی گھڑی مل گئی؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ کیونکہ یہ شخص وہی تھا جس کو سامنا میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"جی۔ جی میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے میں نے اپنی گردن کو نفی میں ہلا دیا۔

"وہ مجھ کو دیکھ کر بھاگنے کیوں لگا تھا؟

میں اُن کے اس سوال پر قہقہہ مار کر ہنسا تاکہ اس دوران میں مجھے اُن کے اس بے ڈھنگے سوال کا جواب سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت مل جائے۔ اس کے بعد میں نے جواب دیا کہ میں نے اُس کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم میری گھڑی

واپس نہ دوگے تو میں تمہیں اپنے دوست سے جو خفیہ پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہیں حوالہ کر دونگا +

"قہ قہ قہ" وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے +

"کہئے آپ کے قسر کا کیا مزاج ہے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر سوال کیا +

"اللہ مالک ہے" اُنہوں نے اس مایوسی سے کہا کہ میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی جسے شکر ہے خدا کا کہ اُنہوں نے دیکھا نہیں +

"اچھا آداب عرض ہے" کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا +

میرا اس طرح بے موقع کھڑے ہو کر ایسے غیر مناسب وقت پر عین اُن کے مکان کے سامنے جاسوسی کرنا بادی النظر میں ہر شریف شخص کو اشتباہ دلا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اُس دن سے ارادہ کر دیا کہ اب اُس طرف نہ جاؤنگا۔ مگر دو روز تک تو اس عہد پر قایم رہا۔ مگر تیسرے روز طبیعت نہ مانی۔ اپنی خالی جیب اور خالی پیٹ کو جس میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ دیکھ کر ہم کو پھر اضطراب ہؤا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ہم کشاں کشاں پھر اُس طرف چلے۔ جب ہم اُس محلے میں پہنچے تو کچھ عورتوں کے روتے پیٹنے کی آواز ہمارے کان میں آئی۔ جوں جوں ہم اُن کے مکان کے قریب پہنچتے جاتے تھے۔ ووں ووں ان آوازوں کا شور بھی بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے ہیں تو معلوم ہوا کہ سارا مکان عورتوں سے بھرا ہؤا ہے جو گریہ وبکا اور آہ و زاری میں ہمہ تن مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ اندر روشنی بھی زیادہ تھی۔ اور کبھی کبھی دو ایک مردوں کی بھاری چیخوں اور آہوں کی آواز بھی عورتوں کی باریک آوازوں میں ملی جلی سنائی دیتی تھی۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ آج وہ بڈھا چل بسا ــــــ ادھر ہمارے کانوں میں یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ اور اُدھر ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے اُٹھ رہے تھے۔ ہم خود کو دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک دفتر میں کونے کی میز پر بیٹھے ہوئے چپراسیوں پر حکم چلا رہے ہیں۔ یہ نہ خیال کیا کہ شاید کوئی ہمسایہ ہی مر گیا ہو۔ یا باہر سے کسی کے مرنے کی خبر آئی ہو۔ یا کوئی مجلس عزا ہی ہو رہی ہو +

ہم نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے وہاں سے بے تحاشہ بھاگے اور راستہ میں سے عرضی لکھنے کا کاغذ خریدتے ہوئے گھر پہنچے۔ اُسیوقت ہم نے ایک عرضی اُس دفتر کے بڑے افسر کے نام لکھی۔ جس میں جگہ خالی ہونے کا مکمل ثبوت دینے کے لئے ہم نے متوفی کلرک کا نام اور اُس کی موت کا واقعہ بھی تحریر کر دیا۔ آخر میں اپنی لیاقت۔ غربت اور شرافت کا احوال لکھ کر اُن سرٹیفکیٹوں کو بھی نتھی کر دیا جو ہم کو ایسے آدمیوں سے مل گئے تھے جنہوں نے ہم کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا +

جس طرح شمع پروانوں کو کھینچتی ہے اسیطرح نوکری نوکروں کو اپنی طرف گھسیٹتی ہے۔ اسی خیال سے میں وہ عرضی لے کر جلد از جلد دفتر پہنچ گیا۔ تاکہ دوسرے درخواست کرنے والوں سے میرا نمبر اوّل ہی رہے +

"آج تو جگہ خالی ہے" کہہ کر میں دفتر میں داخل ہو گیا۔ اور سامنے بیٹھے ہوئے کلرک سے اس امر کی بابت استفسا

کرنے لگا :-

"آخر روز روز پوچھنے سے کیا فائدہ۔ جگہ کا خالی ہونا آسان نہیں ہے" اس نے تیز لہجہ میں جواب دیا۔

واقعی ہم کو اس وقت بہت غصّہ آیا کہ یہ کیسا دفتر ہے جس میں کلرکوں کی موت اور پیدائش کی خبر تک نہیں آتی۔ مگر ہم غصّہ کو محض اس خیال سے پی گئے کہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم کلرک نے مرنے سے قبل اطلاع نہ کرائی ہو۔ یا انہوں نے اس امر کی وصیّت کی ہو۔ اور کسی نے ابھی تک تعمیل نہ کی ہو +

"جناب آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کل ہی جگہ خالی ہوئی ہے؟"

"کس کی؟"

"اُن صاحب کی جو وہاں کونے میں بیٹھے کھانسا کرتے تھے +

"کون! رحمت علی صاحب"

"جی ہاں"

"کیوں! کیا انہوں نے استعفیٰ دیدیا؟"

"نہیں بلا استعفیٰ اور بغیر نوٹس"+

"کیسے؟"

"کل اُن کا انتقال ہو گیا"+

"ارے!! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"واقعہ عرض کرتا ہوں۔ میرے سامنے ہی اُن کا انتقال ہوا ہے"

"افسوس۔ انا للہ۔ ہاہ"+

"یہ عرضی حاضر ہے۔"

"جناب میں عرضی ورضی نہیں لے سکتا۔ ایسا ہی ہے تو آپ بڑے بابو صاحب کے دفتر میں بیٹھئے"

"بہتر ہے۔ بتا دیجئے کہاں؟"

اُس کلرک پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ بہرحال ہماری مروّت سے وہ ہمیں ہیڈ کلرک کے دفتر میں لے گیا۔ اور وہاں کرسی پہ لے جا کر بٹھا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اُس دفتر کے ناخدا تشریف لائے۔ جن کے سامنے میں نے اپنی عرضی بصد ادب رکھ دی۔ عرضی پڑھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ پوری ختم کر لینے کے بعد کرسی پر دراز ہو کر میری طرف مخاطب ہو گئے :-

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ رحمت علی صاحب کا انتقال ہو گیا"+

"وہ سخت بیمار تھے"+

"خوب۔ اُن کی بیماری سے آپ نے نتیجہ نکال لیا۔ کہ وہ مر گئے" +

"نہیں جناب کل اُن کے گھر میں بہت زبردست رونا پیٹنا ہو رہا تھا"۔

"اچھا۔ تب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ افسوس۔ رحمت علی بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے اُن کی یاد میں اس دفتر کو آج بند کرنا پڑیگا۔ اس لئے آپ کل تشریف لائیگا۔ میں آپ کی عرضی رکھے لیتا ہوں"۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ" کہہ کر میں اُٹھا ہی تھا کہ اُنہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے روک کر مجھے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔

"دیکھئے میں آپ کا معاملہ ابھی طے کئے دیتا ہوں"

اُنہوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی "جی حضور" کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُنہوں نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ جس کو سُن کر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں چلمن ہٹی اور وہی نوجوان بابو اندر داخل ہوا۔ جس نے میری یہاں تک رہبری کی تھی۔ وہ مجھ کو دیکھ کر گھورنے لگا۔ اور کچھ کہے بغیر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اُس متوفی کلرک کا داماد داخل ہوا جسے دیکھ کر میں ذرا گھبرا گیا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چک پھر ہٹی۔ اور اس مرتبہ وہ شخص داخل ہوا۔ جسے دیکھ کر میں "ہائیں" کہہ کر بے اختیار اُچھلا اور پھر دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ ارے یہ تو وہی بڈھا کلرک تھا جس کو میں مُردہ خیال کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور جس کے ماتم کی آوازیں میں خود اپنے کانوں سے سُن کر آیا تھا ــــ اگر کہیں تنہائی میں ملاقات ہوتی تو میں اُس کو روح کا مجسمہ خیال کر کے ڈر سے آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر یہاں تو اس کا امکان ہی نہ تھا۔ کیونکہ پہلے کی نسبت وہ کافی تندرست تھا۔ میرا بند بند کانپنے لگا۔ آنکھوں کے پیچھے اندھیرا چھا گیا۔ سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ اُٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر پیر من من بھر کے وزنی معلوم ہوتے تھے۔ ایک تو نوکری نہ ملنے کی نا اُمیدی اور دوسرے اس بھرے دفتر کی ندامت۔ یا الٰہی کس میں طاقت ہے کہ ان دو مصیبتوں کو اُٹھائے۔ بہرحال گردن جھکائے۔ آنکھیں نیچی کئے میں کرسی پر بیٹھا ہی رہا۔ یہاں تک کہ سارا کمرہ بابوؤں سے بھر گیا۔

"رحمت علی صاحب!" ہیڈ کلرک نے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں آپ کو غسل صحت پر مبارکباد دیتا ہوں۔" اُنہوں نے اُٹھ کر اُن سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میری طرف رُخ کر کے کہا۔ "دیکھئے آپ سے ملئے۔ بس آپ کے دیدہ مشتاق ہیں۔ خاص آپ ہی کے لئے تشریف لائے ہیں۔" قہقہہ کے ساتھ کہا۔ وہ میری طرف بڑھے مجھ کو بہ مجبوری کرسی چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اُن کی طرف بڑھایا۔ اُنہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لیا۔ کچھ الفاظ کہے۔ مگر میں جلدی سے فوراً چک ہٹا کر باہر نکل آیا۔ اور سر پر پیر رکھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ میرے پیچھے قہقہے۔ ہنسی۔ غل شور اور ایک ہنگامہ ایک غلغلہ تھا۔

سید ابو طاہر داؤد

ڈراما:-

گوہر پوش نازنیں

آسکر وائلڈ کے ایک ناتمام ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ اناطول فرانس کے ڈرامے "تائیس" سے ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ آسکر وائلڈ کے اپنے خاص انداز میں ہے +

اشخاص

دو آدمی

(۱) مرہینہ

(۲) ہنوریس

منظر

ایک وادی کے ایک گوشہ میں کھلتا ہے۔ سٹیج کے دائیں طرف ایک غار ہے غار کے دروازے کے سامنے ایک بڑی سی صلیب گڑی ہے۔ بائیں طرف ریت کے تودے ہیں۔

آسمان نیلا ہے۔ کہیں کہیں پہاڑی پر کانٹوں کی جھاڑیاں ہیں +

پہلا آدمی۔ وہ کون ہے؟ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا چغہ ارغوانی اور بال سونے کے تاروں جیسے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ ضرور وہ بادشاہ سلامت کی لڑکی ہے۔ ملاحوں سے اکثر سنا ہے کہ بادشاہ سلامت کی ایک لڑکی ارغوانی چغہ پہنتی ہے +

دوسرا آدمی۔ اس کی جوتی پر طائروں کے پر لگے ہیں۔ اور کرتی کا رنگ سبز اناج کے رنگ کا سا ہے جب ٹھہرتی ہے۔ تو بہار کے اناج کی طرح نظر آتی ہے۔ مگر جب چلتی ہے۔ تو اس اناج سے ملتی ہے جسکو شکروں کا سایہ مضطر کر دیتا ہے۔ اس کی کرتی کے موتی بے شمار چاندوں کی طرح دمکتے ہیں +

پہلا آدمی۔ وہ ان چاندوں سے ملتے ہیں جو پانی میں اس وقت نظر آتے ہیں۔ جب باد شمال چلتی ہے +

دوسرا آدمی۔ میرے خیال میں کوئی دیوی ہے۔ نوبیہ سے آئی ہے +

پہلا آدمی۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی لڑکی ہے۔ اس کے ناخنوں پر حنا لگی ہے۔ جن سے گلاب کی پنکھڑیاں شرماتی ہیں۔ یہاں وہ اڈانس کی موت پر رونے آئی ہے +

دوسرا آدمی۔ وہ دیوی ہے۔ خدا جانے اُس نے اپنا مندر کیوں چھوڑا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو اپنا مندر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اگر وہ ہم سے ہم کلام ہونا چاہے تو ہمیں جواب نہیں دینا چاہیئے۔ وہ پاس سے گذر جائے گی +

پہلا آدمی۔ وہ ہم سے بات نہیں کرے گی۔ وہ بادشاہ سلامت کی لڑکی ہے +

مربینہ۔ کیا وہ حسین راہب جو عورت کے چہرے پر نظر نہیں کرتا۔ یہاں نہیں رہتا؟

پہلا آدمی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ یہیں رہتا ہے +

مربینہ۔ وہ کیوں عورت کے چہرے پر نظر نہیں کرتا؟

پہلا آدمی۔ ہم نہیں جانتے +

مربینہ۔ تم خود بھی میری طرف کیوں نہیں دیکھتے؟

پہلا آدمی۔ تو جواہرات سے لدی ہوئی ہے۔ ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں +

دوسرا آدمی۔ جو سورج کی طرف دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا ہے تیری جگمگاہٹ دیکھی نہیں جاتی۔ زیادہ چمکیلی چیزوں کو دیکھنا عقلمندی نہیں۔ مندروں کے اکثر پجاری اندھے ہوتے ہیں۔ اور راستہ دکھانے کے لئے خادم رکھتے ہیں +

مربینہ۔ حسین راہب جو عورت کے چہرے پر نظر نہیں کرتا کہاں رہتا ہے۔ گھاس پھوس کی کٹیا ہے۔ یا سوختہ مٹی کی۔ پہاڑی کی ترائی میں پڑا رہتا ہے۔ یا جھاڑیوں میں؟

پہلا آدمی۔ وہ سامنے والی غار میں رہتا ہے +

مربینہ۔ یہ بھی رہنے کی عجیب جگہ ہے +

پہلا آدمی۔ پہلے یہاں ایک غول رہا کرتا تھا۔ جب راہب آیا تو اُس نے ایک چیخ ماری رویا پیٹا اور پھر فرار ہو گیا۔

دوسرا آدمی۔ نہیں یہاں ایک بھوت رہا کرتا تھا۔ جب اُس نے ایک راہب کو آتے دیکھا تو وہ سجدے میں گر پڑا۔ اور اُس کی پوجا کرنے لگا۔ بہت آدمیوں نے اُسے پوجا کرتے دیکھا +

پہلا آدمی۔ ان آدمیوں سے جنہوں نے اسے دیکھا تھا میری بات چیت ہوئی ہے +

دوسرا آدمی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لکڑہارا تھا۔ اور محنت مزدوری کیا کرتا تھا۔ لیکن ممکن ہے یہ بات درست نہ ہو +

پردوں سے چاندی کے انار لٹکے ہوتے ہیں۔ چاندی کی سیڑھیوں پر ارغوان اور لوبان بکھرا ہوا ہے۔ میرے عشاق میرے قصر کے ستونوں سے پھولوں کے ہار باندھتے ہیں۔ پردۂ شب میں نَے نوازوں اور رباب بجانے والوں کو لے کر آتے ہیں۔ اور میری خلوت میں سیب پھینکتے ہیں۔ میرے احاطہ کے فرش پر میرا نام شراب سے لکھتے ہیں +

دنیا کے بعید ترین کناروں سے میرے عشاق کھنچے آتے ہیں۔ شاہانِ ارض میرے پاس آتے ہیں اور تحائف لاتے ہیں +

جب شہنشاہ بزنطین نے میرے حسن کی شہرت سنی تو وہ اپنے سماقی ایوان کو الوداع کہتا کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ اس کے ملازموں کے پاس مشعلیں نہ تھیں تاکہ اس کی آمد کی خبر کسی کو نہ ہو +

جب شاہِ قبرص کے کانوں میں میری خبر پہنچی۔ تو اُس نے اپنے ایلچی میرے پاس بھیجے +

لیبیا کے دو شہزادے جو بھائی بھائی ہیں۔ میرے لئے عنبر کے تحفے لائے +

میں نے قیصر سے قیصر کے غلام کو چھین لیا۔ اور اُسے اپنا ندیم بنا لیا۔ ایک ڈونگی میں یہاں پہنچا تھا۔ اُس کا رنگ نرگس کی طرح زرد اور بدن شہد کا سا تھا +

پیفلیگ کے لڑکے نے میرے ناموس پر اپنی جان قربان کر دی۔ اور سلیشیا کے سردار نے محض میری خوشی کے لئے میرے غلاموں کے روبرو اپنے تئیں ہلاک کر دیا +

ہیراپولس کے بادشاہ نے جو پروہت بھی ہے اور راہزن بھی میرے چلنے کے لئے راستہ میں قالین بچھائے۔ کبھی کبھی میں پنڈال میں جا بیٹھتی ہوں۔ جانباز میرے سامنے جنگ آزمائی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک طریسی جو میرا عاشق تھا۔ دام میں آیا۔ میں نے اُسے مرنے کا اشارہ کیا تمام پنڈال تعریف کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ کبھی کبھی میں اکھاڑے کے پاس سے گذرتی ہوں۔ اور جوانوں کو کشتی لڑتے یا دوڑتے دیکھتی ہوں۔ اُن کے بدن تیل سے چمکتے ہیں اُن کی پیشانیوں پر بید مجنوں اور عشق پیچاں کی شاخیں گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ کشتی لڑتے وقت اپنے بدن پر مٹی مل دیتے ہیں۔ اور جب وہ دوڑتے ہیں ریت اُن کے پیچھے ننھے ننھے بادلوں کی شکل میں اُڑتی ہے۔ جس جوان پر مسکرا کر میں نگاہ ڈالتی ہوں وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر میرے عقب میں میرے گھر کی سمت چل پڑتا ہے +

میں بندرگاہ پر جاتی ہوں۔ اور سوداگروں کو جہاز پر سے مال اُتارتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ جو صور سے آتے ہیں۔ اُن کے چغے ریشمین ہوتے ہیں اور کانوں میں زمرد کے آویزے پہنے ہوتے ہیں۔ جو مسلیہ سے آتے ہیں۔ اُن کے چغے پشمین اور اُن کے کانوں میں پیتل کے آویزے ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر جہازوں سے آوازیں دیتے ہیں۔ مگر میں جواب نہیں دیتی +

میں چھوٹے چھوٹے میخانوں میں جاتی ہوں۔ جہاں ملاح تمام دن آبِ سیاہ کے جام پر جام چڑھاتے ہیں،

اور جُوا کھیلتے ہیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ جاتی ہوں +

میں نے شہزادے کو اپنا غلام اور اُس کے غلام کو کامل ایک مہینے تک اپنا آتش بنائے رکھا +

میں نے اُس کی انگلی میں مصوّر انگوٹھی پہنائی اور اپنے مکان پر لے آئی۔ میرے مکان میں عجیب چیزیں ہیں +

تمہارے بالوں میں ویرانے کی خاک دھول پڑی ہے۔ تمہارے پاؤں کانٹوں سے مجروح ہیں۔ تمہارا بدن تمازت آفتاب سے جھلسا ہُوا ہے۔ ہنورئیس! آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو ریشمی لباس پہناؤں گی اور تمہارے جسم پر اُبٹنے ملونگی۔ تمہارے سر میں ہار سنگھار کا تیل ڈالوں گی تمہیں بستر میں چھپا دونگی اور تمہارے ہونٹوں پر شہد ٹپکاؤں گی۔ . . . . محبّت . . . .

ہنورئیس۔ خدا کی محبّت کے سوا کوئی محبت نہیں +

مرہلینہ۔ فانی انسان کی محبّت سے کون ہے جس کی محبّت بڑی ہے +

ہنورئیس۔ مرہلینہ! جسم شریر ہے۔ خدا کی محبّت کے سوا اور کوئی محبّت نہیں۔ کوئی محبّت اس سے لگّا نہیں کھا سکتی۔ خدا تجھے ایک نیا جسم عطا کریگا۔ جسے فنا نہیں۔ اور تو اُس کے حضور میں باریاب ہوگی

مرہلینہ۔ حسین . . . . .

ہنورئیس۔ رُوح کا حُسن بڑھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خدا کو دیکھنے لگتی ہے۔ اس لئے مرہلینہ گناہوں سے توبہ کر۔ [غار کے اندر چلا جاتا ہے]

مرہلینہ۔ کتنی عجیب باتیں تھیں۔ اس نے مجھے کس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی عجیب باتیں اس نے کیوں کیں؟

ہنورئیس۔ مرہلینہ میری آنکھوں کا پردہ اُٹھ گیا۔ جو پہلے نظر نہیں آتا تھا اب صاف دیکھ رہا ہوں۔ چل مجھے سکندریہ لے چل اور مجھے گناہ کا مزہ چکھا +

مرہلینہ۔ ہنورئیس۔ میری ہنسی نہ اُڑا۔ اب یہ تلخ باتیں مجھ سے نہ کہہ۔ میں گناہ سے منہ پھیر چکی ہوں اس ویرانے میں اپنے لئے کوئی غار تلاش کر رہی ہوں۔ جہاں رہ کر میں بھی اپنی روح کو جلوہ حق کے قابل بنا سکوں +

ہنورئیس۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ مرہلینہ مجھے سکندریہ لے چل +

مرہلینہ۔ میں سکندریہ نہیں جاؤں گی +

ہنورئیس۔ الوداع مرہلینہ +

مرہلینہ۔ ہنورئیس۔ الوداع۔ نہیں نہیں۔ ٹھہر۔ مت جا۔ . . . لعنت میرے حسن پر۔ لعنت میرے

نگہ فریب جسم پر۔ جو تجھ پہ مصیبت لایا ہے۔ اے خدا اس شخص نے مجھے تیری راہ دکھائی۔ اس نے مجھے تیرے جلوے سے روشناس کیا +

ہنلوزئیس ۔ مرہیلینہ تو تو بچّوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ تو بے وقوف ہے۔ مجھے چھوڑ دے۔ اس وادی میں تو اپنا حسن کیوں لائی +

مرہیلینہ ۔ جس خدا کی تو عبادت کرتا ہے اُسی نے مجھے یہاں بھیجا۔ تاکہ اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور اُسے پہچانوں +

ہنلوزئیس ۔ اپنی آتش کلامی سے تو نے مجھے کیوں ورغلایا +

مرہیلینہ ۔ تاکہ تو گناہ کو اپنی تمام جھوٹی رنگ آمیزیوں میں دیکھ سکے ۔ اور موت کا اپنی تمام ذلتوں کے لباس میں نظارہ کر سکے +

(ترجمہ) روشن دین پلیڈر

شخصیات:۔

ضیغمِ ترکی مصطفیٰ کمال

ایک انگریز سیاح کی رائے

مترجمہ جناب خلیل بی۔ اے۔ لاہور

میں قسطنطنیہ کے ایک ہوٹل میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ کہ دو ترکی افسر اپنے بوٹ کی ایڑیوں کو جھنکارتے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ اور مجھ سے ہمکلام ہوئے:۔

"تم انگریز ہو؟۔ انگلش قول؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سمرنا سے تم آج یہاں پہنچے ہو؟"

"ہاں!"

"—— اور تم چودہ دن تک یہاں قیام کرو گے؟"

میں نے ہنسکر جواب دیا۔ "تم تو میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو؟"

لیکن اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تک بھی نمودار نہ ہوئی۔

"تمہارے لئے یہ اشد ضروری ہوگا کہ ہر روز پولیس تھانہ میں جاکر اپنی حاضری کی اطلاع دو۔ ورنہ تمہارا پاسپورٹ منسوخ کر دیا جائیگا۔"

میں نے کچھ عذر کرنا شروع کیا۔

"لیکن یہ کس کے حکم سے ——"

"مصطفیٰ کمال پاشا کے حکم سے —— ترکی ڈکٹیٹر"

یہ کہہ کر دونوں افسر اپنے جوتوں کی ایڑیوں کو جھنکارتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ترکی میں پہنچکر میرا اسطرح تعارف ہوا۔ میں ہر روز پولیس تھانہ میں جا کر اطلاع دیا کرتا۔ امر واقعہ یوں ہے کہ انگریزوں کے متعلق ترکوں کی رائے نہایت مایوس کن ہے۔ وہ لوگ فرنگیوں کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں

پورا یقین ہے کہ ہم لوگ اُن کے خلاف یونانیوں کے دست و بازو بنے رہے ہیں +

ترکی کا دورِ جدید ایک ایسا واقعہ ہے جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ محسوس کیا ہے۔ اور اس انقلاب کے استوار کا انحصار صرف ایک شخص پر ہے +

میں نے ترکی کی گلیوں میں دیکھا کہ عوام الناس انگریزی ٹوپی پہنے پھرتے ہیں +

میں نے ایک شخص سے پوچھا:-

"وہ سرخ ٹوپی کیا ہوئی؟"

"پہننے کی ممانعت ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کی سزا موت ہے" +

"یہ کس کا حکم ہے؟"

"مصطفیٰ کمال"

ترکی عورتوں کو بے نقاب دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

"عورتوں کا پردہ کیا ہوا؟" میں نے دوسرے راہگیر سے پوچھا +

"مصطفیٰ کمال نے اُڑا دیا ہے"

میں درویشوں کا مذہبی رقص دیکھنا چاہتا تھا لیکن میرے راہنما نے مجھے بتایا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے حکم سے ہر قسم کا مذہبی ناچ ممنوع ہو چکا ہے۔ حکم عدولی کی سزا موت ہے +

میں جس دکان میں گیا سب سے پہلے ایک شخص کی تصویر نظر پڑی جس کے بال خوبصورت تھے۔ آنکھیں نیلگوں اور تجسس آمیز تھیں۔ وہ حسین تھا لیکن تندی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی +

"یہ کون شخص ہے؟" میں نے ایک دوکاندار سے پوچھا +

"غازی مصطفیٰ کمال"

میرا خیال ہے کہ دنیا کے اس دور میں وہ جملہ ڈکٹیٹروں میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ وہ اپنے غیر فانی دبدبے اور شوکت سے لیکن تلوار کی دھار پر ایک ایسا انقلاب برپا کرتا ہے جس سے ہمیں اوراقِ پارینہ کے پلٹنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنگیز خاں اور تیمور کے خون آشام کارنامے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ قوم کی درخواست اس پر مطلق اثر نہیں کر سکتی۔ اس کے نزدیک موت بہترین علاج ہے +

زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اس کے ایک عمیق ترین دوست کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ جب مصطفیٰ کمال سلطان کے خلاف جنگ میں مصروف تھا تو یہ شخص اس کے دوش بدوش لڑ رہا تھا۔ اور بسا اوقات اس نے مصطفیٰ کمال پر اپنی جان قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا تھا۔ فراری کے وقت بھی یہ دونوں اکٹھے تھے۔ لیکن دستخط کرتے وقت اس کے ماتھے پر بل نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ منہ سے نکال کر دستخط کر دیئے۔ گویا ایک نہایت معمولی فیصلہ اس نے صادر کیا +

یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ سالونیکا کے کسانوں میں سے نکل کر وہ کس طرح ترکی کا حاکم علی الاطلاق ہوگیا۔ ایک فوجی مدرسہ میں اس نے اپنی زندگی کی ابتدا کی جہاں سے نکل کر وہ ایک خفیہ انقلابی جماعت میں شامل ہوگیا +

مصطفیٰ کمال کے رفقا بھی اس سے کانپتے تھے۔ اور دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شطرنج کا ایسا مہرہ تھا جو ہر ایک کی بازی کو مات کر دیتا تھا۔ اور کسی کو آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ جب وہ کلام کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ لوہے پر تیزاب گر رہا ہے۔ حکام بھی اس خطرناک آدمی کو بھانپ گئے۔ اور انہوں نے اس کو ایک فوج کے ساتھ بلگیریا کی طرف بھیج دیا۔ اس سے باقی سازش کنندوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اپنے وطن کی جدائی میں اسے بہت صدمہ ہوا۔ وہ لہو کے گھونٹ پی رہا تھا۔

. . . . وہ جلاوطنی کے ایام اسی خیال میں نہایت مایوسی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب جنگِ عظیم برپا ہوئی تو مصطفیٰ کمال کو واپس بلا لیا گیا رنج و الم اور بیماری کی وجہ سے وہ ایک مشت استخوان سے زیادہ نہ تھا جب وہ قسطنطنیہ میں دوبارہ داخل ہوا شاندار کامیابی اس کے سر پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گیلی پولی میں وہ انگریزی فوج کے مقابلہ میں لڑ رہا تھا +

وہ جرمن کمانڈروں سے ان میں برطانیہ پر نظر رکھتا۔ مشغول رہا تھا۔ اور جرمن کمانڈر کو بھی اس کی صناعی اور غیر معمولی حربی ذہانت کا اعتراف تھا +

اس کے سپاہی جب خندقوں میں کھانے بیٹھنے اور سونے میں مصروف ہوتے تھے تو مصطفیٰ کمال کی طباعی اس وقت مصروف کار ہوتی تھی۔ وہ اپنی بیماری کو بھول چکا تھا اور بھوکے شیر کی طرح اپنے سپاہیوں کو لے کر انگریزی سپاہ پر لپک کر جا گرتا تھا۔ اس کے حملے نہایت خطرناک ہوتے تھے +

وہ ایک نہایت دلکش زندگی کا مالک ہے۔ جب جہازوں سے ہم اس کے کیمپ کے نزدیک آکر بیٹھے اور طیارے چیلوں کی طرح اس کے سر پر منڈلا رہے تھے تو وہ سگریٹ منہ میں اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے دشمن پر منظر استہزا ہنس رہا تھا۔ اس کے نزدیک خطرہ ایک بے معنی سا لفظ ہے +

وہ کامیاب رہا۔ انگریزوں کو گیلی پولی چھوڑتے ہی بنی۔ جب وہ قسطنطنیہ کو لوٹا تو کامرانی کا سہرا اس کے سر تھا۔ اس کی شجاعت کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ ترکی میں مشہور ہیرو خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لئے اسے شام کی سرحد پر بھیجا گیا۔ جہاں ترک انگریزوں کے ساتھ مصروفِ جنگ تھے۔ اور انگریزوں کے بے پناہ حملوں سے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے +

ایک دفعہ پھر مصطفیٰ کمال دیوانہ وار جنگ میں مصروف ہوگیا۔ اور بکھری ہوئی فوج کو یکجا جمع کیا۔ اپنی فوج کے ڈرپوک اور بھاگنے والے سپاہیوں کو اپنے ہاتھ سے بندوق کا نشانہ بنایا۔ اور اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو پہاڑی

کے سامنے ایسی جگہ پر جما دیا۔ کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی متحدہ طاقت اس کو اس جگہ سے نہ ہلا سکی +

اس کی شہرت نہ صرف اپنے ملک میں تھی۔ بلکہ دشمن سے بھی وہ خراجِ تحسین حاصل کرتا تھا۔ اس کامیابی پر حکام بالا کو خدشہ ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ اس خطرناک انسان سے مخلصی پانی چاہئے۔ چنانچہ اسے نہایت خطرناک مہمات پر بھیجا گیا +

لیکن اس کی قسمت کا ستارہ اوج پر تھا۔ جب یونانیوں نے ترکی پر حملہ کیا تو مصطفیٰ کمال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُسے فوراً بلوایا گیا۔ تاکہ وہ یونانیوں کو اپنی غیر معمولی لیاقت سے شکست دے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ یونانیوں کو دھکیلتا ہوا بحیرۂ روم تک لے گیا۔ فاتح سپہ سالار سمرنا کی پہاڑیوں پر کھڑا ہوا قلعہ کو نذرِ آتش ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ یونانیوں نے بھاگنے سے پہلے قلعہ کو آگ لگا دی تھی۔ اور انگریزوں کے شکست خوردہ سپاہی ملکہ الزبتھ جہاز میں ایک میل پرے کھڑے ہوئے حسرت آمیز نگاہوں سے ترکی کا دورِ جدید دیکھ رہے تھے +

سمرنا کی پہاڑیوں پر ایک تاجر کے مکان میں مصطفیٰ کمال کی محبت کی زندگی معرضِ وجود میں آئی۔ مصطفیٰ کمال اس سے دیوانہ وار محبت کرنے لگا۔ اور وہ لڑکی بھی اس پر جان دینے لگی۔ لڑکی کا نام لطیفہ تھا۔ جو عمر میں مصطفیٰ کمال سے بہت چھوٹی تھی +

مصطفیٰ کمال نے حلف اُٹھا لیا۔ کہ جبتک وہ اپنے ملک کی حیاتِ تازہ نہ دیکھے گا۔ ہرگز شادی نہ کرے گا۔ لطیفہ بھی اس رائے سے متفق تھی۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال وہاں سے رخصت ہوا +

چند ماہ بعد وہ اچانک داخل ہوا۔ اور لطیفہ سے کہنے لگا۔ "آدھ گھنٹہ میں تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں"+

دوسرے دن ترکی کو معلوم ہو گیا کہ مصطفیٰ کمال نے شادی کر لی ہے +

مصطفیٰ کمال نے اپنے ذاتی جوہر سے کس طرح حکومت حاصل کی یہ ایک طویل قصہ ہے۔ مسٹر آرمسٹرانگ نے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک کسان کے لڑکے نے عروج حاصل کیا۔ اور کس طرح ایک لڑکی سے محبت کی اور پھر اسے طلاق دی۔ اور پھر کس طرح ایک دوسری عورت اس کی محبت میں انگورا کی گلیوں میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔ اور بالآخر اس نے کس طرح سلطان عبدالمجید کو ہمیشہ کے لئے ترکی سے جلاوطن کر دیا +

"آج مصطفیٰ کمال کی عمر اکاون سال ہے۔" مسٹر آرمسٹرانگ لکھتا ہے۔ "وہ چانکایا میں ایک معمولی سے گاؤں میں شاہانہ دماغ لئے ہوئے رہتا ہے۔ چاک اور تختہ سیاہ آجکل اس کے بڑے ہتھیار ہیں۔ تنہا انسان جس کا کوئی دوست نہیں اپنا کنبہ نہیں۔ اولاد نہیں۔ اُس نے ترکی کے تمام لوگوں کو اپنی طاقت اور جائداد کا وارث قرار دیا ہے۔ وہ ایک لاثانی ڈکٹیٹر ہے کہ ترکی میں دوبارہ کسی ڈکٹیٹر کا ہونا ناممکن ہو گیا ہے +

لدّاخ اور بلتستان

لدّاخ

(از جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے لاہور)

سرینگر سے تیرہ میل کے فاصلے پر نالہ سندھ کے کنارے ایک پُرفضا سرسبز میدان میں گاندربل کا مقام ہے جون جولائی اور اگست میں یہاں خوب رونق رہتی ہے۔ سرینگر میں موسم نسبتاً گرم ہو جانے کی وجہ سے سیّاح ہوس بوٹ لے کر یہاں آجاتے ہیں۔ اور چند روز نالہ سندھ کے سرد اور شفاف پانی کی روانی کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ قدیم تجارتی شاہراہ جو سرینگر سے لدّاخ میں سے ہوتی ہوئی وسط ایشیا کو چلی جاتی ہے۔ گاندربل کے قریب سے گذرتی ہے۔ گاندربل سے چند میل ورٹلو کے مقام پر ایک آہنی پل کے ذریعہ سے نالہ سندھ کو عبور کر کے یہ سڑک ایک خوشنما سرسبز اور شاداب وادی میں داخل ہوتی ہے۔ وادی سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ ورٹلو کے پل تک موٹر اور ٹانگہ وغیرہ چل سکتا ہے۔ مگر اس سے آگے صرف گھوڑوں کا راستہ ہے۔ گاندربل سے ورٹلو کو جاتے ہوئے دائیں جانب دامنِ کوہ میں ایک بلند وسیع کریوہ[1] پر یاغستانی پٹھانوں کی آبادی ہے۔ جو عرصہ سے یہاں آباد ہیں۔ وادی سندھ کا طول گاندربل سے بالتل تک قریباً پچاس میل ہے۔ مگر اس کی وسعت بہت کم ہے۔ درمیان میں سندھ کا شفاف چمکدار پانی تلاطم انگیز تیزی کیساتھ بہہ رہا ہے۔ اور زمین کی ناہمواری اور پتھروں اور چٹانوں کی وجہ سے اس میں ایک مسلسل شور برپا رہتا ہے۔ دریا کے کنارے کنارے سڑک جا رہی ہے۔ دائیں جانب دلفریب سبز پوش ڈھلوانیں اور کے گنجان درختوں سے ڈھکی ہوئی بلند چوٹیاں ایک دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ بائیں جانب سبز مخملیں گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان پہاڑیوں کے دامن میں اخروٹ سفیدہ اور بید کے سایہ دار درختوں کے جھنڈوں میں دیہاتی آبادی کا ایک سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ان کے سر پر ہرمکھ[2] کی سر بفلک برف پوش چوٹیاں ہمیشہ گھرے رہنے والے بادلوں کے سائے میں ایک نرالی شان دکھا رہی ہیں۔ ہرمکھ ہنود کے عقیدہ میں دیوتاؤں کا مقام ہونے کی وجہ سے متبرک سمجھا جاتا ہے۔ نیز عام خیال ہے کہ جہاں سے یہ چوٹی نظر آتی ہے وہاں سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا۔ اس وادی میں کشمیریوں

[1] کشمیر میں بلند ٹیلے کریوہ کہلاتے ہیں۔ [2] ہرمکھ پہاڑ جس کی بلندی ۱۶۹۰۰ فٹ ہے۔

اور گوجروں کی مخلوط آبادی ہے۔ زیرین حصوں میں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ مگر بالائی مقامات میں گیہوں اور مکی بوئی جاتی ہے۔ گوجر بھینسیں پال کر اُن کا گھی فروخت کرتے ہیں۔ یہ لوگ سرما میں پہاڑ کے دامن میں مکانات میں رہائش رکھتے ہیں۔ گرمیوں میں بلند پہاڑی چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ وادی میں سفر کرنے والے سیاحوں اور سوداگروں کے لئے کنگن اور گنڈ کے مقامات پر لب دریا ریسٹ ہاؤس اور سرائیں بنی ہوئی ہیں کنگن کا ریسٹ ہاؤس بہت فراخ اور آرام دہ ہے۔ اور اُس کے سامنے دریا پار کا کوہستانی منظر بہت دلفریب ہے۔

گنڈ سے چند میل آگے نکل کر وادی کی وسعت گگنہ گیر کے مقام پر بالکل تنگ ہو جاتی ہے۔ یہاں سے دونوں جانب سربفلک پہاڑوں اور گنجان جنگلات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں سیاہ ریچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ مکی کی فصل پکنے پر نیچے آ جاتے ہیں۔ اور فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک مرتبہ جبکہ ستمبر میں میں لداخ سے واپس آ رہا تھا میری موجودگی میں گوجروں نے گگنہ گیر سے چند میل کے فاصلے پر ایک ریچھ کا بچہ گرفتار کیا تھا جو صبح کھیتوں میں پھرتا ہوا پایا گیا۔ گرفتاری کے وقت اس کمسن حیوان کی آزادی کے لئے جدوجہد قابل دید تھی۔ اُس نے چیخوں سے شور مچا رکھا تھا۔ اور چار پانچ آدمی بمشکل اسے سنبھالے ہوئے تھے۔

گگنہ گیر سے آگے ہنگ ستھہ کے قریب جنگلی اخروٹوں کی کثرت ہے۔ اور یہاں کہیں کہیں بندر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اس جگہ تنگیِ وسعت کے باعث راستہ دشوار گذار ہے۔ اور دریا کے حائل ہونے کی وجہ سے پہاڑ کے پہلو کو کاٹ کر سڑک بنائی گئی ہے۔ سردیوں میں برفباری کی کثرت کے باعث ناقابل گذر ہونے کے علاوہ لانیاں گرنے کی وجہ سے خطرناک بھی ہے۔ اس سے آگے تھوڑی دور پر ریزن کی مختصر سی آبادی ہے جو دریا کے کنارہ پر واقع ہے۔ اس کے پاس سے سڑک چکر کاٹتی ہوئی اوپر کو چڑھتی ہے جس کی چوٹی پر پہنچ کر سامنے سرسبز و شاداب میدان میں سونمرگ کا صحت افزا مقام ہے۔ دائیں جانب ایک بلند ٹیلے پر تھجوریس کا پڑاؤ ہے۔ جہاں سیاح گرمیوں میں خیمہ زن ہوتے ہیں۔ سونمرگ قریباً نو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور چاروں طرف سبز پوش سربفلک پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ نظارہ کی دلفریبی ناقابل بیان ہے۔ ایک طرف نشیب میں دریا تلاطم خیز روانی سے بہہ رہا ہے۔ پہاڑوں کے نچلے حصوں کو [illegible] اور [illegible] کے درخت ڈھانپے ہوئے ہیں۔ اور بالائی ڈھلوانیں اور بلند چوٹیاں سبز زمردیں گھاس میں ڈھپی ہوئی ایک عجیب دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تھجوریس کے اوپر سامنے ایک قدیمی گلیشیر یعنی دائمی برف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سونمرگ میں پوسٹ آفس، تار گھر، ریسٹ ہاؤس اور سرائے ہے۔ یہاں دریا کے پار چند ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے گھروں کی مختصر سی آبادی ہے۔ جہاں معمولی خورد و نوش کی اشیاء مل جاتی ہیں۔ موسم بھی ابر آلود رہتا ہے۔ اور تیز اور تند ہوا کے علاوہ اکثر بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔ نیز سرینگر سے یہاں تک پہنچنے میں دیگر مقامات کی مانند موٹر تانگہ وغیرہ کی سواریاں نہیں ہیں۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس جگہ آتے ہیں۔ اور جو یہاں پہنچتے ہیں وہ عموماً یورپین ہی ہوتے ہیں۔ سرما میں اس شدت سے برفباری ہوتی ہے کہ مکانات کے دروازے

بھی پھٹ جاتے ہیں۔ مجھے ایک سال غالباً ۲۶ء میں شروع نومبر میں وہاں جانے کا اتفاق ہُوا تھا۔ برفباری کی وجہ سے سردی کی وہ شدت تھی کہ الامان۔ میں کمرے میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا لکھ رہا تھا۔ مگر قلم کی کاغذ تک لاتے میں سیاہی جم کر رہ جاتی تھی +

سونمرگ سے آگے چار میل کے فاصلے پر سربل کے نواح میں کستورا ایک قسم کا ہرن پایا جاتا ہے جس کے پیٹ سے مشک یعنی کستوری نکلتی ہے۔ جو مشک تتار سے کم درجہ کی اور نسبتاً ارزاں ہوتی ہے۔ سربل سے آگے چل کر بالتل کا پُر فضا مقام ہے۔ جو فلک پیما پہاڑوں سے گھرا ہُوا ہے۔ اس جگہ کوئی آبادی نہیں۔ صرف ریسٹ ہاؤس اور کارواں سرائے ہے۔ دونوں طرف پہاڑی نالے بہہ رہے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے آس پاس بھوج پتر کے درخت ہیں۔ کیونکہ اسقدر سرد اور بلند جگہ کوئی اور درخت نہیں رہ سکتا۔ سامنے ڈاک کے ہرکاروں کی چوکی ہے۔ بائیں ہاتھ کو سامنے تھوڑے فاصلے پر پہاڑ کے پہلو میں پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک اوپر کو چڑھتی نظر آتی ہے۔ جو دامن سے قریباً دو ہزار فٹ کی بلندی پر عبور کرکے بلتستان کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ زوجیلا جیسا کہ اس درے کا نام ہے سطح سمندر سے قریباً ۱۱۵۰۰ فٹ ہے۔ سردیوں میں برفباری کی شدت اور تند ہوا کے بے پناہ طوفان کی وجہ سے راستہ مسدود ہو کر خطرناک ہو جاتا ہے۔ سڑک کا تو نام و نشان برف کی کثرت سے کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس لئے آمد و رفت نالے کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جو پانی کی بالائی سطح کے منجمد ہو جانے کی وجہ سے برف سے پٹ جاتا ہے۔ نومبر میں ہی عموماً گھوڑوں کا چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور دسمبر کے بعد پیدل عبور کرنے کے لئے بھی ہمت نہیں پڑتی۔ ناواقف رہرو ایسے موسم میں اکثر ڈاک کے ہرکاروں کی رہنمائی کا سہارا دیکھتے ہیں جو کہ موقع محل دیکھ کر ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ڈاک عبور کرا دیتے ہیں۔ گاہ بگاہ لانیوں کے گرنے کی وجہ سے حادثات ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سرکاری طور پر بھی سردیوں میں راستہ بند رہتا ہے۔ اور گذرنے والوں کو اپنی ذمہ داری پر انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات وسط ایشیا کے سوداگروں کو موسم کی ناموافقت کی وجہ سے بہت مشکل در پیش آتی ہے۔ جولائی اور اگست میں بھی سڑک پر کئی جگہ برف موجود ہوتی ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ یہی زوجیلا جو سرما میں ہلاکت آفرینی کے لئے خاص شہرت رکھتا ہے۔ گرمیوں میں انواع و اقسام کے رنگ رنگ پھولوں کی وجہ سے رشک گلزار بن جاتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ جو پھول سیاح کو جاتے ہوئے نظر آتے ہیں واپسی پر ان سے بالکل مختلف اقسام کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ زوجیلا کی بلندی پر بجز سوائے بھوج پتر کے کوئی اور درخت نہیں ہے +

بالتل کے اوپر دائیں جانب دس میل دور فلک بوس پہاڑوں کے درمیان ہندوؤں کا مشہور تیرتھ امرناتھ ہے۔ جو سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور شوجی سے منسوب ہے۔ جولائی و اگست میں وہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ سے ہزاروں جاتری وہاں جمع ہوتے ہیں۔ بالتل سے امرناتھ کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور عام لوگ اسلام آباد اور پہل گام کے راستے سے جاتے ہیں۔ زوجیلا کو عبور کرکے چند میل کے

کے فاصلہ پر چھوٹی سی ڈاک بنگلہ ہے۔ جو دریا کے دائیں کنارے پر ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ ایک چھوٹی سی سرائے اور ہرکاروں کی چوکی ہے۔ سردیوں میں سٹیٹ ٹیلیگراف آفس بھی کھولا جاتا ہے۔ ٹیلیگراف کے لائن سٹاف کے علاوہ سردیوں میں ہرکاروں کا ہیڈکوارٹر بھی یہیں ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی لاینوں کے گرنے کی وجہ سے خالی از خطر نہیں۔ گرمیوں میں بھی ہوا کی تندی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ بنگلے کے قریب ہی دائیں جانب ایک بہت بڑا گلیشیئر ہے۔ جس کا نچلا حصہ قدامت کی وجہ سے نیلگوں ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں بلور بھی ملتا ہے۔ مچوئی سے اُتر کر نو میل کے فاصلے پر متایان کی مختصر سی آبادی بنگلہ اور سرائے ہے۔ یہاں سے بارہ میل آگے دراس کا مقام ہے زوجیلا کو عبور کرنے کے بعد تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آجاتا ہے۔ اور سیاح محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کہ وہ ایک ایسی سرزمین میں داخل ہو رہے ہیں۔ جو کشمیر کی خوشنما اور سرسبز وادی سے بالکل مختلف ہے۔ نہ وہ دلفریب مناظر نہ وہ سبز پوش پہاڑی ڈھلوانیں۔ نہ زرخیز مرتدین وادیاں۔ نہ سدا بہار سرسبز درختوں کی فراوانی۔ نہ سایہ دار مرغزار و ل کی دلفریبی اور نہ لالہ و گل کی رنگین گلکاریاں۔ ان کے برعکس سیاہ ننگی چٹانیں۔ بے برگ و گیاہ جھلسے ہوئے پہاڑ بے رونق خشک سنگستانی وادیاں۔ اور لق و دق ریتلے میدان۔ ہر جا میں یبوست اور دھوپ میں حدّت۔ یہاں کشمیر کی طرح گھنے جنگلات نہیں ہیں۔ درخت کمیاب اور ہری گھاس کہیں کہیں محدود قطعات میں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سے بلتستان کی حد شروع ہوتی ہے۔ اور قدرتی مناظر کی تبدیلی کے ساتھ باشندوں کی شکل و صورت اوضاع و اطوار لباس اور خوراک میں بھی نمایاں تغیر پایا جاتا ہے +

بلتی قدرتاً صفائی پسند ہیں۔ ان کا لباس اونی عموماً بھدّا اور موٹا ہوتا ہے۔ لمبا کوٹ ڈھیلا پاجامہ۔ چھوٹی سی پیالہ نما ٹوپی اور پاؤں میں اپنے ٹخنے کا نمدے اور چمڑے کا بنا ہوا جوتا۔ کمر میں پٹکا باندھنے کے عادی ہیں۔ عورتیں عموماً سیاہ رنگ کا لمبا پیرہن اور تنگ پائنچہ کا پاجامہ پہنتی ہیں۔ سر پر چھوٹی سی اوڑھنی جو سیاہ یا کسی اور رنگ کی ہوتی ہے۔ بروکپا قوم کی عورتیں سر پر ایک قسم کی اونی ٹوپی پہنتی ہیں۔ بروکپا جو گلگت کے نواح سے آکر آباد ہو گئے ہیں۔ درد قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر دراس کے اردگرد کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً تین صدیوں سے دائرۂ اسلام میں آچکے ہیں۔ بلتی بعض مورخین کے خیال میں منگولین نسل سے ہیں۔ مگر بعض ان کا سلسلہ آرین سے ملاتے ہیں۔ ان کی خوراک بہت سادہ ہے۔ اکثر جَو کے ستوؤں اور چاء پر گذر کرتے ہیں۔ روٹی کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اس علاقے میں گندم، جَو، ترُبنا اور کنگنی کی کاشت ہوتی ہے۔ آبادی کم ہے اور دیہات جو کہ منتشر مکانات پر مشتمل ہیں عموماً بہت سے رقبے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں +

دراس ایک مختصر سے میدان میں واقع ہے۔ یہاں درد اور بلتیوں کی آبادی ہے۔ ایک پرانے زمانے کا کچا قلعہ بھی ہے۔ ڈاک بنگلہ۔ سرائے پوسٹ آفس تارگھر اور ڈسپنسری ہے۔ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ بلند ہے۔ آب و ہوا سخت سرد اور خشک ہے۔ ہر وقت تیز ہوا چلتی رہتی ہے۔ گھاس لکڑی انڈہ اور مرغی وغیرہ کی سپلائی کے لئے ایک ٹھیکیدار مقرر ہے۔ لداخ اور بلتستان کے علاقے میں پیداوار کم ہوتی ہے۔ سیاحوں کی ضروریات بآسانی میسر نہیں

ہوسکتیں۔ اس لئے سیاح اور شکاری یورپین بغیر حصول اجازت اس علاقے میں سفر نہیں کرسکتے۔ لیڈیوں کو بھی تنہا سفر کرنے کی اجازت نہیں۔ وسط ایشیا کے سوداگروں اور یارقندی حاجیوں کی آمد و رفت بھی اس شاہراہ پر رہتی ہے۔ رسد رسانی اور بار برداری کے لئے اس علاقہ میں خاص انتظام ہے۔ پڑاؤں پہ اناج کی کوٹھیاں ہیں جہاں سے گندم۔ جو اور آٹا مقررہ نرخ پر مل سکتے ہیں۔ سواری اور بار برداری کے لئے ہر ایک پڑاؤ پر گھوڑوں اور قلیوں کی ایک مقررہ تعداد موجود رہتی ہے۔ ایک آنہ فی میل گھوڑوں کا اور چھ پائی فی میل قلیوں کا نرخ ہے۔ سردیوں میں نرخ میں زیادتی ہوجاتی ہے۔ دیہات کے باشندے اپنی اپنی باری کے مطابق ہر پڑاؤ پر جو اُن سے قریب ہوتا ہے گھوڑوں اور قلیوں کا مناسب انتظام رکھتے ہیں۔ اسے Res Pass سسٹم کہتے ہیں . . . .

اور ہر پڑاؤ پر پلیس کا نمبردار ذمہ دار ہوتا ہے کہ سرکاری ملازموں۔ سیاحوں اور سوداگروں کے لئے مناسب انتظام کردے۔ یہ سلسلہ دراس سے شروع ہوتا ہے۔ سرینگر سے دراس تک سیاحوں وغیرہ کو خود انتظام کرنا ہوتا ہے کہتے ہیں کہ یہ انتظام مہتہ منگل وزیر لداخ کے وقت جاری ہوا تھا۔ اس سے آنے جانے والوں کو بہت سہولت ہوگئی ہے۔ ورنہ ایسے علاقہ میں سفر کے لئے بہت مشکلات درپیش آتیں۔ سواری کے لئے سیاحوں کو اپنی زین ساتھ رکھنی لازمی ہے۔ کیونکہ اس جگہ لکڑی کی زینوں کا رواج ہے جو آرام دہ نہیں ہوتیں دراس کے اردگرد چند میلوں تک خاصی رونق اور آبادی ہے۔ نشیب و فراز میں وسیع زیر کاشت رقبے بھی ہیں۔ دراس میں پولو گراؤنڈ بھی ہے۔ اور بلتستان میں ہر ایک جگہ پولو کھیلنے کا انتظام ہے۔ اس کھیل کا لوگوں میں خاص مذاق ہے۔ ایک یورپین سیاح کے بیان کے مطابق اسے درد قوم نے رواج دیا تھا۔ مگر اس کی ایجاد کا سہرا ایران کے سر ہے۔ یہاں سے تبت۔ چین۔ جاپان۔ ترکستان۔ قسطنطنیہ۔ ہندوستان اور یورپ میں پھیل گئی۔ تبتی زبان میں پولو گیند کو کہتے ہیں۔ ایران میں اس کھیل کو چوگان کہتے ہیں ؞

دراس سے دندل تھنگ تک آبادی کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ اس سے آگے نسبتاً راستہ کم آباد ہے۔ دندل تھنگ سے چند میل نکل کر راستہ میں تھگام کی آبادی ہے۔ یہاں ایک دیہاتی مدرسہ بھی ہے۔ گاؤں سے باہر ایک سایہ دار باغیچہ ہے۔ چونکہ یہ مقام ذرا کھلا اور بارونق ہے۔ اس لئے سیاح اکثر اسی جگہ باغیچہ میں قیام کرتے ہیں۔ بنگلہ شمسہ کھربو اس سے چند میل پر ہے۔ اور نسبتاً تنگ جگہ میں لب دریا واقع ہے۔ ساتھ ہی ایک طرف پہاڑ ہے جس کے روبرو میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر گاؤں آباد ہے۔ شمسہ کھربو سے کرگل تک راستہ قریباً غیر آباد ہے۔ اور صرف چھانہ گنڈ کی مختصر سی آبادی ہے۔ ان مقامات پر ہرکاروں کی چوکیاں بھی ہیں۔ بلند پہاڑوں کے درمیان تنگ وادی میں دریا تیزی سے بہہ رہا ہے۔ جس کے کنارے کنارے سڑک جاتی ہے۔ جو پیچ و خم کھاتی ہوئی کبھی پہاڑ کے پہلو میں اوپر چڑھ جاتی ہے۔ اور کبھی دریا کی سطح کے برابر آجاتی ہے۔ شمسہ کھربو سے دو تین میل پر ایک پہاڑی نالہ جو علاقہ شنگھو سے آتا ہے۔ اور اسی وجہ سے شنگھو نالہ کہلاتا ہے۔ دراس کے دریا میں شامل ہوتا ہے۔ اس کا پانی نہایت گہرا نیلگوں اور خوشنما ہے۔ شکاری عموماً اس نالہ میں ریچھ اور کیل کے شکار کے لئے جاتے ہیں۔ مگر یہ

راستہ نسبتاً زیادہ دشوار گذار ہے۔ کرگل سے چار میل اس طرف کھرل کے مقام پر ایک آہنی پل دریائے دراس پر بنا ہؤا ہے۔ یہ راستہ اسکردو کو جاتا ہے۔ مگر سیاحوں کو سواری اور باربرداری کے انتظام کے لئے کرگل جانا پڑتا ہے کھرل کے قریب ہی دریائے دراس دریائے سورو میں جو زانسکار اور سورو کے علاقہ سے آتا ہے۔ شامل ہو جاتا ہے۔ ان دریاؤں کے پانی میں بلا کی تیزی ہے۔ اور پتھروں اور چٹانوں کی کثرت کے باعث کشتی وغیرہ نہیں چل سکتی۔ اسکردو کا راستہ اس کے کنارے کنارے جاتا ہے۔

کرگل۔ لداخ اور اسکردو کے بعد تیسرے درجہ کا شہر جو دریائے سورو کے کنارے پر آباد ہے۔ آبادی پہاڑ کے نشیبی دامن میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بارونق مختصر بازار جو گردونواح کے لئے تجارتی منڈی کا کام دیتا ہے۔ اور علاقہ پورگ کے لوگ جس کا یہ صدر مقام ہے خرید و فروخت میں مصروف دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکخانہ تارگھر اور مدرسہ بازار کے ایک سرے پر واقع ہیں اور دریا کے پار ایک بلند کریوے پر سامنے ڈاک بنگلہ ہسپتال اور سرائے کی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہیں وزیر وزارت کے قیام کے لئے جو اس علاقہ کا گورنر ہے ایک بنگلہ بھی بنا ہؤا ہے۔ یہاں بلتیوں کی آبادی ہے۔ جو شیعہ مسلمان ہیں۔ بازار میں زیادہ تر کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانیں ہیں۔ عورتیں بالعموم سیاہ لباس پہنتی ہیں اور پیتل کے بھدے زیورات کا عام رواج ہے اس علاقہ میں پردہ کا رواج نہیں۔ بازار کے پاس ہی ایک معمولی پل پر سے کریوہ کو راستہ جاتا ہے۔ مگر بڑی سڑک کرگل سے قریباً ایک میل اوپر ایک مضبوط آہنی پل کے ذریعہ سے دریائے سورو کو عبور کرکے کریوہ پر سے گذرتی ہوئی لداخ کو چلی جاتی ہے یہ سڑک "ٹریڈی روڈ" کہلاتی ہے اور اس کی نگہداشت برٹش جائنٹ کمشنر کے متعلق ہے۔ جو اسسٹنٹ ریذیڈنٹ بھی ہوتا ہے برٹش جائنٹ کمشنر ہر سال موسم گرما میں سرینگر سے لداخ جاتا ہے۔ اور دو تین ماہ وہاں قیام کرتا ہے۔ وسط ایشیا کی تجارت کی نگرانی اور نظم و نسق کا وہی ذمہ دار ہے۔ وزیر لداخ ریاست کی طرف سے سٹیٹ جائنٹ کمشنر کی حیثیت سے متعلقہ فرائض کو انجام دیتا ہے۔ وادئی کرگل بلتستان کی زرخیز وادیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ آب و ہوا نسبتاً معتدل ہے دراس سے کرگل تک وادی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تنگ اور دشوار گذار ہے۔ مگر کرگل ایک وسیع میدان میں پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ دو میل اوپر دریائے سورو کے کنارے دائیں ہاتھ کو وادی زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور یہیں سے علاقہ سورو اور زانسکار کو راستہ جاتا ہے یہ علاقے نسبتاً کم آباد ہیں۔ دریا کی طغیانی اور پلوں کی کمی کی وجہ سے سفر میں آسانی نہیں۔ آب و ہوا سخت سرد ہے۔ اور سردیوں میں سخت برفباری ہوتی ہے۔ اس علاقہ میں بھی شیعہ مسلمان آباد ہیں۔ بڑی سڑک دریا کو عبور کرکے بائیں ہاتھ کو کریوہ پر سے ہوتی ہوئی نیچے اترجاتی ہے۔ یہ کریوہ پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے غیر آباد پڑا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ اسے سیراب کرنے کے لئے کاریز کے ذریعے آبپاشی کا انتظام کیا گیا تھا۔ مگر وہ سکیم کامیاب نہ ہوئی۔ کرگل سے بائیس میل پر ملبک کا پڑاؤ ہے۔ ریسٹ ہاؤس نیچے ندی کے کنارہ پر ہے۔ یہاں مسلمانوں اور بدھوں

کی مخلوط آبادی ہے۔ ملبک سے تھوڑے فاصلے پر راستہ میں ایک قدیمی بت ہے۔ جو پہاڑ کے پہلو میں ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ یہ بت بہت بڑی قدوقامت کا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ایک قدیمی دیوتا چمبا نامی سے منسوب ہے۔ اس سے آگے بدھ کھربو کی آبادی ہے۔ اس جگہ تک کہیں کہیں مسلمان بھی آباد ہیں۔ مگر وہ بھی وضع قطع اور شکل صورت میں بدھوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہانتک کہ بعض کے نام بھی بدھوں کی مانند ہی ہیں۔ اور اُن کے سر کے بال بھی بدھوں کی طرح ہوتے ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ ملبک اور بودھ کھربو کے علاقہ میں بعض مخلوط خاندان بودھوں اور مسلمانوں کے ہیں۔ مگر اس امر کی تصدیق نہیں ہو سکی +

ملبک اور بودھ کھربو سے چل کر لامہ یورو کا گاؤں ہے جس کے سر پر ایک قدیم گنبہ ہے۔ اس جگہ ایک ریسٹ ہوس اور اناج کی کوٹھی ہے۔ ایک ابتدائی مدرسہ بھی قایم کیا گیا ہے۔ یہ آبادی پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ جگہ واقع ہے۔ اور صحت کے لحاظ سے بھی اس جگہ کا پانی کچھ ایسا اچھا نہیں۔ اس لئے بہت کم سیاح یہاں قیام کرتے ہیں۔ صرف قلیوں اور گھوڑوں کے تبادلہ کے لئے کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ لامہ یورو سے نکل کر راستہ ایک تنگ نالے میں سے ہو کر جاتا ہے۔ اور بعض جگہ پہاڑ پر سے کنکر اور پتھر گرنے کی وجہ سے مسدود ہو کر دشوار گذار بھی ہے۔ بارش یا طغیانی کی صورت میں اس جگہ سے گذرنا خطرناک ہے۔ لامہ یورو سے دس میل پر خلسی کا مقام ہے۔ یہ بستی دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ہے۔ یہاں سے راستہ دریائے سندھ یا اٹک کے کنارے کنارے ہو جاتا ہے۔ خلسی کے پاس ایک مضبوط آہنی پل دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک قدیم محل اور قلعہ بھی ہے جو سنہ ۱۱۵۰ء میں شاہ ژنگ لاگ نے تعمیر کیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس اور پوسٹ آفس بھی ہے۔ گرمیوں میں ٹیلیگراف آفس بھی کھل جاتا ہے۔ یہاں ایک عیسائی مشن کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے جس کے انچارج پادری کی کوٹھی ایک وسیع احاطہ اور باغ میں گاؤں سے باہر ہے۔ پادری صاحب کی کوٹھی میں گوبھی مٹر اور دوسری سبزی مل جاتی ہے۔ جو اس علاقہ میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہاں خوبانی اور سیب بھی پیدا ہوتے ہیں۔ سیب چھوٹے چھوٹے اور شیریں ہوتے ہیں۔ مگر کشمیر کے سیبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بودھ کھربو اور لامہ یورو کے درمیان "نامیکا" کو عبور کرنا پڑتا ہے جو سطح سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ چڑھائی اُترائی سخت ہے۔ اور ہوا بہت تیزی سے چلتی رہتی ہے۔ سردیوں میں برف اور ہوا کی تندی کی وجہ سے اسے عبور کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ خلسی سے آگے راستہ میں نور اللہ، سسپول اور بزگو کی آبادیاں قابل ذکر ہیں۔ باقی راستہ خشک بے آب و گیاہ اور بنجر ہے۔ ہوا میں یبوست کی وجہ سے آفتاب میں تمازت کا نمایاں اثر ہوتا ہے۔ اور دوران سفر میں چہرے کی رنگت سیاہی مائل ہو جاتی ہے خصوصاً یورپین سیاحوں کے چہروں اور بدن کے دوسرے برہنہ حصوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ بعض یورپین لیڈیاں اس علاقہ میں ڈانڈیوں پر سفر کرتی ہیں جنہیں بدھ قلی اٹھائے ہوئے عجیب انداز سے شور کرتے جاتے ہیں۔ جو دور سے سُنائی دیتا ہے۔ بزگو ایک بارونق بودھی گاؤں ہے۔ راستہ اس کے درمیان سے گزرتا ہے۔ بزگو

سے نکل کر ایک وسیع لق و دق ریتلا میدان ہے جس میں مٹی پتھروں کے بڑے بڑے چبوترے ہیں۔ تھوڑی دور سامنے نیمو کا پڑاؤ ہے۔ جہاں ریسٹ ہوس اور سرائے ہے۔ اگست کے مہینے میں ان گاؤں کے باشندے فصل کاٹنے اور سنبھالنے میں مشغول پائے جاتے ہیں۔ جو۔ تربنا۔ مٹر اور باقلہ کی کاشت ہوتی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ کام میں برابر شریک رہتی ہیں۔ اور کام کے ساتھ ساتھ اپنی طرز پر ایک عجیب انداز سے گاتی بھی جاتی ہیں نیمو سے آگے چل کر راستہ پہاڑی نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے ایک کھلے ریگستان سے گذرتا ہے۔ جوفیانگ نالہ سے گذر کر دریائے سندھ کے ساحل سے نزدیک ہو جاتا ہے۔ اور پتک کے قریب پہنچ کر سڑک بالکل دریا کے کنارے پر سے گذرتی ہے۔ پتک کا مقام لیہ لداخ سے پانچ میل پر ہے۔ جہاں باغیچہ میں ریسٹ ہوس بنا ہوا ہے۔ اور ایک قدیم بودھی گنپہ بھی ہے۔ پتک سے چل کر رستہ بائیں ہاتھ کو ہو جاتا ہے اور دریا سے ہٹ کر گذرتا ہے۔ ننگے پہاڑی چٹانوں کے درمیان میں سے گذر کر سامنے ایک وسیع میدان میں دور سے لداخ کی آبادی نظر آتی ہے جس کے باغات، گنپے اور قدیم محلات سیاح کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور کئی دنوں کی کٹھن منزلوں کا تھکا ہارا مسافر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ دراس سے لداخ تک صرف پڑاؤ یا آبادی کے آس پاس سبزہ اور درختوں کی شکل نظر آتی ہے۔ ان پڑاؤں اور بعض دوسرے مقامات پر پتھروں کی چار دیواری کے اندر بید اور سفیدہ کے درختوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ جو عموماً کسی چشمہ یا نالے کے کنارے پر واقع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ باغیچے بھی مہتہ منگل وزیر نے اپنے عہد حکومت میں لگوائے تھے۔ تاکہ تھکے ماندے مسافروں کو ستانے کا موقع مل جائے۔ ریسٹ ہوس بھی گو فرنیچر اور عمارت کے لحاظ سے بہت اعلیٰ نہیں مگر ایسے دور دراز اور دشوار گذار علاقے میں مسافر کے لئے ان کا وجود بہت غنیمت ہے۔ یہ علاقہ کم آباد ہے گنتی کے چند مقامات کو چھوڑ کر کہیں کہیں کوئی مختصر سی آبادی آ جاتی ہے۔ البتہ ہر چوتھے پانچویں میل پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی جس کی سفید دیواریں دور سے مسافر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ نظر پڑتی ہے۔ یہ ڈاک کے ہرکاروں کی چوکیاں ہیں۔ جو سر رہگذر بنی ہوئی ہیں۔ اور ہر آیندہ و روند سے اس مفید پبلک محکمہ کی دیانتدارانہ خدمات کا اعتراف کراتی ہیں۔ کہیں کہیں مارمٹ کی تیز سیٹی گذرنے والے کو چونکا دیتی ہے۔ اور نگہ اٹھاتے ہی ایک سرخ بھورے رنگ کا چھوٹا سا جانور پتھروں میں غائب ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گرمیوں میں کشمیری مرکبانوں کے قافلے جو تجارتی مال کشمیر سے لداخ اور لداخ سے کشمیر کو لاتے ہیں۔ اکثر راستے میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کہیں کہیں یارقندی حاجیوں کے قافلے بھی راہ چلتے ہوئے یا کسی پڑاؤ پر خیمہ زن دیکھے جاتے ہیں۔ ان میں بعض زن و مرد بہت ضعیف ہوتے ہیں۔ اور اس دور دراز کٹھن سفر کے مصائب برداشت کرنے کے لئے ان کی مستعدی سے ان کے نور ایمان اور زیارت کعبہ کے شوق کا ثبوت ملتا ہے۔ کبھی کبھی کہیں کسی یوروپین سیاح سے بھی اتفاق ملاقات ہو جاتا ہے۔ جو یا تو شکار کے شوق میں یا اس سرزمین کی سیر و سیاحت اور بودھوں کے تمدن اور تہذیب سے واقفیت پیدا کرنے کے خیال سے یہ تکلیف دہ سفر اختیار کرتے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ بودھ

کھربو کے مقام پر ایک یورپین سیاح سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اس طویل سفر میں اُن کی سبکباری موجب حیرت تھی۔ اُن کے پاس صرف ایک یارقندی گھوڑا تھا۔ کھانے پینے کا مختصر سا سامان بستر اور ایک ہلکے سبز رنگ کا چھوٹا سا خیمہ۔ ان کی ساری کائنات تھی۔ جسے وہ اسی گھوڑے پر لادلیتے تھے اور پیادہ سفر کر رہے تھے۔ نہ اُن کے ہمراہ کوئی نوکر تھا۔ نہ باورچی۔ سب کام دونوں مل کر خود کرتے تھے۔ بودھ گمپہ میں بنگلہ سے تھوڑی دور ندی کے کنارے اُنہوں نے خیمہ لگا کر وہیں رات بسر کرلی تھی۔ اور وہیں پاس ہی درختوں میں اپنے بے زبان رفیق کو باندھ دیا تھا۔ صبح میرے دیکھتے دیکھتے اُنہوں نے پُھرتی سے اپنا اسباب سمیٹ کر گھوڑے پر لاد دیا اور اُس کی گردن کی رسّی کو پکڑ کر پیادہ پا روانہ ہوگئے۔ فی الحقیقت ان لوگوں کا عزم و استقلال قابل تعریف ہے +

لیہ لدّاخ ایک بارونق قصبہ اور قدیم تجارتی منڈی ہے۔ جو کہ دس میل لمبے اور وسیع ریگستانی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس کے شمالی جانب کوہ قراقرم کے اوپر سے وسط ایشیا کے مشہور شہروں کاشغر اور یارقند کو راستہ جاتا ہے۔ مشرق کی طرف چین اور تبت (لاسہ) کی سڑک ہے۔ جنوبی رخ پر کشمیر اور ہندوستان کی شاہراہ ہے۔ ایک دوسرا راستہ لاحول کے علاقہ سے گذر کر شملہ کو جاتا ہے۔ لداخ کے بازار میں مختلف اقوام اور ممالک کے آدمی دیکھنے میں آتے ہیں۔ تاجروں کے قافلے سنٹرل ایشیا سے تجارت کا مال لے کر یہاں آتے ہیں اور یہاں سے ہندوستان کی اشیا اپنے ملکوں کو لے جاتے ہیں۔ درآمد میں زیادہ تر ریشم کا کپڑا اور تار۔ اونی قالین اور نمدے۔ سمور۔ مشک۔ چائے اور چرس شامل ہیں۔ ان کے عوض ہندوستان سے نیل۔ رنگ۔ مصالح۔ چینی (کھانڈ) سوتی کپڑا اور افیون وسط ایشیا کو بھیجی جاتی ہیں۔ یارقندی حاجیوں کے قافلے بھی اسی راستے سے جاتے ہیں۔ سرینگر سے یارقند قریباً آٹھ سو میل کی مسافت پر ہے۔ لدّاخ سے آگے بہت سا غیر آباد علاقہ ہے۔ اور دس منزلوں میں خورد و نوش کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ سات بلند دروں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ جن میں سے دو یعنی کھردونگ اور ساسرلا کی بلندی سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ ہے۔ اور ان پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ اردگرد کے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں چوبیں پچیس ہزار فٹ کے قریب ہیں۔ مسافروں کو اس سفر میں بہت سی صبر آزما تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کئی ضعیف العمر حاجی راستہ میں ہی جان دے دیتے ہیں۔ کھردونگ لیہ سے تائیں میل کے فاصلہ پر ہے۔ جولائی میں اسکو عبور کرنا نسبتاً زیادہ محفوظ اور آرام دہ ہوتا ہے۔ یہاں سخت سردی ہوتی ہے۔ اور ہوا کی لطافت کی وجہ سے تنگئے نفس کے ساتھ سر چکرانے لگتا ہے۔ عموماً صبح سویرے جبکہ برف جمی ہوتی ہے گذرنے میں آسانی رہتی ہے۔ بار برداری کے لئے زو جو وسط ایشیا کے یاک اور گائے کی مخلوط نسل سے ہوتا ہے کام میں لایا جاتا ہے۔ یارقندی گھوڑے بھی جو مضبوط اعضا۔ گھنے ایال اور لمبی گپھے دار دم رکھتے ہیں۔ اس راستہ میں کام دیتے ہیں۔ مگر عموماً گھوڑوں سے بوجھ اُتار کر کھردونگ کو عبور کرایا جاتا ہے۔ اس سے آگے وادی نوبرا میں لدّاخ کا آخری پڑاؤ پانامک ہے۔ جہاں اناج کی ایک بڑی کوٹھی ہے۔ وادی نوبرا سے گذر کر قراقرم کو ساسرلا کے راستہ سے عبور کرتے ہیں

لداخ کے مقابل دریائے اٹک کے بائیں کنارے اور ہمالیہ کے وسطی حصے کے درمیان رپشو زانسکار اور سورو کے علاقے ہیں۔ رپشو جس کی بلندی سطح سمندر سے ساڑھے تیرہ ہزار سے ساڑھے سولہ ہزار فٹ تک ہے۔ زمین کا سب سے بڑا بلند قطعہ ہے جس میں آبادی ہے۔ ایک خانہ بدوش قوم جسے چنگ پا کہتے ہیں آباد ہے۔ یہ خیموں میں رہائش رکھتے ہیں۔ اور بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ کلو سے لداخ کو آتے ہوئے اس علاقہ میں سے گزرنا پڑتا ہے +

ایک یورپین سیاح مسٹر وائن نے انیسویں صدی کے وسط میں لداخ کے علاقہ کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ تبت کا علاقہ لاسہ سے گلگت تک بارہ سو میل طویل ہے۔ اور تین حصوں میں منقسم ہے۔ لیہ لداخ وسطی تبت کا دار الخلافہ ہے اور اسکردو چھوٹا تبت کا صدر مقام ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے بیان کے مطابق اس وقت لداخ میں سکھوں کی حکومت تھی۔ مگر اسکردو کا علاقہ مسلمان راجوں کے ماتحت تھا۔ ایک دوسرے سیاح کیپٹن اڈیٹر کے بیان کے مطابق اس علاقہ میں بدھوں سے پہلے ایک انڈو آرین فرقہ آباد تھا جو ... مانز کہلاتے تھے۔ گلگت کے ڈارڈ . بھی اس جگہ آباد ہیں۔ اور بروکپا قوم انہیں کی نسل سے ہے[ف۱]۔ سنہ ۲۰ قبل مسیح راجو کنشکا اور اس کے جانشین حکمران تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں منز کی حکومت تھی۔ اس کے ایک صدی بعد کشمیر کے مشہور حکمران للتادت نے اسے فتح کر لیا۔ اس نے ۶۹۹ء سے ۷۳۱ء تک حکومت کی۔ دسویں صدی میں وسطی تبت کے راجاؤں کی حکومت ندجلہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۳۰۰ء کے قریب بدھوں کا اقتدار تھا۔ مگر منگولوں کے حملے کے بعد ان کی طاقت زوال پذیر ہوگئی۔ سترہویں صدی میں تبتیوں نے پھر لداخ پر حملہ کیا اور بزگو تک پہنچ گئے۔ اس وقت شاہ ڈیلاگ نے مغل شہنشاہ شاہجہان سے امداد اور سرپرستی کی درخواست کی۔ مغل شہنشاہ نے اس کی امداد کی۔ ڈیلاگ خود بھی مسلمان ہوگیا۔ اور لداخ میں ایک مسجد تعمیر کی[ف۲]۔ مسلمانوں کی آمد پر لاماؤں کی سلطنت کے اس مغربی حصہ کو زوال آگیا۔ راجہ گلاب سنگھ والئی جموں کے عہد حکومت میں ایک ڈوگرہ سردار زور آور سنگھ نے ۱۸۳۵ء میں حملہ کر کے لداخ کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے تبت پر پھر چڑھائی کر دی۔ مگر اس مہم میں اسے کامیابی نہ ہوئی اور صلح ہوگئی۔ زور آور سنگھ تبت کی مہم میں ہلاک ہوگیا بالآخر جب انگریزوں نے کشمیر کا علاقہ راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کیا تو لداخ اور بلتستان کے اضلاع بھی کلی طور پر اس کے زیر نگین آگئے۔ لداخ کا آخری بادشاہ سنگپال تخت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا +

لداخ کے علاقہ کی آب و ہوا سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔ مگر گرمیوں میں دھوپ بھی تیز ہوتی ہے۔

ف۱ منگولین نسل کے لوگ تبت سے آکر آباد ہوئے۔ اور موجودہ لداخی قوم ان تین قوموں مانز اور ڈارڈ ... اور منگولز کے مخلوط خون سے ہے۔

ف۲ لاما اس امر کے معترف نہیں ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ڈیلا نمگ بعد میں پھر اسلام سے منحرف ہوگیا تھا۔ اور اس نے اپنا آبائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مگر اس کا لڑکا اسلام کا حلقہ بگوش ہی رہا۔ اور واپس لداخ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد شاہ لداخ والئی کشمیر کو خراج دیتا رہا +

لیہ لداخ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ بلند ہے۔ میدانی علاقوں کی بلندی بعض جگہ بارہ ہزار سے پندرہ ہزار فٹ تک ہے۔ مگر ارد گرد کے پہاڑوں کی چوٹیاں سترہ ہزار سے اکیس ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ آبادی اندازاً دو لاکھ ہوگی۔ پیداوار صرف اُن مقامات میں ہوسکتی ہے جہاں پانی میسر آسکے۔ عام طور پر گندم۔ جو کنگنی مٹر باقلاو ترینا کی کاشت ہوتی ہے۔ بعض جگہ سیب اور خوبانی بھی ملتے ہیں۔ اون پشمینہ اور نمک بھی پیداوار میں شامل ہیں۔ شکار کی کثرت ہے۔ کیل۔ شاپو۔ مارمٹ۔ خرگوش۔ ریچھ۔ چیتا بارہ سنگا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ بودھ طبعاً غریب۔ خوش طبع اور دیانتدار ہیں۔ بودھ عورتیں فصل سنبھالنے کے وقت جب کھلیانوں پر بیلوں کو ہانکتی ہیں۔ تو ساتھ ساتھ بلند آواز سے گاتی بھی جاتی ہیں۔ بہار کے موسم میں ایک آدھ خود رو پھول بالوں میں اٹکا لیتی ہیں۔ کسی بڑے افسر یا معزز آدمی کے استقبال یا عزت افزائی کے لئے خوشرنگ بانات یا ریشم کا لباس پہنتی ہیں۔ جو بڈ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک قطار میں کھڑی ہوکر دونوں ہاتھوں کے کنگنو کو آپس میں ٹھکراتی ہیں۔ اور ایک ہاتھ کو پیشانی کی طرف اُٹھا کر تعظیم بجالاتی ہیں سلام یا بندگی کہنے کی بجائے بودھ جوہ بولتے ہیں +

اس علاقے کے باشندے منگولین ٹائپ کے اور درمیانہ قد کے ہیں۔ لباس اور عادات کے لحاظ سے صفائی پسند نہیں غسل کے بہت کم عادی ہیں۔ بلتیوں کی طرح موٹا اونی لباس پہنتے ہیں۔ ٹوپی دونوں طرف کانوں کے نیچے تک لٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ عورتیں پیٹھ پر شانوں پر سے بھیڑ کی کھال اوڑھے رہتی ہیں۔ اور کانوں کے اوپر سیاہ رنگ کے چمڑے والی کے کانوں کی طرف آویزاں رکھتی ہیں بسر پر ہیرک پہنتی ہیں جو عموماً سرخ رنگ کے کپڑے کا ہوتا ہے۔ اور پیشانی سے لے کر سر کے پچھلی طرف لٹکتا رہتا ہے۔ اس کی چوڑائی بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اس پر فیروزے اور رنگ برنگ کے پتھر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ پیتل کے بھرے زیورات پہنتی ہیں۔ گو سونے چاندی کا رواج بھی ہے۔ گلے میں مونگے اور دیگر پتھروں کی مالا اور ہاتھوں میں سفید ہڈی کے گوکھرو پہنتی ہیں۔ زیادہ فارغ البال خاندانوں کی عورتیں بھیڑ کی کھال کے بجائے ریشمی شال استعمال کرتی ہیں۔ عورتوں کے خدوخال بھی منگولین ہیں۔ رنگت عموماً سفید زردی مائل۔ مگر کہیں کہیں سرخی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مرد چنداں خوش شکل نہیں۔ مگر بعض عورتیں خاصی قبول صورت ہوتی ہیں۔ لامہ یعنی تارک الدنیا مرد اور جوہمو یعنی تارک الدنیا عورتوں کی کثرت ہے۔ ان کا لباس سرخ اور زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ سر منڈے ہوئے اور چوٹی یا بال ندارد۔ ایک خاندان میں عموماً ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔ کیونکہ صرف بڑا بھائی شادی کرتا ہے اور دوسرے بھائی بھاوج سے ہی تعلقات زناشوئی قائم کرلیتے ہیں۔ اولاد اصل خاوند یعنی بڑے بھائی کی متصور ہوتی ہے۔ اور وہی جائداد کا وارث بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی گھرانے میں صرف ایک لڑکی ہی ہو۔ تو اُسے بالغ ہونے پر اپنی شادی کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ بالعموم کسی دوسرے خاندان میں چھوٹے بھائی کو منتخب کرلیتی ہے۔ وہ مگپا کہلاتا ہے اور اُسے اپنی بیوی کے زیر فرمان رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے کسی وقت بے دخل کر دینے کی

مجاز ہے۔ عام حالتوں میں شادی کے بعد بڑا لڑکا گھر کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور والدین کو صرف گذارہ کے لئے روٹی کپڑا ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شادی کا یہ انوکھا طریقہ جائداد کو تقسیم سے بچانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ کاشت شدہ رقبہ زیادہ وسیع نہیں۔ اور اب اس رسم کی بجا آوری میں کسی طرح کی شرم یا غیرت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو وہ آباؤ اجداد کے طریقہ کی مخالفت کے باعث مورد طعن و تشنیع بنتا ہے۔ یہی رواج آبادی کی قلت کے لئے بھی کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ شادی کا طریق بالکل سادہ اور پُر تکلف رسومات سے مبرا ہے۔ لڑکے لڑکی کو اپنا شریک زندگی منتخب کرنے میں کسی حد تک آزادی ہے۔ بودھ مہاتما گوتم کے اصول کے مطابق مسئلہ تناسخ اور نروان کے قائل ہیں۔ خود کسی جاندار کو ہلاک کرنا عیب سمجھتے ہیں۔ مگر گوشت کھا لیتے ہیں۔ ان میں چھوت چھات کا نام تک نہیں۔ دعا کے کندہ شدہ پتھروں اور جھنڈیوں سے جو ان کے مکانات اور گنپوں (مندروں) پر اڑتی رہتی ہیں ان کی مذہبی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ دعا کے چکر عموماً سالخوردہ اشخاص یا لاماؤں کے ہاتھوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ گنپے یا مندر عموماً آبادی کے آس پاس کسی بلند مقام پر بنے ہوتے ہیں جن میں تارک الدنیا مرد اور عورتیں رہتی ہیں۔ راستہ میں جگہ جگہ دعا کے کندہ شدہ پتھروں کے ڈھیر مستطیل چبوتروں پر پائے جاتے ہیں۔ جن پر تبتی یعنی مندرجہ ذیل عبارت بودھی زبان میں کندہ ہوتی ہے "ام منے پامنے اوم" اس کا مطلب ایک انگریز نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے یا کنول ان کے عقیدہ کے مطابق دنیا کی پیدائش کا نشان ہے۔ ایک دوسرے یورپین سیاح نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

'یعنی او بدھ! جو کہ کنول کے پھول کے درمیانی ہیرے کی طرح پاکیزگی کی روح میں جذب ہو گیا ہے۔' یہ پتھر عموماً لامہ لکھتے ہیں۔ اور معتقدین ان کو خرید کر چڑھاوے کے طور پر ان چبوتروں پر رکھ دیتے ہیں۔ ان چبوتروں کے دونوں سروں پر مینار یا برج بنے ہوتے ہیں۔ جنہیں بدھوں کی اصطلاح میں چوٹن کہتے ہیں۔ بودھ ہمیشہ ان پتھروں سے بائیں ہاتھ کو گذرتے ہیں۔ لداخ میں ایسے پتھروں کا سب سے بڑا چبوترہ ہے جو سترہویں صدی کے نصف اول میں ؟ یاڈ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کی لمبائی ۵۰۸ قدم ہے۔

بدھ طبعاً حلیم اور امن پسند ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کی جنہیں رشکم کہتے ہیں بہت عزت کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ پیدائشی ہوتے ہیں۔ اور ایک کشک کی موت واقع ہونے پر اس کی روح اس کے جانشین میں حلول کر جاتی ہے جسے تلاش کر کے گنپے میں لے آتے ہیں۔ اور اس بچہ کی پرورش بہت عزت اور احتیاط سے کی جاتی ہے۔ مجھے لداخ میں ایک نوعمر کشک سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کی عمر مشکل پندرہ سولہ سال ہو گی۔ انگریز سیاحوں اور لیڈیوں نے اس کے فوٹو لئے تھے۔ اس کی ایک کاپی مجھے بھی دستیاب ہو گئی تھی۔ بدھوں کے عقیدہ کے مطابق مہاتما بدھ کے اوتار ہر وقت دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسیح بھی بدھ لامہ ہی تھا۔ بدھ جو کی ایک قسم کی شراب بناتے ہیں جسے چھنگ کہتے ہیں۔ زن و مرد اس کا استعمال بکثرت کرتے ہیں۔

معصوم کی نذرِ عقیدت

(از جناب زین العابدین سجاد میرٹھی فاضل دیوبند)

(۱)

میں اپنے دار المطالعہ میں بیٹھا ہوا کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نوکر نے صبح کی ڈاک پیش کی۔ کسی طلسمی کشش کے اثر سے میں نے خطوط و رسایل کے بنڈل میں سے ایک خط کھینچ لیا اور اسے چاک کر کے مضطربانہ طور پر پڑھنا شروع کر دیا۔ خط ہندوستان کے مشہور ادیب اور میرے عزیز دوست جاویدی کا تھا۔ اس نے میری دعوت قبول کر لی تھی۔ اور وہ اگلے مہینے "انجمن علم و ادب" کے زیر اہتمام ایک لکچر دینے کے لئے میرٹھ آنے والا تھا۔

جاویدی میرا کلاس فیلو تھا اور لنگوٹیا یار۔ میں نے اور اس نے زندگی کی پہلی منزل ساتھ ساتھ طے کی تھی لیکن زندگی کی دوسری منزل میں قدم رکھتے ہی ہم دونوں کے رستے جدا جدا ہو گئے۔ میں اپنی جائداد کے انتظام کے لئے مستقل طور پر میرٹھ رہنے لگا۔ اور جاویدی نے اپنی ادب نواز طبیعت کے گل کھلانے کے لئے کلکتہ سے "بہار" جاری کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے برسیں گذر گئی تھیں لیکن ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی یاد جدا نہ ہوئی تھی۔ میں اکثر اسے خط لکھتا رہتا تھا۔ اور اس کا رسالہ اور نادر تصانیف بلاناغہ میرے پاس آتی رہتی تھیں۔ میرا خاندان بھی ان تعلقات سے واقف تھا۔ میری بیوی کو اس کے مختصر افسانے خاص طور پر پسند تھے۔ اور میری چھوٹی بچی نعیمہ نے اس کی "تتلی" اور "بلبل" والی نظمیں زبانی یاد کر لی تھیں۔ نعیمہ جب اپنی سہیلیوں کو یہ نظمیں سناتی تھی تو فخر کے طور پر یہ بھی کہہ دیتی تھی کہ یہ اس کے چچا کی لکھی ہوئی ہیں۔ نعیمہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی کہ یہ ہمارے چچا کیسے ہیں۔ کبھی ہمارے ہاں آتے بھی نہیں؟ میں ہنس کر کہہ دیتا کہ وہ تم سے ناراض ہیں۔ آج جب جاویدی کا خط آیا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے سبق کی نقل کر رہی تھی۔ میں نے پکار کر کہا "لو نعیمہ تمہارے چچا آ رہے ہیں"۔

نعیمہ بھاگی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی "جاویدی؟"

میں نے کہا "تمہارے اور کون چچا ہیں؟ ہاں وہی آ رہے ہیں"۔

بچی کھسیانی ہو گئی۔ اس نے فرطِ محبت سے جاویدی کہہ دیا تھا۔ جسے چچا کہنا چاہئے تھا۔ وہ نگاہیں نیچی کئے آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ مگر میں نے

دیکھا کہ اب اُس کا کام میں بھی جی نہ لگتا تھا۔ کیونکہ اُس کے چچا آرہے تھے ۔

(۲)

آخر جاویدی کے آنے کی تاریخ آگئی میں ساڑھے سات بجے اسٹیشن پہنچ گیا۔ "انجمن علم و ادب" کے اراکین اور شہر کے کچھ عمائدین پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ میں نے ان معززین کا جاویدی سے فرداً فرداً تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد اپنے مکان پر لے آیا۔ احاطہ میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ نعیمہ نئی ریشمی شلوار پہنے اور کامدانی کا دوپٹہ اوڑھے اپنے چچا کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن جونہی اُس کی اور جاویدی کی نگاہیں چار ہوئیں فرطِ حیا سے اُس کا چہرہ گلگوں ہوگیا۔ اور اُس نے جھینپ کر بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔ نعیمہ رُک گئی۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے چچا کو آداب کیا۔ اور لرزتی ہوئی آواز سے مزاج پرسی کی۔ جاویدی نے رسمی طور پر دعا دیکر اپنی گفتگو کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو پھر جوڑ دیا۔ کلکتہ کی ہنگامہ پرور آغوش زندگی۔ بہار کی ادبی خدمات۔ تصنیفات کی مقبولیت انجمن علم و ادب کے اغراض و مقاصد۔ اہل میرٹھ کی علمی دلچسپی۔ خطبہ کی کامیابی کی توقع اور دوسرے اسی قسم کے مباحث پر کچھ جو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو کسی کو بیچاری نعیمہ کا دھیان بھی نہ رہا ۔

نعیمہ تھوڑی دیر تک بیٹھی انتظار کرتی رہی کہ چچا جان اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ اُس کے گڈے اور گڑیوں کی خیریت پوچھیں۔ اس سے بند کلمے بنانے کی فرمائش کریں۔ اس کے ہاتھ کے کڑھے ہوئے کشیدے دیکھیں۔ اور تتلی یا بلبل والی نظم سنیں۔ لیکن جب ہماری باتیں کسی طرح ختم ہونے پر نہ آئیں۔ تو وہ غصے میں تمتمائی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کمرے میں سے نکل باغیچہ میں جا پہنچی۔ وہاں اس نے اپنے دل کا بخار اس طرح نکالا کہ ایک لکڑی لے کر تمام پھول توڑ ڈالے۔ اور کنکریں مار مار کر ساری چڑیاں اُڑا دیں۔ آخر کیوں نہ اُڑاتی؟ جب کوئی اسکا گانا سننے کے لئے تیار نہیں تو وہ کسی کا چہچہانا کیوں سنے ؟

(۳)

شام کو آٹھ بجے میں اور جاویدی کیننگ ہال سے واپس آئے۔ لکچر نہایت کامیاب رہا تھا۔ اور سارے شہر میں جاویدی کے علم و فضل کی دھوم مچ گئی تھی۔ رات کو نو بجے جاویدی کو رخصت ہونا تھا۔ اس لئے ہم آتے ہی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ نعیمہ میرے ساتھ کھانا کھایا کرتی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے زنانہ میں سے بلوا بھیجا۔ اوّل تو اس نے درد سر کا بہانہ کرکے آنے سے انکار کیا۔ لیکن میرے اصرار پر آگئی اور خاموش مغموم صورت بنائے ایک طرف بیٹھ گئی۔ جاویدی کی ملاقات کی خوشی میں میں خود حواس باختہ ہوگیا تھا۔ وہ پاس کی مصروفیات کے علاوہ میں آج کسی ایک موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے بھی غریب نعیمہ کے دل کے درد کو نہ پہچانا۔ اور جاویدی کی عالمانہ تقریر میں محو ہوگیا۔ میں جاویدی کی عادت سے واقف ہوں اس میں خود پسندی یا تکبر کی بو بھی نہیں ہے۔ مگر آنریبل سر کنھیالال ایم اے صدر مجلس قانون ساز یوپی کے تعریفی

جملے جو اُنہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں جاویدی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے استعمال کئے تھے۔ ایسے نہ تھے کہ وہ اُن سے متاثر نہ ہو۔ میں نے جب ان کا اعادہ کیا تو اُس کے باوقار چہرے پر سکون و اطمینان جھلکنے لگا

غرض باتوں باتوں میں یہ تھوڑا سا وقت بھی گذر گیا۔ اور معصوم نعیمہ کی اب بھی کسی نے بات نہ پوچھی۔ دستر خوان بڑھتے ہی جاویدی نے ٹوپی سر پر رکھی۔ چھڑی ہاتھ میں لی اور رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے چلتے وقت پیار کرنے کے لئے نعیمہ کو اپنے پاس بلایا۔ مگر نعیمہ کی شرارت دیکھو اُس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا۔ "آپ نے مجھ سے تتلی والی نظم نہیں سُنی۔ وہ بڑی اچھی نظم ہے میں نے اُسے زبانی یاد کر رکھا ہے"۔

نفسیات طفلی کا ادا شناس جاویدی بات کی تہہ کو پہنچ گیا۔ اُس نے نعیمہ کو گودی میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے سینہ سے چمٹا کر اُس کی پیشانی پر بوسوں کا تار باندھ دیا۔

سربستہ غنچوں پر نسیم صبح کی موجیں جو اثر کرتی ہیں۔ وہی جاویدی کے بوسوں نے نعیمہ کے چہرے پر کیا۔ اُس کی پیشانی دمکنے لگی اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

مجھ سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے جاویدی نے کہا:- "آنریبل سر کنھیا لال ایم اے کی بلند بانگ تعریف میرے لئے اتنی مسرت بخش نہیں جتنی معصوم نعیمہ کی خاموش نذر عقیدت"۔ جب جاویدی نے یہ الفاظ ختم کئے۔ تو اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے تھے۔

سجّاد

ایک راز

"اُس پروانہ کے پروں کے مانند،
جو ایک درخشاں ستارے تک پہنچنے کی سعی لاحاصل میں اپنی قوت پرواز گنوا دیتا ہے، میرے الفاظ
کمزور ہیں اور
"اظہارِ حقیقت" پر نا قادر!
میں نہیں بتا سکتا کہ میں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں۔
یا تمہاری کیا خاص بات پسند کرتا ہوں۔
کیا تم نے کبھی ایک پھول کے رنگ و بُو میں کسی پوشیدہ راز کی موجودگی کا احساس نہیں کیا ہے؟
بعینہٖ ایک ایسا ہی راز (جسے کوئی اور دریافت نہیں کر سکا)
میں نے تم میں پا لیا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

منظر عزیز

چمگادڑ

(از جناب ایم ایم اسلم)

شام ہو چکی تھی۔ کچھ جھکڑ سا چل رہا تھا۔ میں اور حامد برآمدے میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے حامد بولا:-

"آج تو کچھ خلافِ معمول گرد و غبار ہے"۔

"تو آؤ نا! اندر چل کر بیٹھیں"۔

ہم برآمدے سے اٹھ کر کمرے میں آ بیٹھے میں نے بجلی کا لیمپ روشن کر دیا۔

"کوئی نیا ریکارڈ تو نہیں لائے؟" حامد نے پوچھا۔

"ہاں ایک لایا تو ہوں۔ سنو گے؟"

میں گراموفون کو چابی دے رہا تھا کہ اچانک بجلی کی کرنٹ بند ہو گئی۔ اور کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک دو چمگادڑیں کہیں سے اندر گھس آئیں اور اِدھر اُدھر فرّاٹے بھرنے لگیں۔ حامد نے چلّا کر کہا۔

"خدا کے لئے کچھ روشنی تو کرو!"

"گھبرا گئے کیوں ہو!" میں نے کہا۔ "ابھی کرنٹ آ جاتی ہے"۔

"جہنم میں جائے تمہاری کرنٹ۔ کوئی موم بتی ہی جلا دو نا"۔

"تم تو بچوں سے بھی گئے گزرے" میں نے ہنس کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہیں اندھیرے سے بہت وحشت ہوتی ہے"۔

"اندھیرے سے نہیں" حامد نے کہا "ان کمبخت چمگادڑوں سے میری روح کانپتی ہے"۔

اتنے میں کرنٹ آ گئی اور کمرے میں روشنی ہو گئی۔

میں نے کہا:-

"بھئی حد کر دی تم نے۔ چمگادڑوں سے اتنا خوفزدہ ہونے کے کیا معنی؟"

"اعتراض کر دینا تو بہت آسان ہے۔ لیکن جس پر گذری ہو وہی کچھ جانتا ہے" حامد نے جواب دیا۔

"گذری؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو گویا تم پر بھی کوئی واردات گذر چکی ہے۔ کبھی چمگادڑیں تم سے چمٹ

تو نہیں گئیں؟"

"جادو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" حامد نے پوچھا +

"خوب!" میں نے ہنسکر کہا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی۔ بات چمگادڑوں کی ہو رہی ہے۔ اور تم جادو لے بیٹھے"

"پہلے میری بات کا جواب دو"

"ذاتی طور پر تو مجھے کچھ تجربہ نہیں" میں نے کہا۔ "لیکن اکثر لوگ جادو وغیرہ کے قائل ضرور ہوتے ہیں" +

"کبھی کسی جادوگر سے تم ملے بھی؟"

"خدا نہ کرے!"

"لیکن مجھے تو ایک ایسا واقعہ پیش آچکا ہے" حامد بولا۔ "سنو گے؟"

"ضرور!"

حامد کہنے لگا:-

"بہت مدت کا ذکر ہے۔ میں اُن دنوں سیام میں تھا"

"سیام میں کیوں گئے؟"

"ایک کمپنی کا ملازم ہوکر گیا تھا لیکن بن نہ آئی اور جلدی ہی علیحدہ ہوگیا"

"پھر وہاں کیا کرتے رہے؟"

"یہی تو سُنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم ذرا خاموش بیٹھے رہو"

"بہت اچھا!" میں نے کہا۔ "تو تم سیام کے جنگلوں میں لکڑی کاٹا کرتے تھے؟"

"یہ میں نے کب کہا؟" حامد نے جھنجلا کر پوچھا +

"میں نے یہی جانا۔ تو خیر! تم سیام میں تھے"

"تو ہاں!" حامد بولا۔ "میں سیام میں تھا۔ اور جنگلات کے ایک اجارہ دار کے پاس جسے وہاں کے لوگ "باوا" کہتے تھے۔ لکڑی کی برآمد اور درآمد کا حساب کتاب رکھنے پر ملازم تھا۔ . . ."

"یعنی کمپنی سے قطع تعلق کر لینے کے بعد؟" میں نے پوچھا +

"جی ہاں!" حامد بولا۔ "باوا کے ہاں مجھے رہتے کوئی مہینہ بھر ہوا ہوگا۔ کہ ایک روز اتفاق سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف لکڑی کا کاروبار ہی نہیں کرتا بلکہ چوری چھپے بردہ فروشی بھی کرتا ہے "باوا" کی عمر کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی جورو تھی نہ بچے۔ گھر کا انتظام باوا کی ایک بڑھی چچی کے سپرد تھا۔ جس طرح باوا جنگل کاٹنے والوں سے سختی سے کام لیتا۔ اسی طرح یہ بڑھیا خانگی معاملات میں بہت سخت گیر تھی +

گا ہے گا ہے باوا کے ہاں ایک حمید ہ کبڑا بوڑھا بھی آیا کرتا۔ لوگ اُسے حکیم کہتے تھے۔ یہ شخص ہمیشہ پالکی میں آتا۔ کہاروں کے علاوہ اس کے ہمراہ عموماً اور آدمی بھی ہوتے۔ کبڑے حکیم کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی لاٹھی ہوتی جو شکل و صورت میں بالکل سیاہ سانپ معلوم ہوتی اور بائیں ہاتھ پر ایک چگادڑ بیٹھی ہوتی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کبڑا حکیم لوگوں میں جادوگر مشہور ہے۔ اور باوا کے ساتھ ملکر بردہ فروشی کیا کرتا ہے۔ باوا کے ہاں رہتے مجھے پانچ سات مہینے ہونے کو تھے۔ لیکن میں نے اس کبڑے سے کبھی بات نہ کی تھی۔ اس کی گھناؤنی سی وضع قطع سے مجھے پہلے ہی دن سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ اسیطرح یہ کبڑا حکیم یا جادوگر بھی جب کبھی باوا کے ہاں آتا مجھے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتا ۔

ایک دن کا ذکر ہے میں اور باوا بیٹھے مزدوروں سے بات چیت کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں کبڑا حکیم آگیا کہاروں نے پالکی ہمارے پاس لا رکھی۔ باوا اور سب مزدور تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن میں بیٹھا ہی رہا آج پہلا دن تھا کہ باوا نے میری طرف ذرا گھور کر دیکھا۔ کبڑا پالکی سے اُتر کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اور میری طرف اشارہ کر کے کچھ اس طرح پوچھا گویا اس سے پہلے اس نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں ۔

"یہ کون ہے ؟"

"میرا ملازم ہے"

"لیکن ہے بہت گستاخ !" کبڑے نے حقارت آمیز تبسم سے کہا ۔

اس پر کبڑے کے ہمراہی ہنسنے لگے۔ اور کبڑا میری طرف دیکھ کر بولا ۔

"کسی روز سب بل نکال دونگا"

اب تو مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے غصے سے کہا :۔

"کیا کہہ رہے ہو تم ؟"

یہ سنکر کبڑے نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور وہی سانپ کی شکل والی لاٹھی دکھا کر کہا :۔

"خون ہی پی جاؤنگا"

ساتھ ہی باوا بھی غصے سے بولا :۔

"واقعی تم بہت بدتمیز ہو"

اور کبڑے نے ہنسکر کہا :۔

"جانے بھی دو! جانگلو ہے بالکل !"

"ٹھیک ہے !" میں نے بھی غصے سے جواب دیا "بدتمیز بھی اور جانگلو بھی لیکن بردہ فروش نہیں"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے۔ میں نے پھر کہا :۔

"اپنا حساب کتاب سنبھالو۔ میں تمہاری نوکری نہیں کرنی چاہتا"۔

بڑھیا جو دروازے سے لگی یہ باتیں سن رہی تھی۔ پاس آ کھڑی ہوئی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر بولی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

اور پھر باوا کی طرف دیکھ کر۔

"کبھی کسی کی عزت کرنا بھی سیکھو جن کو تم اپنا نوکر سمجھتے ہو وہ دراصل پیٹ کے نوکر ہیں"۔

اور کبڑا نے سر ہلا کر کہا۔

"سچ ہے! سچ!"

بڑھیا مجھے وہاں سے اٹھا کر اندر لے آئی اور رازداری کے طور پر کہنے لگی:۔

"اس کبڑے پاجی سے بچکر ہی رہنا اچھا ہے"۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"جادوگر جو ٹھہرا۔ بڑھیا نے کہا۔" جس سے بگڑے پھر اس کی جان ہی لے کر رہتا ہے"۔

"دیکھا جائیگا!" میں نے کہا۔ "میں چاہوں تو آج ہی اسے گرفتار کرا دوں"۔

"اس بھلاوے مت رہنا!" بڑھیا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری بات کا اعتبار نہ ہو تو لوگوں سے پوچھ لو۔ بیٹا! بات تو جب ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے!" یہ کہہ کر بڑھیا گھر کے دھندے میں لگ گئی۔

میں اٹھ کر باہر برآمدے میں آ بیٹھا۔ باوا اور حکیم اٹھ کر اندر جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کی آواز آنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ باوا غصے سے کہہ رہا تھا:۔

"نہ دینے والے کی ایسی تیسی"

"ہوش کی دوا کرو" یہ کبڑے کی آواز تھی۔

"کر چکا!" باوا کی آواز آئی۔ "تم نے آج کل کرتے کرتے سال گزار دیا"۔

"کوئی کام کی عورت تو ملی نہیں" کبڑے کی آواز آئی۔

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری عورتیں۔ باوا نے گرج کر کہا۔ اگر کل پرسوں تک انتظام نہ ہوا تو پھر میں دوسری تدبیر کروں گا"۔

کچھ دیر بعد کبڑا حکیم بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔ اور پالکی میں سوار ہو کر چلدیا۔

اسی رات باوا نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اور شام کی جلی کٹی باتوں کے لئے معذرت کرنے لگا۔ بڑھیا

بھی پاس بیٹھی تھی۔ پھر جن لوگوں کی طرف باوا کا قرض تھا۔ اُن کا ذکر ہونے لگا۔ سب سے زیادہ رقم اس کبڑے حکیم کے ذمے تھی۔ بڑھیا بولی:-

"تم نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے"۔

"کل تک میرا روپیہ ادا نہ ہوا تو نالش کر دوں گا" باوا نے کہا۔

"جلد بازی اچھی نہیں" بڑھیا بولی "کہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے"۔

"نقصان! مجھے! باوا نے ہنسکر کہا "محض تم لوگوں کا وہم ہے"۔

"پھر بھی"۔ بڑھیا نے کہا "دشمن کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیئے"۔

میں نے پوچھا:-

"تو کیا واقعی حکیم جادوگر بھی ہے؟"

"مشہور تو ایسا ہی ہے"۔ بڑھیا نے کہا۔

"محض سُنی سُنائی باتیں ہیں"۔ باوا بولا۔

کچھ دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح جب میں بیدار ہوا تھا تو باوا ابھی تک اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ مجھ سے پہلے اُٹھا کرتا تھا۔ میں برآمدے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ بڑھیا نے اندر سے آواز دی۔

"جلدی آؤ اِدھر"

بڑھیا باوا کے کمرے میں کھڑی تھی۔ باوا کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑھیا نے خوفزدہ آواز سے کہا:-

"ذرا دیکھو تو! اسے ہو کیا گیا"۔

میں نے آگے بڑھ کر باوا کی طرف دیکھا۔ اُف توبہ! اُس کے چہرے سے پہلے درجے کی دہشت ٹپک رہی تھی۔ اور وہ کرسی پر مرا پڑا تھا۔ باوا کے مرنے کی خبر سنکر بہت سے لوگ آ گئے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا۔ کہ سانپ کے ڈسنے سے موت واقع ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ہی کبڑا حکیم بھی آ پہنچا۔ باوا کی موت کی خبر سُنکر نہ تو اُس نے کچھ تعجب کا اظہار کیا اور نہ ہی کچھ افسوس۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اُس نے نوکر سے کہا:-

"رات میری لاٹھی اور چنگا ڈر کمرے میں رہ گئی تھی۔ ذرا اُٹھا لاؤ"۔

نوکر دونوں چیزیں اُٹھا لایا۔ اور کبڑا پالکی میں سوار ہو کر اپنے ڈیرے کی طرف چلا گیا۔

باوا کو مرے کچھ اوپر دو مہینے ہو گئے تھے۔ سب کاروبار بڑھیا خود کرتی۔ اور میری حیثیت اُس کے ہاں ایک ایجنٹ کی تھی۔ یوں تو اکثر لوگوں کی طرف باوا کا روپیہ تھا لیکن بڑھیا کو اُس رقم کی بہت فکر تھی جو کبڑے کے ذمہ تھی۔ میں اکثر حکیم کے ہاں اس روپے کی ادائگی کا تقاضا کرنے کے لئے جایا کرتا۔ اور کئی بار سخت کلامی تک بھی نوبت پہنچ چکی تھی۔ ایک روز کبڑا شام کے قریب آیا۔ بڑھیا موجود نہ تھی۔ باتوں باتوں میں میں نے اُس سے کہا کہ اب جس طرح بھی ہو دو ایک روز میں روپے کا بندوبست کر دو +

"دو ایک روز میں ؟" کبڑے نے ذرا نداق سے کہا۔ "گویا میں نے ٹکسال لگا رکھی ہے گھر پر" +

"ٹکسال وکسال تو میں جانتا نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "لیکن روپے کا تمہیں اب انتظام کرنا ہی ہوگا" +

"بہت اچھا!" کبڑے نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا "کل ہی لو!"

اور پھر مسکرا کر:-

"معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص باوا کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ وہی ضدی بن جاتا ہے" +

میں اس وقت اتفاق سے اسی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر باوا بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے کہا :-

"لینا آسان ہے لیکن دینا بہت مشکل ہوتا ہے +

"ہرگز نہیں" کبڑا بولا۔ "لیکن کسی کو مانگنے کا سلیقہ بھی آئے" +

"تو کیا میں ہاتھ جوڑ کر کہوں" +

"کون کہتا ہے" کبڑے نے کہا۔ "کہ تم ہاتھ جوڑ کر کہو۔ لیکن یہ بھی سن لو میں سخت سست سننے کا عادی نہیں +

"خیر! تو صبح میں خود آؤں یا تم آؤ گے" +

"صبح تو ہونے دو" +

شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں کافی اندھیرا تھا۔ نوکر نے برآمدے میں ایک لالٹین روشن کر کے رکھ دی تھی۔ دروازے میں سے اس کی روشنی کمرے میں آرہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ اچانک کبڑے حکیم نے پوچھا :-

"باوا کو مرے کے روز ہوئے ؟"

"کوئی دو مہینے" +

"کل دو مہینے۔ خیر! موت کا وقت کوئی تھوڑا ہی مقرر ہے +

بس اتنا کہہ کر وہ اُٹھا اور پالکی میں سوار ہو کر چلا گیا +

کھانا کھانے کے بعد میں باوا کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ بڑھیا بھی آگئی۔ ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میز پر مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ روشندان سے جو ہوا کا جھونکا آتا تو یہ لیمپ ڈھوال

دینے لگتا۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اُٹھ کر سونے کے لئے چلی گئی۔ مجھے بھی جماہیاں آ رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک بھدّی سی الماری رکھی تھی۔ اس میں کچھ پُرانی کتابیں تھیں۔ میں اس وقت کرسی پر بیٹھا ان کتابوں کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ کبڑے کی سانپ نما لاٹھی پر پڑی۔ یہ لاٹھی الماری کے پاس فرش پر پڑی تھی۔ میں ذرا آگے جھک کر دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس دُھندلی سی روشنی میں اس وقت یہ لاٹھی بالکل سیاہ سانپ معلوم ہوتی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ دوسری کرسی کے نیچے سے ایک چمگادڑ نکل کر کمرے میں چکّر کاٹنے لگی۔ اور پھر میری طرف جھپٹی۔ اور اپنے بازو سے میرے سر پر طمانچہ مار کر سامنے الماری پر جا بیٹھی میں نے مدافعت کے لئے کوئی چیز تلاش کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ناگہاں میری نظر پھر کبڑے کی لاٹھی پر پڑی۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہ وہی سیاہ لاٹھی ایک سانپ کی طرح میری طرف رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ میرے پاس سوا اُس ایک چاقو کے جو میں ہمیشہ جیب میں رکھا کرتا تھا۔ اور کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اسے کھولوں وہ کمبخت چمگادڑ پھر میری طرف آئی۔ اور اب تو دائیں بائیں سے میرے منہ پر اپنے بازوؤں سے طمانچے مارنے لگی۔ ساتھ ہی سانپ جست بھر کر بالکل میرے قریب آ گیا۔ چاقو سے سانپ کا حملہ روکنا حماقت تھی۔ میں نے ردّی کے کاغذات کی بانس کی ٹوکری جو میز کے ساتھ رکھی تھی اُٹھا لی اور جب وہ موذی پھن اُٹھا کر مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں نے جلدی سے ٹوکری آگے بڑھا دی۔ سانپ اپنے پہلے حملے میں ناکام ہو کر تڑپ کر پیچھے ہٹا لیکن چمگادڑ کے حملے برابر جاری تھے۔ لیکن اس وقت مجھے چمگادڑ کا تو کچھ اتنا خوف نہ تھا۔ میری نگاہ تو دوسرے خوفناک دشمن پر جمی ہوئی تھی۔ سانپ اس وقت الماری کے پاس پھن اُٹھائے اپنی خوفناک آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں چاقو تھا اور دوسرے میں وہی بانس کی ٹوکری۔ میرے دیکھتے دیکھتے۔ وہ موذی بجلی کی طرح تڑپ کر پھر میری طرف آیا اور میں نے پھر وہی ٹوکری آگے کر دی۔ اب کے اُس کا سر ٹوکری کے ایک سوراخ میں پھنس گیا۔ اور وہ پورے زور سے اپنا سر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے چاقو منہ میں دبا کر میز پر جو پانچ سات بڑے بڑے رجسٹر پڑے تھے اُٹھا کر سانپ کے اوپر رکھ دیئے۔ اور اوپر سے دونوں گھٹنے رکھ کر دبا لیا۔ اور پھر چاقو ہاتھ میں لے کر چاہتا تھا کہ اس کے پھن میں گھونپ دوں کہ اچانک مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اور اس غنودگی میں میں نے خواب سا دیکھا کہ میں اُس کبڑے حکیم کی گردن دبوچے بیٹھا ہوں۔ اور وہ بڑی عاجزی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں اس حالت میں کب تک رہا کچھ بتلا نہیں سکتا۔ لیکن جب میری آنکھ کھُلی تو اس وقت سورج نور کی تھیلی کھول چکا تھا۔ میں میز کے پاس فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ کبڑے حکیم کی لاٹھی ردّی کی ٹوکری کے پاس پڑی تھی۔ اور چمگادڑ الماری سے چمٹی ہوئی تھی ♦

کوئی آٹھ نو کے درمیان کبڑا آیا۔ اور آتے ہی کہا:-

"وہ رات میری لاٹھی اور چنگا دڑ تمہارے کمرے میں رہ گئی تھی۔ وہ تو ذرا لا دو"۔

"میں کیا جانوں!" میں نے کہا۔ "جہاں چھوڑ گئے تھے وہیں جا کر دیکھ لو"۔

وہ جب اندر گیا تو میں بھی ساتھ ہی اندر چلا آیا۔ اور پوچھا:-

"روپے لے آئے ؟"

"بیٹھو تو جاؤ!" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ نا!"

میں نے لپک کر اُس کی سانپ نما سیاہ لاٹھی اُٹھا لی اور دوسری کرسی پر بیٹھ کر کہا:-

"حکیم! تم بردہ فروش ہی نہیں بلکہ بڑے خطرناک شعبدہ باز بھی ہو"۔

"بردہ فروش! شعبدہ باز!" یہ الفاظ اُس نے رُک رُک کر کہے "کون میں ؟"

"اور باوا کے قاتل بھی!"

"کہیں بھنگ تو نہیں پی صبح صبح ؟"

میں نے غصّے سے پوچھا:-

"یہ لاٹھی اور چنگادڑ کل تم یہاں کیوں چھوڑ گئے ؟"

"بھول گیا تھا!"

"بڑے انجان ہو!" میں نے طنزاً کہا۔ "جس رات باوا سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا اُس روز بھی تم یہ دونوں چیزیں یہاں بھول گئے تھے"۔

"ممکن ہے!" وہ بولا۔ "آخر غلطی انسان سے ہوا ہی کرتی ہے"۔

"تم انسان نہیں شیطان ہو" میں نے غصّے سے کہا۔ "سمجھ لو! مجھ پر یہ منتر نہ چلیں گے!"

"منتر؟" اُس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ آج اس کی آواز میں وہ پہلا سا تحکّم نہ تھا۔ میں نے پھر اسی طرح غصّہ سے کہا۔

"رات تمہاری نجاست سے میں پریشان تو ضرور رہا۔ لیکن مجھے اتنا افسوس ضرور ہے کہ میں نے تمہاری گردن کیوں نہ توڑ ڈالی"۔

"بھائی!" کبڑا بولا۔ "تم نے مارنے کی ٹھان رکھی ہے"۔

میں نے ذرا اور گرم ہو کر

"رات تم نے جو حرکت کی اس سے تمہارا مطلب کیا تھا"۔

"پھر وہی لڑائی کی بات!" حکیم ہنسکر بولا۔ "اچھا اب صلاح کیا ہے ؟"

"صلاح کیسی" میں نے پوچھا۔

"میری سنو! میرا جھگڑا تو باوا کے ساتھ تھا لیکن تمہیں اس قضیے سے کیا مطلب ؟ رات کو بیٹھک میں

زک اُٹھائی لیکن شاید۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا:

"تو گویا تم مجھے دھمکاتے ہو۔ اور جو میں پولیس میں اطلاع کر دوں؟"

"پولیس میں اطلاع کر دو گے۔ لیکن کچھ ثبوت بھی؟"

"یہ لاٹھی!"

"سیانے ہو کر بچوں کی سی باتیں کرتے ہو"

"حکیم!" میں نے کہا۔ "ہو واقعی خوش قسمت جو میرے ہاتھ سے بچ گئے!"

"ہاں!" اُس نے پھر مسکرا کر جواب دیا۔ "ہم دونوں میں سے ایک خوش قسمت تو ضرور ہے۔ لیکن تم یہ کہو کہ اگر میں باوا کے روپے جلد ادا نہ کر سکوں، تو تمہارا بھی اس میں کچھ نقصان ہے؟"

"نہیں!"

"تو پھر تم یوں تقاضا کیوں کرتے ہو؟"

"بڑھیا جو مجبور کرتی ہے!"

"سمجھ گیا!" کبڑے نے سر ہلا کر کہا۔ "اب سمجھ گیا۔ سمجھ لونگا اس لومڑی سے۔ ہاں بھائی! تمہارے معاملے میں مجھ سے غلطی ضرور ہوئی۔ معاف کر دو"

میں چونکہ خواہ مخواہ اس پاجی کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"مجھے کیا! تم آپس میں جس طرح چاہو نپٹ لو"

اس واقعہ کو بہت روز گذر چکے تھے۔ میں نے اس تمام عرصے میں حکیم سے روپے کے لئے کچھ نہ کہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑھیا مجھ سے بہت ناراض رہنے لگی۔ اور میں نے بھی یہ ارادہ کر لیا کہ بارش کا موسم ختم ہوتے ہی وطن لوٹ جاؤنگا۔ اب اس قسم کا سب کام بڑھیا خود ہی سرانجام دیتی۔ چونکہ طبیعت کی سخت واقع ہوئی تھی اس لئے لین دین کے معاملہ میں بہت سختی کرتی۔ اور خاص کر کبڑے حکیم سے تو اُسے ایک قسم کا بیر سا ہو گیا تھا۔ نت نئے روز اس سے تقاضا ہوتا۔

ایک روز بازار میں ہی دونوں کا سامنا ہو گیا۔ وہیں سے کچھ جھگڑتے ہوئے دونوں گھر آ گئے۔ لین دین کے کاغذ نکالے گئے۔ بڑھیا مصر تھی کہ حکیم ایک ہی بار سب روپیہ ادا کر دے۔ لیکن حکیم کو بعض رقوم سے سرے سے ہی انکار تھا۔ وہ باوا کے حساب کو غلط بتاتا اور بڑھیا اُسے جھوٹا کہتی تھی۔ بڑھیا نے آپے سے باہر ہو کر کبڑے کو صلواتیں سنائیں۔ میں گو اس وقت دخل دینا نہ چاہتا تھا تاہم میں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی اس پر بڑھیا مفت میں مجھ پر بھی برس پڑی۔ آخر حکیم اُٹھ کر چلا گیا۔ اور میں نے بھی اُسی رات رختِ سفر باندھا۔ اور صبح

چلے جانے کی ٹھان لی۔ اگلے روز کوئی سات کے قریب بیل گاڑی جس پر سوار ہو کر مجھے جانا تھا آ پہنچی۔ میرا مختصر سا اسباب اس پر لاد دیا گیا۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس چڑیل سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں۔ لیکن طبیعت نے اتنی بے مروتی گوارا نہ کی۔ میں نے نوکر سے کہا کہ وہ بڑھیا سے جا کر میرا سلام کہے۔ لیکن وہ جاتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگا آیا۔ میں نے پوچھا:۔

"خیر تو ہے؟"

"ارے!" نوکر گھبرائی ہوئی آواز سے بولا۔ "وہ تو مری پڑی ہے۔ ذرا چل کر دیکھئے تو سہی"۔

میں جب اُس کے کمرے میں گیا تو وہ پلنگ پر چت پڑی تھی۔ چہرا ایسا بھیانک ہو رہا تھا کہ دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ پلنگ کے قریب ہی فرش پر وہی سیاہ سانپ نما لاٹھی پڑی تھی۔ اور وہی منحوس چمگادڑ بستر سے چمٹی ہوئی تھی۔

پچھلے پہر جب لوگ بڑھیا کی لاش ٹھکانے لگا چکے تو وہ موذی کبڑا آیا۔ پانچ سات منٹ خاموش بیٹھا رہا اور پھر اپنی لاٹھی اور چمگادڑ لے کر چلا گیا۔ لیکن میں نے اس پاجی کی پھر شکل نہ دیکھی اور اسی رات سے وہاں سے چلا آیا۔

ایم اسلم

ہما خانم

ایران جدید کا ایک دلچسپ ناول

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از یلدرم)

[پہلے ابواب کا خلاصہ:- حسین علی خاں اپنے ایک مرحوم دوست کی بیوی اور لڑکی ہما خانم کی پرورش کرتا ہے۔ لڑکی کے جوان ہو جانے پر حسین علی خاں کو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکی کو بھی حسین علی خاں سے محبت ہے۔ لیکن وہ ایک نوجوان منوچہر پر عاشق ہو جاتی ہے۔ مگر پھر یہ دیکھ کر کہ اس رشتہ سے حسین علی خاں کو رنج پہنچیگا۔ وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ منوچہر کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اور وہ حسین علی خاں کے درپے آزار ہے۔ اور اس مقصد کے لئے اخبارات کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ حسین علی خاں کی اپنی بیوی سخت علیل ہے۔ حسین علی خاں ہما خانم سے مصروف گفتگو ہے]

دو شخص جو ایک دوسرے کے شریک عمر رہنا چاہتے ہیں۔ اور زندگی کی لذتوں کو اس اشتراک سے حاصل کرنا چاہیں۔ اگر عشق کی زنجیر انہیں ایک دوسرے سے وابستہ نہ کرے۔ تو دنیا کا کوئی رابطہ نہیں باندھ سکتا۔ حقیقی زناشوئی یعنی دو ایسے انسانوں کی زندگی متحد جو ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں بصورت بالا کے علاوہ محض ایک تجارتی لین دین رہ جاتی ہے۔ کہ اس کا نتیجہ ایک ضرر رومی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دل ایک دوسرے سے بندھے ہونے چاہئیں۔ میری پیاری ہما! اگر جان دیکر یہ ممکن ہوتا کہ میں تمہارے دل کو حاصل کر لیتا۔ تو میں ایک لمحہ کا پس و پیش نہ کرتا۔ لیکن دل بیچا نہیں جا سکتا۔

ہما کے آنسوؤں نے اُس کے دامن کو بھگو دیا۔ حسین علی خاں نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں بوسہ دیا اور کہا:-

"اگر تم اپنے بھائی کو دوست رکھتی ہو۔ تو جو میں کہوں اُسے مانو تمہاری بھلائی اسی میں ہے"

ہما۔ (دھیمی اور لرزتی ہوئی آواز سے) آپ غلطی پر ہیں۔ میں اُسے بھول جاؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو رنج پہنچے۔ اس زندگی سے میرے لئے مرنا بہتر ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں کس مصیبت میں ہوں"

حسین علی خاں نے دیکھا کہ اس کی بنائے استقامت متزلزل ہونے کو ہے۔ قریب ہے کہ عشق اُس کی چشم عقل کو اندھا کر دے۔ وہ اُٹھا۔ اور کہنے لگا:-

"ہما جان۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس رنج و عذاب میں مبتلا ہو۔ اور تمہارے دل میں احساسات متضاد کی کیسی جنگ جاری ہے۔ اس مشکل کا حل مجھ پر چھوڑو۔ ہمارا یہ قرار ہونا چاہئے کہ ایک ہفتہ تک اس معاملے میں ایک دوسرے سے گفتگو نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ میں نجات کا ایک راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔ انشاء اللہ تم بھی اُس کو پسند کرو گی۔

ہما۔ بشرطیکہ آپ بھی اُس سے راضی اور خوش ہوں۔

(۲۱)

منوچہر خاں کا گھر

جمعہ کا دن ہے۔ گذشتہ گفتگو کو چھ دن ہو چکے ہیں۔ منوچہر افسردہ حالت میں کرسی پر بیٹھا ہوا باغ کے پھولوں پر اس طرح نظر ڈال رہا ہے گویا انہیں دیکھ نہیں رہا۔

جب نوکر نے کہا:- "ایک شخص حسین علی خاں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے" تو وہ کرسی سے ایکدم اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا اور سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس نام کے سنتے ہی اُس کے مخیلہ میں سینکڑوں خیالات کا ہجوم تھا جو ایک دوسرے کو ریلتے ہوئے چلے گئے۔ اُس نے نوکر سے کہا:- "بلا لو"

اُس نے چاہا کہ استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن کینے کا جذبہ مانع رہا۔ اُس نے چاہا کہ شرمندگی کی وجہ سے وہاں سے بھاگ جائے لیکن پاؤں نے یاری نہ کی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ [illegible] حسین علی خاں نے قریب پہنچ کر اُسے سلام کیا۔ منوچہر نے سر جھکا کر سلام کا جواب دیا اور کہا "کہئے کیا حکم ہے"؟

حسین علی خاں نے [illegible] منوچہر کو دیکھا تھا۔ اُس کے [illegible] اور [illegible] چہرے پر اُس کی نظر پڑی۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنی [illegible]

[illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] [illegible] کر لی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] [illegible] ساری قوتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اور اُس کے [illegible] سب کو بیکار کر دیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہُوا ہے اور اُس کے اعصاب شکستہ ہیں۔ منوچہر نے اُس پاگل کی طرح جو زنجیر [illegible] غور سے دیکھ کر کہا:-

"ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہے۔ کونسا احسان جتایا جا رہا ہے [illegible] دونوں کی بدبختی کے [illegible] اور کیا چاہتے ہو۔ آہ! میں سمجھا تم انتقام لینا چاہتے ہو مگر [illegible] حاصل ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلا [illegible] [illegible] بیٹے ہو [illegible] اگر میں نے مردانگی سے کام لیا ہوتا تو اس وقت مجھے [illegible] تمہاری باتوں [illegible]

[illegible] قبول کی کوئی [illegible] دوں"۔

حسین علی خاں نے کرسی پر بیٹھ کر اور سر نیچا کر کے تھوڑی دیر تک سوچا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ منوچہر کے دماغ میں خلل واقع ہو گیا ہے اس کے دل میں اُمید کی ایک چمک بجلی کی چمک کی طرح پیدا ہوئی اور اُس نے یوں کہا کہ اگر منوچہر دیوانہ ہو گیا ہے تو اُسے ہما کے شوہر ہونے کا حق حاصل نہیں رہا۔ ہما کا عشق مرور ایام سے ختم ہو جائیگا۔ کیا حسن اتفاق ہے۔ بغیر اس کے کہ میری کوئی تقصیر ہو۔ یا میرے اوپر کوئی ذمہ داری ہو مقصد حاصل ہو گیا۔

مگر وہ ایک [illegible] سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ نا اُمیدی کی تاریکی اس پر پھر چھا گئی۔ ایک نیا خیال اُس کے دل میں گذرا اور اُس نے سوچا: "ہما نے سارا واقعہ منوچہر سے بیان کر دیا ہے اور اُس سے کہدیا ہے کہ وہ میری خاطر اپنے عشق سے قطع نظر کرے گی۔ اس [illegible] [illegible] کا باعث بھی رہا ہے اور چونکہ ایک [illegible] مزاج جوان [illegible] احساسات رکھتا ہے اور اس میں وہ [illegible] عشق کے [illegible] نہیں کھیلا جا سکتا"

ان خیالات کے دل میں آنے کے بعد اُس نے کشادہ پیشانی کر [illegible] کہا۔ "چونکہ میں تمہارے حال سے واقف ہوں۔ اس لئے میں تمہارے نامناسب الفاظ کو قبول کرتا ہوں [illegible] رنجیدہ نہیں ہُوا مگر تمہیں سخت غلط فہمی ہوئی ہے میں جانتا [illegible] عشق [illegible] حاصل نہیں ہُوا اور نہ [illegible] کہ تم دونوں جو ہر طرح ایک دوسرے کے موزوں اور مناسب ہو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ منوچہر [illegible] تم بھی میرے عزیز بیٹے ہو جاؤ گے"

[illegible] گویا وہ [illegible] خواب سے بیدار ہُوا۔ اُس نے [illegible] ٹھنڈے پسینے کو جو اس کی پیشانی پر آ گیا تھا۔ پونچھ کے اور [illegible] آنکھیں حسین علی خاں کے قدموں پر گاڑ کر دھیمی مگر [illegible] آواز سے کہا: "آپ جلیل القدر آدمی ہیں۔ میں نے آپ کے بلند پایہ اخلاق کی نسبت سُنا تھا لیکن مجھے یقین نہ آتا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ میں پست و حقیر ہوں عشق نے مجھے گمراہ کر دیا تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں

کہ عشق کیسی بلا ہے۔ اُس نے مجھ میں عقل و وجدان سب کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کیا کیا لیکن اب کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں اپنی خطا کی خوفناک شکل سے ڈر رہا ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی شرافت میری ناسزا باتوں سے داغدار نہیں ہوتی لیکن اس سے پہلے میں بھی ایک صاحب اخلاق و شرافت آدمی تھا۔ اور اُس کے نکات کو سمجھتا ہوں۔ آپ میرے جرم کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ میں شرمندہ نہ ہوں"۔

حسین علی خاں بے اختیار ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے بدن میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اُس کی نظر میں درندگی اور تہاجم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور اُس نے کہا "تو یہ کارروائی تمہارا کیا ہوا ہے۔ مجھے خبر نہ تھی۔ اگر کوئی اور کہتا تو میں یقین نہ کرتا تم بے ایمان ہو۔ تم میں شرافت نہیں"۔

اس وقت منوچہر سمجھا کہ حسین علی خاں اس کی کارروائی سے بے خبر تھا۔ اب اس نے اپنی ضعیت کو خطرے میں پایا۔ دبی ہوئی آواز سے اُس نے کہا۔ "بیشک میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں لیکن آپ بڑے ہیں مجھے معاف فرمائیں۔ عشق نے مجھے اندھا اور بہرا کر دیا تھا اور میری تمام قوتیں سلب کر لی تھیں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کو ہما کی جان کی قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیجئے"۔

ہما کے نام نے حسین علی خاں کے دل کو پگھلا دیا۔ اُس کے زخم کی سوزش میں کمی آ گئی اور اُس نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ اور ایک لمحہ کی فکر کے بعد کہا:۔

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب مجھ میں تمہاری طرف سے کوئی بغض نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اب میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم ہما خانم کے شوہر بنو۔ اصلی عشق روح کو نجیب اور دل کو مہربان کر دیتا ہے۔ جو شخص راستی کا دوست ہے۔ وہ ہر چیز میں اپنے محبوب کی شکل دیکھتا ہے۔ اور کسی کو اذیت نہیں پہنچا سکتا۔ اس کا دل دوستی و محبت سے بھرا رہتا ہے۔ اور اُس کے دل میں بغض و کینہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر تم متمدن انسان نہیں ہو۔ میں متمدن انسان اُسے کہتا ہوں جو اپنے لئے ایک مقام اور ایک شخصیت معین کر لیتا ہے۔ اور اپنے رفتار و کردار میں ایک محکم اصول کا پابند رہتا ہے۔ لوگوں کی شرافت و ناموس کا تحفظ و احترام و ادب اپنا پہلا فرض خیال کرتا ہے کسی کی ہتک عزت (اور وہ بھی جھوٹ و بہتان کے ذریعے سے) ایک ایسا جرم ہے جو میرے نزدیک قتل سے بھی زیادہ خوفناک اور زیادہ قابلِ نفرین ہے۔ اگر تم کھلم کھلا میری جان لینے کی کوشش کرتے تو میں تمہیں معذور سمجھتا لیکن تمہارا طرزِ عمل قابلِ چشم پوشی نہیں۔ اور تمہاری شرافت کو محو کر دیتا ہے جس شخص میں شرافت ہے۔ اُسے نہ عشق نہ مال اور جان کا خوف اُس سے غیر شریفانہ کام کرا سکتا ہے۔ دولت و مرتبہ یہانتک کہ عشق بھی اگر بے شرفی اور پستی نفس کے ذریعے سے خریدا جائے وہ پرکاہ کے برابر قیمت نہیں رکھتا۔ تمہارا یہ عذر کہ عشق نے تمہیں اندھا اور بہرا کر دیا تھا قابلِ قبول نہیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ تم متمدن انسان نہیں اور تم ہما کے شوہر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے"۔ یہ کہکر وہ دروازے کی طرف روانہ ہوا۔ منوچہر ایک سکتے کی حالت میں یہ سب سن رہا تھا۔ اُسے جب ہوش آیا تو حسین علی خاں دروازے سے نکل رہا تھا۔ وہ دوڑا اور اُس نے حسین علی خاں کے بازو پکڑ کے آہستہ سے کہا اور کہا "میری ایک عرض سن لیجئے پھر چلے جائیے گا"۔ حسین علی خاں کے متوجہ ہونے پر منوچہر نے کہا: "میں ایک بے بس آدمی ہوں آپ مجھے گمراہی سے نجات دیجئے۔ آپ نے جسقدر خیال کیا ہے میں اتنا برا نہیں۔ ممکن ہے میں پھر ایک اچھا انسان ہو جاؤں۔ آپ اپنی نظرِ التفات مجھ سے پھیر نہ لیجئے۔ اگر آپ مجھے بالکل معاف نہیں کر دیتے۔ تو بہتر۔ جلیئے میں خودکشی کر لونگا۔ مگر اُمید ہے کہ آپ ایک آدمی کے قتل پر راضی نہ ہوں گے۔ ہما خانم کا واسطہ، مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ جو فرمائینگے میں وہ کرونگا۔ یہ صحیح ہے کہ میں اُس کی ہمسری کی لیاقت نہیں رکھتا اور میں اُس کی آرزو بھی نہیں کر سکتا لیکن میں عفو کا طالب ہوں میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک با عزت و شریف انسان بنونگا۔ . . آپ کو قسم ہے خدا کی میری بات نہ کاٹئے۔ بڑے لوگ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور میں توبہ کرتا ہوں"۔

وقت حسین علی خاں کی طبیعت میں ایک سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ ایک وقت اُس کے دل میں یہ خیال گذرتا تھا کہ منوچہر کی یہ توبہ۔ یہ سب بناوٹی ہے اور اس لئے ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرلے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دل اس خیال کو رد کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اُس کی توبہ پر بناوٹی ہونے کا حکم لگانا ایک بے طرف حاکم کا حکم نہیں ہے بلکہ منوچہر کی رقابت کی وجہ سے ہے۔ اس وقت خود اپنے تئیں مجرم قرار دیکر اپنے کو قابل مواخذہ و سرزنش تصور کرتا تھا اور اپنے دل میں کہتا تھا۔ ابھی میں شرافت کی بحث کر رہا تھا۔ کیا خود میں بے شرف و بے انصاف نہیں ہوں۔ نہ اِس اس پستی اور کمینگی سے۔ تو جلکر تمام ہونا بہتر ہے"۔ اپنا حال دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور اُس نے بہ آواز بلند کہا "میں نے معاف کیا۔ لیکن اپنے خدا اور اپنے وجدان کی قسم کھاؤ کہ آئندہ اصول شرافت و نجابت کے خلاف کبھی قدم نہ اُٹھاؤ گے"

منوچہر (خوشی کے ہیجان کے ساتھ) "کیا درست ہے۔ کیا آپنے مجھے معاف کیا؟ میں اپنے خدا اور اپنے وجدان کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں ہر موقع اور ہر حال میں جادۂ شرافت سے منحرف نہ ہونگا۔ اور راستی کے لئے اپنی جان قربان کردونگا"۔

حسین علی خاں نے اُس کے چہرے کو بوسہ دیا اور پھر ذرا رک کے کہا۔ "اچھا جاؤ۔ ہما خانم سے ملاقات کرو۔ اور شادی کے انتظامات کرو۔ میں سفر میں جا رہا ہوں۔ اور اسکا مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں شادی میں شریک نہ ہوسکونگا۔ مگر کوئی علاج نہیں۔ میں نوکر ہوں اور نوکری پر جانا ضروری ہے۔ اور ہاں آج کی باتوں کا ہما سے مطلق ذکر نہ کرنا۔ انشاءاللہ جلد لوٹ کر تم سب سے ملونگا"۔

منوچہر۔ "مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دوں"۔

حسین علی خاں جلدی سے گھر سے باہر آیا اور اپنے مکان کی طرف تیز تیز روانہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی تیز رفتاری سے اپنے دل کے اضطراب پر غالب آئے۔ وہ اپنے خیالات کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تعجب کر رہا تھا کہ وہ کیونکر اپنے تئیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت سے محروم کر رہا تھا۔ اس فداکاری پر اُسے کونسی چیز مجبور کر رہی تھی۔ وہ کونسا جذبہ تھا جسے پورا کرنے کے لئے وہ زندگی اور خوشی اور اُمید سب کو قربان کر رہا تھا۔ دل رو رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر ایک غمگین تبسم تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ضمیر کو راضی کرنے میں کامیاب ہوا لیکن کس طرح؟ دل کو زخمی اور مجروح کرکے۔

(۲۲)

راستے میں

موٹر کار کی جس وقت آواز آئی حسین علی خاں کانپنے لگا۔ دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ آخری بکس بند کرکے وہ گھر سے باہر آیا۔ اس کے بعد اُسے معلوم نہ ہوا کہ کیا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ قزوین کے راستے پر جا رہا ہے۔ شاہ آباد تک وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ اس لئے کہ اُس کے خیالات ایک شکل مشخص اختیار نہ کرسکتے تھے۔ جس وقت شوفر ریڈیٹر میں نیا پانی بھرنے کے لئے موٹر سے اُترا۔ وہ بھی اُترا۔ اور ایک قہوہ خانے کے پیچھے جا بیٹھا۔ بیابان کے خشک اور غم انگیز منظر میں اُس نے ہمدردی پائی۔ گویا اُسے ایک دوست مل گیا ہے جس سے وہ اپنا درد دل کہے۔ اُس کے گرم آنسو خشک زمین پر گر رہے تھے۔ اس لئے کہ اپنے تئیں تسکین دینے کو اُسے زیادہ وقت ملے۔ وہ آبادی سے ذرا دور چلا گیا۔ کبھی چلتا تھا۔ اور کبھی رُک جاتا تھا۔ مختلف خیالات جو اپنی معشوقہ کے متعلق مجسّم ہوکر اُس کے سامنے آ رہے تھے اُن میں ناگہاں اُس نے دیکھا کہ ہما اپنے ہاتھ منوچہر کی گردن میں حائل کئے ہوئے ہے اور دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ اُس کے آنسو رُک گئے۔ اور اُس کے چہرے میں ایک سختی اور ایک کیفیت تصمیم پیدا ہوئی۔ اُس نے سوچا: "کوئی وجہ نہیں کہ میں اس دوروزہ عمر کو ایک خیال موہوم کی بناء پر بدبختی اور ناکامی میں گذاروں۔ اور وہ خوشی جو میرے لئے ممکن ہے اپنے ہاتھ سے دوسرے کو دیدوں۔ کیا نادانی۔ کیا حماقت ہے۔ اخلاق۔ وجدان۔ خدا سب اجازت دے رہے ہیں کہ میں اس لطف و سعادت سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اور اگر اجازت نہ بھی دیں تو کیا ہوگا۔ اصل یہ ہے

میں بالکل دیوانہ ہوں۔ ٹوٹی ہوئی قسمت کو ہاتھ سے [illegible] بیٹھا ہوں۔ یہ کس حساب میں درج ہوگا۔ کیا میں دوبارہ دنیا میں زندگی گزارنے آؤنگا [illegible] کو دوست رکھتی ہے۔ اس کا دل کسی اور کا ہے۔ اچھا مانا اگر میری کامیابی [illegible] نظر نہیں آتا۔ اپنے دل میں جو جذبات و خیالات رکھے مجھ پر [illegible] اور اُس کے جذبات روحی اور اُس کے دل کے میلان کی ذرا پروا نہ کرکے وہ کس نقصان میں رہتے ہیں۔ جو زندہ رہنا چاہئے [illegible] کی رضامندی حاصل کر لی جاتی ہے۔ ہمارا اپنے عشق کو [illegible] قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ [illegible] کیوں [illegible] میں یہیں سے لوٹ کر واپس [illegible] موٹر [illegible] فوراً مجھے واپس جانا چاہئے۔ میں نے کیا حماقت کی [illegible] سے اپنی جان دوسرے کے ہاتھ [illegible] دشمن کو۔ ایک بے رنگ [illegible] فوراً لوٹنا چاہئے" تیز تیز قدم اٹھا کے وہ [illegible] آیا تو [illegible] کہ شوفر کے چلانے کی آواز آئی۔

"آقا! آپ کیوں تشریف نہیں لاتے۔ دیر ہو رہی ہے۔ [illegible] ہو جائے گا"

حسین علی خاں اسکول کے لڑکے کی طرح جو استاد کی ڈانٹ سے ڈرتا ہو سمٹا سمٹایا آ کے جلدی سے موٹر پر سوار ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ شوفر سے کہے "طہران کو واپس چلو" مگر گویا خواب میں تھا۔ یہ الفاظ اُس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

موٹر تیزی کے ساتھ قزوین کے راستے پر چل دی۔

(۴۳)

حسین علی خاں کا خط سہیلی کے نام

ہمشیرہ عزیزہ [illegible] مجھے خیال [illegible] مجھے معلوم تھا کہ اس [illegible] ہوگی۔ قریب تھا کہ میں عشق کو [illegible] خندق کے کنارے لڑکھڑا رہا تھا اور گویا [illegible] اگر عشق میری مدد نہ کرتا تو میں اس [illegible] خود پسندی [illegible] کے ناپاک بسر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوتا۔ اور ملامت ضمیر کے شکنجے میں [illegible] گرفتار ہوتا۔ مگر میں مرہون عشق ہوں [illegible] ہوں۔

ہاں میں [illegible] ممنون ہوں کہ تم نے مجھے زندگی کے سب سے بڑے [illegible] تمام [illegible] اگر وہ ترک ہو جائے تو ہماری ساری کوششیں بیکار ہو جاتی [illegible] خیال انسانی میں ایک بہشت ہے جو غبار سے خالی ہے [illegible] کدورت نہیں۔ اس بہشت تک پہنچنے کی آرزو ہمارے [illegible] ہے جو تم نے مجھے زندگی کے اصلی محرک [illegible] بہشت [illegible] کا دروازہ میرے لئے کھول [illegible] سعادتمندی پر [illegible] ہے کہ [illegible] یہ نفس [illegible] ہے۔

"[illegible] عشق نیست"

[illegible] کی [illegible] نہ کہ اُس کی [illegible]

عقل کی [illegible] ہے کہ وہ عشق کے راستے میں مشکل [illegible] اُس کے نازک اور حساس وجود کو محفوظ [illegible] عقل سلیم ہے جب تک کہ وہ [illegible] سے [illegible] عاشق [illegible] جو [illegible] آراستہ نہیں وہ ایک بے سکان کشتی [illegible] ہے۔ وہ حوادث کے طوفان کے تھپیڑے سہتا ہے۔ اور [illegible] کی کوہ شکن موجوں میں گرفتار رہتا ہے۔

[illegible] عزیزہ اگر تمہاری عنایت سے جسارت حاصل کرکے تمہارا [illegible] میں کو اپنی بے تصور محبت پر [illegible] کر دیتا تو اس وقت [illegible] سارے [illegible] نفس کے [illegible] ہوگی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور دوری سے سرد ہو جاتی ہے۔ میں نے منوچہر سے ملاقات کی اور اسے تمہارے پاس بھیجی۔ تم دونوں کو چاہئے کہ پہلے سے زیادہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ میرا دنیا سے تعلق صرف اسقدر رہ گیا ہے کہ میں تمہاری خوشی کی آرزو کروں۔ اس کے سوا میری اب کوئی آرزو نہیں ہے۔ اور زندگی میں مجھے کوئی لطف نہیں۔ اگر تم مجھے عزیز رکھتی ہو تو تم ہمیشہ اسی طرح خوش رہ سکتی ہو کہ تم کبھی ہوا سے میری خوشی کی کوشش کرو۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ آخری مرتبہ میں تم سے بغیر ملے ہوئے چلا آیا۔ مجھے خوف تھا کہ تم اپنے ساتھ مجھے پیار سے روک لیتیں۔ میری اور میرا مہربان اماں جان سے میرا سلام کہنا اور کسی طریق مناسب اس بات کی معذرت چاہنا کہ میں بغیر ان سے رخصت ہوئے چلا آیا اور مجھے بھول نہ جانا۔

تمہارا

حسین

(۲۴)

ہما خانم کے گھر میں

اس کاغذ نے جو جادو کا سا اثر ہما کی طبیعت پر کیا۔ اس کو صرف منوچہر کی نگاہ ہی بیان کر سکتی تھی۔ اس خط کو پڑھتے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ منوچہر ہما کے گھر میں آیا۔ ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور انہوں نے وہ کچھ کہا جسے زبان بھی بیان نہیں کر سکتا۔ جو خیالات ان کے دلوں میں گزرے ان کو الفاظ ان کا مطلب بیان کر سکیں۔ ان کا حال اور عذر خطا دونوں کو ایک ہی ساتھ بیان کر دیا۔ منوچہر کا حال اچھا نہ رہا تھا۔ ہما کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ان کے بدلے میں خوشی تھی۔ منوچہر نے سلام کر کے کہا کہ اگر میں پھر آیا تو یہ میرا قصور نہیں۔ حسین علی خاں بھائی نے مجھے حکم دیا۔ ورنہ میں اتنی جرأت نہ کرتا۔ اب میں ٹھہروں یا چلا جاؤں۔ آپ جو فرمائیں وہ کروں۔ ہما نے جواب دیا۔ یہ سمجھ کر میں خوش ہوں۔ تو جہاں تک ہو سکے میرا کہا کرو۔ تم نے جو کچھ کیا درست ہوا۔ اس لئے تم بیٹھ جاؤ۔ یہ سب میرے ہی ہاتھ میں ہے اور کیا کہوں کہ چلے جاؤ۔ نہیں مجھے بھی سمجھ ہے کہ تم سے بہتر میرے لئے کوئی نہیں۔ اس کی شرح مجھے تمہاری بات کرنی ہے۔ یاد کر کیا دن تھا جب ہما نے

میری تمام عمر گذشتہ پر ایک سیاہ پردہ کھینچ دیا۔ اس نے ہما کو ایک صوفے پر بٹھایا اور اس کے پاس خود بھی بیٹھ گیا۔ ہما اس طرح جیسے کسی پژمردہ پھول کو دبا لیا ہو سر نرم تھی۔ اور آنسو کی اطاعت کر رہی تھی۔

منوچہر۔ ہما جان کچھ بولو تو۔ تم جو کچھ کہو وہی ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان چند ہفتوں میں مجھ پر کیا گزری اور مجھ پر کیسا ظلم و ستم ہوا۔ تم مرد نہیں ہو تمہیں خبر نہیں۔ سچ کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ مگر ہاں یہ کہ تم کہ پرنسپل ہو اور مسکرا دو تو ہمارے۔ بے اختیار منوچہر پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں تبسم اور مہربانی تھی۔ منوچہر کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ایک آہ بلند سے اس نے اپنے غم کے بوجھ کو سینے سے ہٹا دیا۔ دونوں نیچے ہما بھی اس بھول پر شرمندہ ہو گئی اور اپنا سر نیچے ڈال کے پھر سوچ میں چلی گئی۔ اور اس نے چشم دل سے دیکھا کہ حسین علی خاں بھی حسرت و ناامیدی کے ساتھ اس مجلس پر نظر ڈال رہا ہے اور لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ مگر آنسو ان کے قطرے اس کے رخساروں سے ڈھلک کر زمین پر گر رہے ہیں۔ ہما نے چاہا کہ اٹھ کے بھاگ جائے۔ مگر اس وقت کی طرح جو ابھی ہما کے پاس تھا وہ منوچہر کے پہلو سے ہٹ نہ سکی۔

منوچہر:۔ ”ہما جان کس فکر میں ہو جبکہ اس مرتبہ بھائی جان نے خود اجازت دی ہے۔ اور خود مجھے بھیجا ہے۔ پھر تردد کا کونسا مقام ہے“

ہما۔ ”مگر بھائی جان نے کب مخالفت کی؟“

منوچہر:۔ ”ہاں بدقسمتی سے یہی خیال کرتا تھا“

ہما (بگڑ کر) ”کس نے یہ کہا اور کس نے یہ جھوٹ جوڑا۔ اسے سوائے میری خوشی کے اور کوئی آرزو نہیں۔ تمہاری اسقدر تعریف کرنے تھے اور مجھے آمادہ کرتے تھے کہ بیچارے نے خود تمہیں بھیجا۔ تم ہی کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہیں کسقدر اصرار سے۔ اگر تمہیں اس کا اندازہ ہوتا تو غلط خیال ہرگز نہ کرتے“

منوچہر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس نے ہما سر جھکا کے دیکھتی اور سے اس طرح کو یا خود اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے کہا:

”ہائے میں کیا کہوں۔ میں اتنا ناسمجھ تھی۔ میں ہوں۔ اور حسین علی خاں

نیک اور بزرگ ہے۔ میں اُس کے مقابلے میں پست و حقیر ہوں۔ کس طرح ممکن ہے؟ میں کس طرح تلافی کر سکتا ہوں؟"

ہما۔ "کیسی تلافی؟"

منوچہر جواب نہ دے سکا اور تھوڑی دیر رُک کے کہنے لگا:-

"اسی بُرے خیال کی تلافی جو میں نے اُس کی نسبت کیا"

ہما۔ (سر کو ناامیدانہ حرکت دے کر) میں نہیں جانتی کس طرح تلافی ہو سکتی ہے"

اس طرح ہما بھی خود اپنے دل سے باتیں کر رہی تھی۔ اور اپنے اندرونی سوال کا جواب دے رہی تھی۔ عشق و ندامت ان دونوں کو چار طرف کھینچ رہے تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے اصلی افکار و واقعات سے ناواقف تھے۔ ہما نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ حسین علی خاں اچھا آدمی ہے"

منوچہر۔ (کچھ سوچ کر) اس کا معلوم کرنا مشکل نہیں۔ میں نے اول دفعہ آج اُن سے ملاقات کی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے کوئی مرشد میری ہدایت کے لئے بھیجدیا ہے۔ میرا مرا ہوا دل زندہ ہو گیا مجھے معلوم ہوا کہ محبت کیا چیز ہے اور شرافت انسانیت کیا ہیں۔ اصل یہ ہے کہ میں نجات کے راستے پر پہنچ گیا۔ اب میری محبت صرف تمہارے لئے ہے۔ اُس میں اب میری ذات کو دخل نہیں۔ اب تم جو حکم دوگی وہ کرونگا +

میں تمہارے احساسات لطیف و نازک کو اب سمجھا ہوں کیونکہ اب میں نے اندازہ کیا ہے کہ اس مرد شریف کے ہاتھوں تمہاری تربیت ہوئی ہے"

ہما۔ (آہ بھر کر) تم نے اب بھی حسین علی خاں کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ واقعات میں جو تم نہیں جانتے۔ اُسکی عالی ظرفی اور بڑائی میں نے دیکھی ہے۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اُس کی خوشی میں کچھ مدد کر سکتی۔ اور جو خوبیاں میں نے اُس میں دیکھی ہیں اُن میں سے ہزار میں سے ایک کا عوض دے سکتی"

منوچہر۔ "تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بھی اُسکی خدمت کے واسطے ہر قربانی کے لئے حاضر ہوں"

مقصود دونوں کا ایک تھا۔ لیکن ہما خیال کرتی ہے کہ منوچہر اُس کے انکار سے بے خبر ہے۔ مگر دونوں کے ان فقروں کی صدا ابھی کمرے سے محو نہیں ہوئی تھی کہ عشق نے دونوں پکڑ کر اپنے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور کیا +

ایک نگاہ کا مبادلہ ہوا تھا کہ یہ تمام احساسات جو انمردی باطل ہو گئے۔ اور دونوں نے حسین علی خاں کا پھر ذکر نہ کیا۔ ورنہ ایام ہجر کا ذکر رہا اور بالآخر منوچہر نے کہا:- "اپنی آئندہ زندگانی کا سامان جسقدر جلد ممکن ہو ہمیں کرنا چاہئے۔ اور تمام خیالات کو پس پشت ڈالنا چاہئے"

ہما نے چند سکنڈ زمین پر اپنی پریشان نظر گاڑ کے اپنی نازک آواز سے عاجزانہ طور پر کہا: "اس معاملے میں آج اور کچھ مت کہو"

منوچہر نے ڈر کے مارے جواب نہ دیا +

۲۵

قزوین میں

حسین علی لفافہ نہیں کھول سکتا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ ہما کی تحریر سے بوئے بے مہری نہ آتی ہے۔ اُس نے اُس کے حکم کو قبول کر لیا ہو۔ اور منوچہر کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہو۔ اور پھر اس سے بھی خوف کھاتا تھا کہ وہ اپنے عزم و ایثار پر قائم رہی ہو اور اُس کی خاطر اپنی خوشی کو مٹا دے +

اُسے دونوں ستا رہے تھے۔ اور وہ پریشان متردد ہما کی وفاداری و بے وفائی۔ مہر و بے مہری دونوں کا نتیجہ اُسکی بدبختی تھی +

آخر اپنے اوپر غلبہ حاصل کر کے اُس نے لفافہ کھولا لکھا تھا:-

"اپنے بھائی جان پر قربان! میں نے آپ کے نامۂ عزیز کی زیارت کی۔ میں اُس سے کسقدر متاثر ہوئی بیان نہیں کر سکتی۔ یہ بھی عجیب دنیا ہے۔ آپ مجھ سے فرار کریں! میرے لئے کسقدر رنج اور شرمساری کی بات ہے۔ میں نے کیا کیا تھا۔ کونسا گناہ مجھ سے سرزد ہوا تھا کہ میں اس بے التفاتی کی مستحق قرار دی گئی۔ ہاں آپ اپنے آرام کی خاطر بھاگ گئے اور مجھے مشکلات میں ڈال گئے + مگر نہیں۔ میں اگر ایسا خیال کرتی تو بیشک آپ سے بیشک گلہ و شکایت

کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں میری بھلائی کے لئے کرتے ہیں۔ بہرحال میں اتنی جرأت کرکے عرض کرتی ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ میرے معلم اور تربیت کنندہ ہیں۔ آپ کی آنکھ جن نکات دقیق کو دیکھتی ہے۔ میں خوردبین سے بھی انہیں نہیں دیکھ سکتی۔ آپ انسان کی روح و قلب کی گہرائیوں کے اسرار کو پڑھ لیتے ہیں۔ دل کی آرزوؤں کو پہچانتے ہیں۔ اور اُس کے سریع و عجیب تغیرات کا قوانین مسلّم کے تحت میں تجزیہ کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے دل سے حیلہ، جنگ کرتے ہیں۔ اور اُس کی رفتار کو اپنے حکم کی مطابقت میں لے آتے ہیں۔ لیکن نوع بشر کے ایک بہت بڑے حصے یعنی عورتوں کے احساسات آپ سے ابھی تک پوشیدہ ہیں۔ اور اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں آپ کو اُن کی صحبت ہی کب نصیب ہوئی ہے +

اچھا موقع ہے۔ اُس قرض کے دریا کا جو آپ کا مجھ پر ہے ایک قطرہ آپ کو واپس دوں۔ اجازت دیجئے میں بھی آپکو ایک چھوٹا سا سبق دوں۔ یہ میرے لئے بہت بڑا فخر کا باعث ہوگا اور آپ کے لئے دومنٹ کی سرگرمی۔ آپ کے خیال میں وہ لطیفہ ہوگا۔ ایک عالم اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا مطالعہ میں مشغول تھا۔ اتنے میں ایک چھوٹی لڑکی آئی۔ کہنے لگی میں آتشدان سے ایک دو انگارے لے جانا چاہتی ہوں۔ عالم نے کہا "بیٹی! تمہارے پاس برتن تو ہے نہیں کس چیز میں لے جاؤ گی۔ لڑکی ہنسی اور آتشدان کے قریب گئی۔ پہلے تو اُس نے اپنی ہتھیلی پر بہت سی راکھ جمادی۔ پھر اُن پر دو ایک دہکتے انگارے رکھ کر باہر چلی چلی گئی۔ عالم حیران رہ گیا۔ اسی طرح میں بھی جو کچھ کہونگی۔ وہ بھی اسی بچی کی طرح نئی بات نہیں ہے۔ لیکن غالباً آپ کی معلومات میں اس سے اضافہ ہوگا +

عورت کی تاریخ زندگانی شروع سے آخر تک محض داستان محبت ہے۔ اور عشق اُس کے خیالات کا محور۔ عورت محبت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ حالانکہ مرد کا اساس فکر جنگ و جدل و تفوق غلبہ ہے۔ عشق میں بھی یہی فکر تفوق اُس کے دل میں جاگزیں رہتا ہے۔ مرد میں جذبۂ عشق بھی جذبۂ مبارزہ کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے جس عورت کا حاصل کرنا مشکل ہے اُسے چاہتا ہے جب اُس کا ملنا آسان ہو جاتا ہے۔ اُس کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

مرد ایک شکاری ہے اور میدان شکار جتنا سخت۔ اور شکار جتنا تیز بھاگنے والا یا اُڑنے والا ہوگا۔ اُتنا ہی شکاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مرد میں عشق عورت کی خوبصورتی سے پیدا ہوتا ہے۔ عورت کی اس صفت پر وہ تمام صفتوں کو قربان کردیتا ہے۔ مرد کے لئے عورت ایک شکار سے زیادہ نہیں۔ اور عشقبازی تلاش شکار +

آپ سب مرد یہ چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کے جذبات عشق کو اپنے احساسات روحی پر قیاس کریں۔ اور ہمارے قلب نازک کے تاثرات کا اندازہ اپنے سخت دلوں کے ہنگام جنگ کی بیتابی و شوق سے کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ساتھ ہر معاملے میں آپ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اور ہر جگہ غلطی کرتے ہیں۔ ہمارے متعلق مردوں کے تصوّرات یا اعتقادات سرتاسر غلط ہیں۔ آپ کی آنکھیں سوائے ہمارے اعمال ظاہر کے اور کچھ نہیں دیکھتیں اور آپ کے کان سوائے ہماری باتوں کے اور کچھ نہیں سنتے۔ مگر آپ میں سے کسی میں ہمارے صحیفۂ دل کے پڑھنے کی استعداد نہیں۔ اور غالباً کبھی نہ ہوگی۔ اپنے سطحی اور نمائشی عشق میں مرد جسقدر آہ و نالہ و فریاد و فغاں کرتے ہیں ہم عورتیں کہ سلطنت عشق کی اصلی مالک ہم ہی ہیں عشق کی سختی کو متانت سے برداشت کرتی ہیں۔ ہم رنج سہتے ہیں اور دم نہیں مارتے +

مرد کی خوبصورتی ہمارے لئے شرط عشق نہیں۔ ہماری تیز بین نظر اُس کی سیرت کو دیکھتی ہے۔ سیرت کی زیبائی و زشتی کو پرکھتی ہے۔ اور پھر اُس پہ معتقد یا اُس سے متنفر ہوتی ہے۔ روح نجیب ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور مردانگی ہمیں تسخیر کرتی ہے۔ ہم کسی کی بدبختی سے رقت میں آجاتے ہیں ہم محبت کے بندے ہیں۔ حالانکہ عورت کی بے نیازی و تکبر سے مرد کا شعلۂ عشق و حرص اور بلند ہوتا ہے۔ اور اس کی بے محبتی اُسے اپنی طرف دوڑاتی ہے۔ اور اگر وہ محبت کرے تو مرد کا عشق ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ہاں محبت ہم عورتوں کو اپنا حلقہ بگوش کرلیتی ہے۔ ہمارا دل موہ لیتی ہے۔ اور ہمارے قوت انتقا

کو ہم سے سلب کر لیتی ہے جس محبت کے ساتھ شجاعت اور جوانمردی توام ہو وہ عورت کے دل میں عشق پیدا کرتی ہے۔ وہ عشق نہیں جو مردوں میں ہوتا ہے بلکہ وہ عشق ایک مضبوط علاقہ ایک شدید جنون ہوتا ہے۔ جس کے مقابل میں تمام دنیا بھی ایک پرکاہ سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی عاشق عورت دنیا کو اور جو کچھ کہ دنیا میں ہے اُسے معشوق پر نثار کر دیتی ہے۔ مگر عاشق مرد؟ میں آپ کو مردوں کے زمرے میں شمار نہیں کرتی آپ فرشتہ ہیں +

اس تمہید کے بعد میں عرض کرتی ہوں کہ آپ عورتوں کے احساسات سے واقف نہیں۔ کیونکہ میں اس وقت خیال آپ خود ہیچ اُٹھا کر راحت کی جستجو کر رہے ہیں آپ [illegible] مجھے [illegible] تکلیف پہنچ رہی ہے +

میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ آپ کو پہلے ہی [illegible] چاہئے میری موجودہ حالت آپ کی ہی خوبی کا نتیجہ ہے۔ [illegible] میرے ساتھ دوسرے طریقے پر [illegible] کرتے [illegible] جبر کرتے [illegible] کا اظہار [illegible] جبر [illegible] کر [illegible] میری حالت تبدیل [illegible]

آپ کی [illegible]

اگر کوئی [illegible] شاعری [illegible] تصویر ایک جگہ اور ایک شکل میں بنا سکتا تو وہ [illegible] جان کی اس وقت کی تشبیہ ہوتی۔ اُس کے دل میں [illegible] احساسات کی جو [illegible] تھی اُس سے اُس کی [illegible] تمام [illegible] سے اُس نے اپنا دل [illegible] کی آواز [illegible] کے [illegible] [illegible] سوچتا تھا [illegible] کوئی جذبہ [illegible] اچھا یا بُرا [illegible] کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ ایک مرد میرے اور اُس کے درمیان ہے بس میں کیوں نہ ہوں اور وہ کیوں ہو؟ ہر حالت میں ایک کامیاب ہوگا اور ایک ناکامیاب۔ اس لئے کیا وجہ ہے کہ محروم میں رہا ہوں۔ زندگی میں میری تقصیر کیا ہے؟ [illegible] اس کے لئے میں نے تکلیفیں سہیں [illegible] اُس کی تربیت ہوئی کیا یہ انصاف ہے کہ جو میوہ میں نے اس محنت سے تیار کیا۔ دوسرا اُس سے متمتع ہو اور میں حسرت سے تکا کروں +

ہاں ملکیت اُن زحمتوں کی بناء پر جو میں نے اُٹھائیں میرا حق ہے اور اپنا حق حاصل کرنے میں دوسرے کے حصے کو [illegible] ہے جس طرح دوسرے کے معشوق [illegible] گناہ اور جرم ہے۔ اپنے حق کی حفاظت نہ کرنا بھی پست ہمتی ہے۔ کل صبح اُسے فوراً کھو نکا کر آ جائے۔ [illegible] اور اس [illegible] کا خاتمہ کر دونگا۔ مگر ایک [illegible] انگشت [illegible] کی طرف اٹھائی [illegible] کے شوق کے شعلے [illegible] سست پڑ گئے۔ اس کا سر نیچے کو [illegible] اپنے دل سے کہا کہ حق [illegible] دل میں مجھ سے پہلے اُس نے [illegible] کہ اپنی خاطر اس کی روح کو شکستہ [illegible] ایک شخص کو [illegible] عشق کمال [illegible] ساری سے آزردہ ہو۔ [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] دونوں طرف [illegible] چاہتے ہے۔ [illegible] کے دل کو [illegible] کی محبت میں گرفتار ہو جیسا اُس [illegible] کرنا۔ اور [illegible] راحت کا سامان فراہم کرنا عشق و مروّت [illegible] سے دور ہے۔ اگر میرا عشق سچا ہے تو مجھے چاہئے کہ میں محض معشوق [illegible] کامی سے وہی لذت حاصل کروں جو [illegible] ناکامی جو معشوق کی خوشی کے لئے اختیار کی جاتی [illegible] اس کی لذت وصل معشوق سے زیادہ ہے [illegible] ہو گئی تو وہ اُٹھ کے مطالعہ کے کمرے میں گیا۔ اور اس نے [illegible] یہ لکھا:-

[illegible] عزیزہ سجاجان۔ میرا دل [illegible] جلسی کہ تم نے [illegible] دی ہے) خوب اظہار ناراضگی کروں [illegible] تمہیں بُرا

بھلا کیوں۔ میں نے بہت سوچا کہ کیا لکھوں تاکہ اظہار ناراضی ہو۔ مگر تمہاری عزیز ہستی کے تصور کے ساتھ ہی۔ یہ خیال اور تشدد آمیز الفاظ میرے دماغ سے فرار کر جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے۔ اگر اس کی جرأت کرتا تو تمہیں یقین آتا؟

جو سبق تم نے دیا ہے وہ میرے لئے وحی آسمانی ہے۔ میں تمہارا حلقہ بگوش ہوں۔ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کی شکرگذاری میں اس ناعطلے سے تمہارے ہاتھ چومتا ہوں۔ گر تمہارا درس میرے لئے قابل عمل نہیں ✦

میں کہ میرے جسم کا رُواں رُواں تمہاری خوشی کی تمنا رکھتا ہے۔ اگر میں ہی تمہاری بدبختی کا باعث ہو جاؤں تو اہرمن کی حکمرانی کا قائل ہونا پڑیگا۔ دُنیا تاریک ہے اور ہم سب اندھے ہیں جنہیں اپنا راستہ سوجھائی نہیں دیتا۔ گڑھے سے نکلتے ہیں کوئیں میں گرتے ہیں۔ وہ جو مدعیٔ عقل ہے وہ سب سے زیادہ حیران ہوتا ہے۔ نادان کو تردد و تفکر کی زحمت اُٹھانی نہیں پڑتی۔ وہ وہ سیدھا سامنے چلا جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات محض اتفاقاً زیادہ آرام سے منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ عقیدۂ تقدیر بھی ایک بڑی تسلی ہے۔ ہاں تقدیر کا حکم یہی تھا کہ میری طرف سے تم رنج و غم میں رہو اور میں زندہ رہوں ✦

اگر یہ خیالات سدِّراہ نہ ہوتے۔ تو میں خوشی کی بلند چوٹی پر ہوتا اور دنیا کے تمام عیش میری خوشی کا معاوضہ نہ ہو سکتے۔ تمہاری محبت کی آگ نے مجھے کھوٹ سے ایسا صاف و پاک و رقیق کر دیا ہے کہ میں اس کثیف دنیا میں نہیں۔ آسمانوں میں پرواز کر رہا ہوں۔ میری آنکھ میں بدی داخل ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں ہر چیز میں تمہیں ہی دیکھتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں سب کی خطاؤں کو گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں۔ میری تمام کوشش یہ ہے کہ دوسرے خوش رہیں تاکہ تم خوش رہو۔ کاش یہ کیفیت اور لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی تو دنیا سے مناقشہ اور جھگڑا اُٹھ جاتا۔ ستانا اور مزاحمت کرنا پلٹ کر شیطان کے جسم میں ہی جا چھپتا ✦

میں یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ باہر شور کی آواز آئی۔ میں گیا دیکھوں کیا ہے۔ سارا دن اُسی میں کٹ گیا۔ چونکہ واقعہ قابل ذکر ہے۔ اس لئے تمہیں بھی سُناتا ہوں۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس واقعے سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اُس سے تمہیں دلچسپی ہوگی۔

ایک دیہاتی مرد اور ایک عورت چیخ چلا رہے تھے اور ترکی زبان میں داد و فریاد کر رہے تھے۔ سید ابوالقاسم تحصیلدار مالیہ بڑی سختی سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ ان دونوں کو باغ سے نکال باہر کریں۔ میں جب پہنچا تو اس شور و شغب میں تھوڑا سا سکون پیدا ہُوا۔ میں نے پوچھا کیا واقعہ ہے۔ ابوالقاسم بولے: "قربان! کچھ نہیں۔ یوں ہی مفت میں بک بک جھک جھک کر رہے ہیں"۔ مرد و عورت دونوں چلاّنے لگے: "ہمارا ایک استغاثہ ہے"۔ خلیل جو ترکی جانتا ہے مترجم بنا۔ اور مرد کی زبان سے خلاصۂ استغاثہ یوں بیان کیا:۔

"دو ماہ پیشتر، سید ابوالقاسم دیہات زہرا میں مالگذاری وصول کرنے گئے تھے۔ اور اس بڈھے سے بارہ تومان اور دو خروار جنس کا مطالبہ کیا۔ بیچارے کے پاس اتنا کہاں کہ وہ اس مطالبے کو ادا کرے۔ آخر بہت گفتگو و شنید کے بعد یہ قرار پایا کہ وہ اپنی لڑکی جو اُس کے کہنے کے مطابق نو یا دس سال کی ہے۔ ابوالقاسم سے بیاہ دے۔ اور ابوالقاسم اس کے عوض میں سرکاری مالگذاری اپنی جیب سے ادا کریگا۔ ابھی ایک مہینہ نہیں گذرا تھا کہ ایک سرا تحصیلدار اس بیچارے کے سر پر آ دھمکتا ہے۔ اور اُسے ایسا سخت پکڑتا ہے کہ بڈھا اور اُس کی عورت دونوں راتوں رات گاؤں سے بھاگ کے یہاں آتے ہیں۔ سید ابوالقاسم سے سارا واقعہ بیان کرتے ہیں اور اپنی لڑکی سے ملنا چاہتے ہیں۔ سید ابوالقاسم اول تو انہیں پہچانتے ہی نہیں۔ اور خوب گالیاں دیتے ہیں۔ بالآخر کئی دن کی کشمکش کے بعد اور اس خوف سے کہ کہیں رئیس مالیہ (کلکٹر) کے پاس شکایت نہ پہنچ جائے۔ اُنہوں نے بڈھے سے کہا "لیلیٰ تو بھاگ گئی۔ معلوم نہیں کہاں ہے"۔"

اس پر ظاہر ہے کہ ماں باپ نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ مجبوراً جناب سید لڑکی کی تلاش کرتے ہیں۔ کئی دن کے بعد پتہ چلتا ہے

کہ وہ سبزی فروش ہمسائے کے گھر پناہ گزین ہے۔ اور سبزی فروش نے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ اب ماں باپ لڑکی ابوالقاسم وسبزی فروش سب جمع کئے گئے۔ اور معاملے کو طے کیا۔ دیہاتی یہ کہتا ہے کہ لڑکی کی قیمت میں ابوالقاسم نے جسقدر مالگذاری ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُسے یا تو وہ خود دیں یا سبزی فروش دے تاکہ وہ گھر لوٹیں۔ مگر روپیہ کسی کی جیب سے نہیں نکلتا ✤

میں نے سبزی فروش اور لڑکی کو طلب کیا۔ سبزی فروش ساٹھ سال کا بڈھا ہے۔ اُس کی لمبی میلی کچیلی داڑھی اُس توبڑے کی مانند ہے جو کسی گدھے کے منہ میں لٹکا ہوا ہو۔ ایک نہایت میلا کپڑا سر کو لپیٹے ہوئے ہے۔ اور اُس کے کثیف ہاتھ گرم چادر میں چھپے ہوئے ہیں۔ اُنہیں وہ باہر نہیں نکالتا۔ اور کمال بے حیائی سے کہہ رہا ہے:-

"یہ لڑکی خدا نے میرے لئے بھیجی ہے جس رات یہ میرے گھر آئی میں فوراً اُسے محلے کے پیش نماز آغا شیخ رمضان کے پاس لے گیا۔ اُنہوں نے میرا نکاح پڑھ دیا۔ میرا . . . کبھی حرام کے لئے نہیں کھلا۔ ابھی وہ مجھ سے مانوس نہیں ہوئی۔ بچوں کی ماں اُس پر بہت ترس کھاتی ہے۔ اور ہر رات اُسے اپنے ہی پاس سُلاتی ہے۔ میں نے اُس کا نام بدل کے اب خداداد رکھ دیا ہے۔ یہ دیہاتی آ کے مجھ سے روپیہ مانگتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ میرے ممنون احسان ہوں۔ اس لڑکی کے پاؤں میں جوتی دتھی۔ میں نے خرید دی۔ اسی رات میں نے بچوں کی ماں کے ساتھ اسے حمام کو بھیجا۔ دونوں وقت کا کھانا ہمارے ساتھ ایک رکابی میں کھاتی ہے"✤

میں نے پوچھا: "جب یہ لڑکی تیرے گھر آئی تو تو نے یہ نہ پوچھا کہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ ممکن تھا کسی دوسرے کی عورت ہو"✤

سبزی فروش۔ مجھے ان باتوں سے کیا غرض ہے۔ خود ہی اُس نے چند روز بعد کہا کہ ایک آدمی آیا تھا اور اُس کے ماں باپ سے جبراً لے لیا۔ میں بہت روئی چلائی۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اُلٹا میرا باپ مجھے مارتا تھا اور کہتا تھا چپ رہ۔ پھر وہ مرد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ . . . . لڑکی دوسرے روز اُس گھر سے بھاگ نکلی"✤

میں۔ "تمہیں معلوم نہ ہوا کہاں سے بھاگ کے آگئی؟"

سبزی فروش۔ (گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھ کے) "مجھے ان باتوں سے کیا غرض"✤

میں۔ "شیخ رمضان نے تو یہ پوچھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور اس کے پہلے کے حالات کیا ہیں؟"

سبزی فروش۔ (مسکرا کر) بالغ لڑکی سے ماں باپ کے متعلق سوال نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ لڑکی نو سال کی ہے۔ بس جب اُس نے "ہاں" کہہ دیا۔ کافی ہے"✤

اب جتنا میں اُس سے کہتا ہوں کہ یہ دوسرا نکاح ناجائز ہے اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اُسے ایسا سخت پکڑے ہوئے ہے کہ تین چار آدمی بھی لڑکی کو اُس کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتے۔ بیچاری لڑکی چلا رہی ہے "میں اپنی اماں کی لڑکی ہوں"✤

آخرکار میں نے سبزی فروش کو پانچ تومان حمام کے اور چند دن لڑکی کے کھانے کا خرچ سبزی فروش کو دے کر اُسے چھڑایا اور سبزی فروش کو دفع کیا۔ پھر ابوالقاسم سے طلاق دلوائی:-

دیہاتی کی مالگذاری بھی میں نے اپنے ذمہ لی۔ کہتے ہیں کہ لڑکی نو سال کی ہے۔ مگر اتنی دُبلی اور ضعیف ہے کہ سات سال سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی۔ اُس کی اُنگلیاں چڑیا کی ٹانگوں سے ذرا ہی موٹی ہوں گی۔ ہر وقت روتی ہے اور خوف سے کانپتی ہے کہ وہ اُنہیں آدمیوں میں سے کسی کے ہاتھ بیچ ڈالی جائیگی✤

جب ابوالقاسم اور سبزی فروش دونوں چلے گئے۔ تو اُس کی جان میں جان آئی۔ لیکن پھر بھی اپنے باپ کے خوف سے اپنی ماں کے پہلو میں گھسی جاتی تھی۔ اور اُس کے پیچھے چھپتی تھی میرا دل اُس کے لئے بہت کڑھ رہا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ پھر تھوڑی سی قیمت پر کسی کے ہاتھ فروخت کر دی جائیگی۔ اور معلوم نہیں کہ نیا خریدار ابوالقاسم یا سبزی فروش سے بہتر ہوگا یا نہیں۔ میں نے خیال کیا کہ میں اس بیچاری بچی کو ان پانچ تومان

کے شر سے نجات دوں۔ اور بطور شادی کے تحفے اور منہ دکھائی کے اُسے تمہارے پاس بھیجدوں۔ تاکہ تم اُس کی تربیت اپنے ہاتھوں میں لو۔ اور لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق تمہارے جتنے نظریئے ہیں اُن سب کو اس پر عمل میں لاؤ۔ دو تین دن میں اس کی ماں کے ساتھ اُسے طہران بھیجونگا۔ اور جب تم سے مانوس ہو جائے گی تو ماں واپس آجائے گی ۔

اب آؤ ، اپنے متعلق پھر سلسلۂ کلام چھیڑیں۔ عزیز ہما جان! میری خوشی اور آسودگی اُس وقت پوری ہوگی جب میں تمہیں خوش اور کامراں دیکھونگا۔ تم یقیناً مجھے جانتی ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کسی صورت اس پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں اپنے اوپر قربان کردوں۔ اس مبحث پر زیادہ گفتگو کرنا۔ اور بحث و مباحثہ کو طول دینا دلوں کو رنج دیتا ہے۔ تمہاری جان کی قسم کہ میرے نزدیک سب سے بڑی قسم یہی ہے۔ اگر تم نے اپنی شادی کا جلد انتظام نہ کیا اور اُس کی خوشخبری مجھے لکھ کے نہ بھیجی۔ تو میں تم سے سخت ناراض ہو جاؤں گا۔ اور پھر تم سے خط و کتابت بند کردونگا ۔

میں نے اپنا گھر تمہیں قبالہ کردیا ہے۔ وہ دستاویز بھیجتا ہوں۔ اور خرچ کے لئے پانچسو تومان کی ایک ہنڈی بھی ملفوف ہے۔ اُسے حاجی عبداللہ تاجر ہمدانی سے وصول کرلینا۔ میرے پاس جو تھا وہی تھا۔ کاش مجھ میں قدرت ہوتی کہ ساری دنیا تمہیں بخش دیتا۔ اگر منوچہر آسکے تو بہت اچھا ہو کہ تم دونوں چند روز کے لئے قزوین آجاؤ۔ لطف رہے گا۔ اور ہمارا وقت اچھا کٹ جائیگا۔ اگر آؤ گی تو اپنی اماں جان کو ضرور ساتھ لانا ۔

اپنی پیاری ہما پر قربان

حسین علی

(باقیدارد)   "یلدرم"

بانگِ درا

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

بانگ درا علامہ اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ ہے جس میں ابتدا سے لے کر آج تک کی نظمیں درج ہیں۔ اگرچہ حضرت علامہ نے اپنے افکار کے اظہار کیلئے اب زبان فارسی کو منتخب فرمالیا ہے لیکن ان کے جس کلام نے اسلامیانِ ہند کی موجودہ نسل کو بیدار کیا۔ وہ ان کا اردو کلام ہے۔

اقبال کی حقیقت ترجمانی اور اسکی سحر آفریں نغمہ پیرائی کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آفتاب کی درخشانی و تابانی کی مدح سرائی البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ شاعری کی روح مدتوں سے خوابیدہ تھی مشرق کے اس زندۂ جاوید شاعر کی نظموں نے اسے ایک رقص جاوید عطا کیا۔ نوجوانانِ اسلام کی قوتِ عمل مردہ ہو چکی تھی اقبال کے حیات آفریں ترنم نے ان کی رگوں میں خونِ غیرت کی حرکت تازہ کر دی ✦

بانگِ درا ہمارے احساسات لطیفہ کیلئے زندگی کا پیغام ہے۔

بانگِ درا حسنِ تخیل۔ حسن بیان اور نکات و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے ✦

بانگِ درا کی ایک جلد ہر اسلامی گھرانے میں موجود ہونی چاہئے۔ قیمت بلا جلد عہ۔ مجلد سے

اسرار و رموز (فارسی) یعنی اسرار خودی و رموز بیخودی ہر دو یکجا۔ یہ وہی مثنویاں ہیں جن سے اہل صوفیا میں ہلچل پڑ گئی تھی۔ انکی تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے ہی کشتیٔ قوم منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے بلا جلد عا۔ مجلد عہ

پیام مشرق (فارسی) یہ کتاب جرمن شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اور اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی۔ ملی اور مذہبی حقائق کو پیش نظر لانا ہے۔ جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ یہ کتاب اہل مشرق کی ہر قسم کے مذہبی انقلاب میں رہنمائی کریگی۔ قیمت بلا جلد سے مجلد عہ ✦

زبورِ عجم (فارسی) علامہ کے تازہ ترین افکار کا مجموعہ اور قوم کے لئے پیغام حیات۔ قیمت بلا جلد عہ۔ مجلد للعہ

جاوید نامہ۔ علامہ موصوف کی جدید ترین فارسی نظموں کا مجموعہ جو ڈانٹے کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے بلا جلد عہ مجلد للعہ

لیکچر انگریزی۔ جو علامہ نے علیگڑھ اور مدراس میں دیئے۔ قیمت مجلد پانچ روپے ✦

اقبال۔ علامہ اقبال کی سوانحعمری۔ ان کے منظومات۔ ان کے مقصد شاعری اور خیالات کے نشو و نما۔ مضامین کلام اور طرز بیان پر ایک نظر۔ اس سے بہتر اور مستند حالات آپ کو نہیں ملیں گے ✦ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ **شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور**

بائرن

بائرن کا پورا نام جارج گورڈن بائرن ہے - اس کا تعلق انگلستان کے ایک قدیم خاندان سے تھا - جسے شجاعت اور جنگجوئی کے اعتبار سے سارے ملک میں شہرت حاصل تھی - اس کا باپ کپتان جان بائرن نہایت شوریدہ سر شخص تھا - اور اکثر اوقات عجیب و غریب حرکات کر گزرتا تھا - اس نے اپنے حصے کی جائداد تھوڑے دنوں میں ہی اڑا دی - پھر ایک خاندانی امیر لارڈ کارمارتھن کی بیوی کو لے بھاگا - جب عسرت و افلاس کا زمانہ آیا - تو ایک دولتمند خاتون مس گورڈن سے شادی کر لی - کچھ دنوں میں اس کی جائداد بھی عیش و عشرت کی نذر ہو گئی - اب اس نے اندھا دھند قرض لینا شروع کیا جب قرضخواہوں نے تنگ کیا - تو بھاگ کر فرانس چلا گیا - اور وہیں ۱۷۹۱ء میں انتقال کیا ؛

لارڈ ولیم بائرن جو بائرن خاندان کا سردار تھا - اور رشتے میں جارج بائرن کا دادا ہوتا تھا - نہایت ظالم اور سفاک شخص تھا - اسکی زندگی عجیب ہنگاموں میں بسر ہوئی تھی - ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک رشتہ دار مسٹر چاورتھ کو قتل کر ڈالا - اس جرم کی سزا تو موت تھی - لیکن جب مقدمہ ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش ہوا - تو لارڈ ولیم بائرن بچ نکلا ؛

بائرن کی ولادت ۱۷۸۸ء میں بمقام لندن ہوئی - ابھی اس کی عمر تین سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا - اب لے دے کے ان کے دامنِ شفقت کا سہارا رہ گیا تھا - لیکن شوہر کی ... نے اس بیچاری کو تقریباً دیوانہ بنا دیا تھا - اُسے غصہ آتا تھا - تو وحشیوں کی طرح بال نوچتی اور کپڑے پھاڑتی تھی - اور کسی پر بس نہ چلتا تھا - تو بیٹے پر غصہ نکالتی تھی - اس طرح بائرن کا بچپن بڑی دشواریوں اور مصیبتوں میں بسر ہوا - نہ اس نے شفقت پدری کا لطف اٹھایا - نہ مہر مادری سے لذت اندوز ہوا ؛

بائرن کی شوریدہ سری اور وارستہ مزاجی ہمیشہ سے ارباب قلم کا محبوب موضوع سخن بنی رہی ہے - لیکن اس کے بچپن کے ماحول اور خاندانی حالات پر غور کیجئے - تو اس کی طوفانی زندگی کا کوئی واقعہ چنداں حیرت انگیز معلوم نہیں ہوتا - وہ محبت سے محروم رہا تھا - اس لئے اس کی روح محبت کے لئے ایک غیر معمولی تشنگی محسوس کرتی تھی - چنانچہ ابھی اس کی عمر آٹھ سال کی تھی - کہ اُسے ایک چھوٹی سی لڑکی سے جس کا نام میری ڈف تھا - محبت ہو گئی - بائرن نے خود اس واقعہ کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے - وہ لکھتا ہے کہ "اس لڑکی کی محبت نے مجھ پر خواب و خور حرام کر دیا ....

.... میری کے لئے میرا جذبۂ محبت بے حد شدید تھا - مجھے اکثر خیال گزرتا ہے - کہ میں نے اس کے بعد کسی سے محبت نہیں کی" ؛

بائرن کی عمر دس سال کی تھی - کہ لارڈ ولیم بائرن کا انتقال ہو گیا - اور بائرن اس کے خطاب اور جائداد کا وارث قرار دیا گیا - اس نے بچپن کا ایک حصہ ایبرڈین میں گزارا تھا - لارڈ ولیم بائرن کے انتقال کے بعد وہ اور اس کی ماں نیوسٹیڈ ایبے

قریب آ گئے۔ اور بائرن کو ہیرو کے مشہور اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔

بائرن کا ایک پاؤں کسی قدر مڑا ہوا تھا۔ اور وہ لنگڑا کے چلتا تھا۔ چونکہ وہ بچپن سے نہایت ذکی الحس شخص تھا اس لئے اکثر اس جسمانی نقص کا خیال اسے ملول رکھتا تھا۔ باایں ہمہ اسکول میں اس نے مردانہ کھیلوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور جلد شہسواری تیغ زنی وغیرہ میں نام پیدا کر لیا۔

پندرہ سال کی عمر میں اسے ایک حسین لڑکی میری چاورتھ نام سے محبت ہو گئی۔ تعطیلات کے زمانہ میں وہ گھر آتا تھا۔ تو سارا سارا دن میری چاورتھ کے ساتھ پھرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے مس چاورتھ کو اپنی خادمہ سے یہ کہتے سن لیا۔

"شاید تم سمجھتی ہو۔ کہ مجھے اس لنگڑے لڑکے سے محبت ہے"۔

ان الفاظ نے بائرن کا دل توڑ دیا۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ اور پھر کبھی میری چاورتھ کے گھر کا رخ نہیں کیا۔

بائرن نے کچھ دنوں کیمبرج میں بھی تعلیم پائی تھی۔ اس کی شاعری کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ اس نے اپنا کلام سات جلدوں میں مرتب کیا۔ لیکن پہلی جلد ہی شائع ہوئی تھی۔ کہ نقادوں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس نے ایک اور نظم شائع کی۔ جو نقادوں کی ہجو پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کی جانب بھی چنداں توجہ نہ کی گئی۔ اور وہ شاعری کی حیثیت سے کوئی امتیاز حاصل نہ کر سکا۔

بائرن کو انگلستان میں پے در پے اسقدر مایوسیاں ہوئی تھیں کہ آخر اس نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ اور ۱۸۰۹ء میں یورپ کی سیر کو روانہ ہو گیا وہ مدتوں جنوبی یورپ میں پھرتا رہا۔ یونان میں پہنچا تو اس سرزمین کے قدرتی مناظر اور آثار پارینہ سے اس کی طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ چنانچہ اس ملک کی محبت کا نقش ساری عمر اس کے دل پر جاگزیں رہا۔

اس نے اس سفر میں ترکی اور اطالیہ کی بھی سیر کی۔ اور وہاں مدتوں داد عیش و نشاط دیتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد ہوا و ہوس کی زندگی سے طبیعت اکتا گئی۔ اور ایک خانقاہ میں پناہ لی۔ اس نے اپنی مشہور نظم "چائلڈ ہیرلڈ" اسی خانقاہ میں لکھی تھی۔

بائرن کی زندگی کے یہ دو سال جو سیر و سیاحت میں بسر ہوئے۔ بے حد ہنگامہ خیز تھے۔ کبھی وہ طرب و عیش کی محفلیں آراستہ کرتا۔ اور شراب ارغوانی کے جام لنڈھاتا۔ کبھی سیاست دانوں کے جمگھٹ میں جا بیٹھتا اور جمہوری اصولوں کی شرح کرتا۔ کبھی بدمستی کے عالم میں شہر کے گلی کوچوں میں پھرتا۔ اور لوگوں سے دست و گریباں ہونے پر آمادہ ہو جاتا۔ لندن پہنچکر اس نے سینٹ جیمز اسٹریٹ میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور لوگوں سے ربط ضبط بڑھانا شروع کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی نظم "چائلڈ ہیرلڈ" شائع ہوئی اور ہر گوشے سے تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اس نظم کو انگلستان میں اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی۔ کہ مہینے بھر میں اس کے سات اڈیشن شائع ہوئے۔ "چائلڈ ہیرلڈ" اپنی زبان و بیان کی شستگی اور دلاویزی اور قصے کی بداعت کے اعتبار سے اس عہد کے ادب سے بالکل مختلف چیز تھی۔ اس لئے اُسے غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ اور نہایت قلیل عرصہ میں بائرن کے متبعین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ اس نے یہ نظم چوبیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔

اب بائرن کو شادی کا خیال آیا اور اس نے ایک حسین خاتون مس ملبنک سے شادی کر لی۔ لیکن میاں بیوی میں سال بھر سے زیادہ نباہ نہیں ہو سکا۔ ۱۸۱۶ء میں لیڈی بائرن اپنے میکے چلی گئی۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد اس نے عدالت

میں درخواست دی۔ کہ میرا شوہر دیوانہ ہے۔ اس لئے ہماری شادی کو کالعدم قرار دیا جائے ،

مقدمہ چلا۔ بائرن کی دیوانگی کے ثبوت میں شہادتیں پیش ہوئیں۔ اور عدالت نے لیڈی بائرن کے حق میں فیصلہ کیا۔ اب بائرن کی مخالفت کا طوفان آمڈا۔ اور اخبارات میں اس کے خلاف بکثرت مضامین شائع ہونے لگے ،

بائرن کے اکثر خیالات انگریزوں کو بہت ناپسند تھے۔ مثلاً وہ نپولین کا بہت بڑا مداح تھا۔ روسو اور والٹر کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ فرانس کے متعلق انگلستان نے جو حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ اُس پر علانیہ اعتراض کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ محفلوں میں اپنے عشق و محبت کی داستانیں فخریہ بیان کیا کرتا تھا۔ اطالیہ۔ ترکی اور یونان میں اسے جو واقعات پیش آئے تھے۔ ان کے ذکر میں اسے کوئی باک محسوس نہ ہوتا تھا۔ ان باتوں سے لوگ پہلے ہی اس کے مخالف ہو رہے تھے۔ اب جو یہ طلاق کا واقعہ پیش آیا۔ تو وہ سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ارباب وطن کی بے مہری کا یہ عالم دیکھ کر بائرن وطن سے رخصت ہوا۔ اور مرتے دم تک انگلستان کا رخ نہ کیا ،

بائرن نے وطن سے نکل کر ہوا و ہوس کی زندگی میں سکون تلاش کرنا چاہا۔ اس کی اکثر بہترین نظمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ وہ مختلف شہروں میں گھومتا پھرا۔ لیکن جہاں گیا اسے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا۔ کہ اسکی عشرت پسندی اور نفس پرستی کے افسانے ہر کو و برزن میں مشہور ہیں۔ جنیوا میں اس کی ملاقات کپتان ٹریلانی اور مشہور شاعر شیلے سے ہوئی۔ ان لوگوں کی صحبت میں اسکی زندگی کے کچھ دن آرام سے بسر ہو گئے۔ شیلے اور وہ ایک دوسرے کو اپنے اشعار سناتے تھے۔ اور ادبیات کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ ان مشغلوں سے فرصت ملتی تھی۔ تو بلیرڈ کھیلتے۔ یا گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کرتے۔ بائرن نے اپنی غیر فانی نظم "ڈان جوان" اسی زمانے میں لکھی تھی ،

۱۸۲۲ء میں شیلے سمندر میں غرقاب ہو گیا۔ بائرن کی طبیعت پر اس واقعہ نے بہت اثر کیا۔ اور وہ بہت ملول رہنے لگا اب اُس کے بال سفید ہو چلے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑ رہی تھیں۔ اس زمانے میں اُس نے اپنے دوستوں کو جو خط لکھے ہیں ان میں لکھا ہے کہ میرا دل بجھ چکا ہے۔ شعر و سخن کا سلسلہ کبھی کا ترک ہو چکا۔ اب یہی جی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے کوئی کام کر جاؤں ،

اسی زمانے میں یونان نے ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انگلستان میں ایک ایسی جماعت موجود تھی۔ جو اس جنگ کو صلیب و ہلال کا معرکہ سمجھتی تھی۔ اور یونان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس گروہ نے بائرن کو لکھا۔ کہ تم اس مہم کا بار اپنے سر لو۔ بائرن فوراً آمادہ ہو گیا ،

اب یونان کی کمک کے لئے ایک جنگی جہاز خریدا گیا۔ بائرن کے دوست کپتان ٹریلیدنی نے جہاز کو اسلحہ سے آراستہ کیا۔ اور بائرن اسے لے کر مسولانگی پہنچا۔ جہاں یونانی فوج ڈیرے ڈالے پڑی تھی ،

یونانی نوجوانوں کو بائرن سے بہت عقیدت تھی۔ انہوں نے نہایت تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ بائرن مسولانگی پہنچتے ہی فوج کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ یونانی افسروں میں بڑے بڑے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ بائرن نے اپنے حسن تدبیر سے انہیں مٹایا۔ وہ روز بڑی شان و شوکت سے سوار ہو کر نکلتا تھا۔ اور یونانیوں کی ہمت بندھاتا تھا۔ مسولانگی کی آب و ہوا بے حد مرغوب پر جنگ شروع ہونے سے پہلے بائرن کو بخار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ کہ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں۔ تو آپ کی جان بچ سکتی ہے۔ لیکن

بائرن نے نہ مانا۔ آخر ۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو اس نے انتقال کیا۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف ۳۶ سال کی تھی۔ جیتے جی تو اہل وطن نے بائرن کی قدر نہ کی۔ لیکن جب اس کی موت کی خبر انگلستان پہنچی۔ تو سارے ملک میں کہرام برپا ہو گیا۔ اسکا قلب یونان میں دفن کیا گیا۔ اور نعش انگلستان بھیجدی گئی۔ جہاں ہیوسٹیڈ ایبے میں اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔

بائرن نہایت فیاض حسین اور شجاع شخص تھا۔ اسلئے اکثر معاصرین نے جو اس سے شدید اختلاف رائے رکھتے تھے۔ اس کی نیکدلی کی تعریف کی ہے۔ اس کی باغی اور سرکش روح کو حوادث کا مقابلہ کرنے میں خاص لطف آتا تھا۔ وہ زمانہ اس کے لئے انتہائی مسرت کا زمانہ تھا۔ جب وہ ساری سوسائٹی سے برسرپیکار تھا۔ وہ کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے سر جھکانا نہیں چاہتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آخری دم تک اس کی گردن کسی کے سامنے خم نہیں ہوئی۔

عمر خیام کو دنیا محض شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے عہد کا بہت بڑا حکیم تھا۔ فیضی اپنی مثنوی اور غزلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ حالانکہ وہ خود کہتا ہے:۔

امروز نہ شاعرم حکیمم — دانندۂ حادث و قدیمم
بانگ قلم در این شب تار — صد معنیٔ خفتہ کردہ بیدار

بائرن بھی اپنے شاعرانہ کمالات کی وجہ سے ساری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود شاعری کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا ہے۔ جب وہ یونان روانہ ہوا۔ تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ میں نے شاعری کا مشغلہ اس لئے اختیار کیا۔ کہ میرے سامنے اسوقت اس سے بہتر کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ آخر شاعر کیا ہے؟ دنیا میں اسکی کیا قدر و قیمت ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ محض ایک بیہودہ گو انسان ہے۔

وہ اکثر اوقات اپنے عہد کی شاعری پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اور تو اور وہ بعض اوقات خود اپنے کلام پر اعتراض کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ انگلستان کے ایک نقاد نے اس کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ بائرن کو شاعر کی بجائے قرون وسطے کی کسی فوج کا سالار ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اشعار میں اس کی جنگجو اور طوفانی روح نمایاں نظر آتی ہے۔ اسکی ڈائری اس کے مکاتیب اور اس کے ڈراموں کا بھی یہی عالم ہے۔ انہیں پڑھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا ایک طوفان ہے۔ جسے الفاظ میں قید کر دیا گیا ہے۔

بائرن نہایت جلد شعر کہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک طویل نظم "دی برائڈ آف ابیڈوس" صرف چار دن میں لکھی تھی۔ اسکی نظمیں اس کے حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ وہ خود لکھتا ہے "کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اسکی بنیاد و اساس کوئی ذاتی تجربہ ہوتا ہے" وہ بچپن میں اکثر انجیل پڑھا کرتا تھا۔ اور اس کے انداز بیان و اسلوب انشا کا اسکی طبیعت پر خاص اثر پڑا۔ انگریز شعراء میں اسے پوپ بہت پسند تھا۔ چنانچہ اس نے اکثر نظموں میں پوپ کا تتبع کیا ہے۔ "چائلڈ ہیرلڈ" بائرن کی بہترین نظموں میں ہے۔ شاعر کے مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس نے اس نظم میں یونان کے جزیروں۔ ان کے نیلے آسمان۔ شاداب وادیوں اور مرغزاروں کا منظر اس طرح کھینچا ہے۔ کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ان کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اس نظم کے اکثر بند پڑھو۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بائرن کی روح کی گہرائیوں سے ایک ماتمی فریاد بلند ہو رہی ہے۔

بائرن کی نظموں پر مشرق کا بہت گہرا اثر ہے اور "برائڈ آف ابیڈوس کی سیر - پارسینا - دی سیج آف کارنتھ - مزپا اسی مشرقی رنگ میں رنگین نظر آتی ہیں - منفرڈ اسکی ایک اور مشہور نظم ہے - جو گوئٹے کی مشہور تمثیل فاسٹ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ "ڈان جوان" ایک اور طویل نظم ہے - جسسے بہت شہرت حاصل ہوئی - اس نظم کا ہیرو "ڈان جوان" نام ایک شخص ہے - جو کیسو دا کی طرح اپنی رنگینیوں کی وجہ سے نوجوانی میں اپنی حرکات کی وجہ سے بہت انگشت نما تھا - یہ نظم بائرن کا شاہکار ہے ؛

ان کے علاوہ اس نے چھوٹی چھوٹی نظموں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے - جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں - جو لوگ بائرن کے مفصل سوانح حیات اور اس کے کلام پر ریویو پڑھنا چاہیں - انہیں مور کی "لائف آف بائرن" اور نکول کی کتاب بائرن مطالعہ کرنا چاہیئے - علاوہ ازیں لیڈی بلیسنگٹن نے ... بائرن کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے ٹریلونی بائرن اور شیلے کا گہرا دوست تھا - اس لئے اس نے بھی کچھ لکھی ہے - وہ نہایت مستند اور بدرجہ غایت دلچسپ ہے ؛

اسکی جوانی کا پرشور اور ہنگامہ خیز زمانہ ایسے مشاغل میں بسر ہوا تھا - جنہوں نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا پھر بھی اس کی روح برابر محبت کی تشنگی محسوس کر رہی تھی - مرنے سے کچھ عرصہ پیشتر اس نے ایک نظم کہی جس میں وہ جوانی کا ماتم کرتا ہے - اور لکھتا ہے - کہ اگرچہ آپ لوگ مجھ سے محبت نہیں کرتے - لیکن میرا قلب بدستور تشنہ محبت ہے ؛

چراغ حسن حسرت

شکی مزاج بھابی جان

(از جناب میاں غضنفر محمد خاں صاحب)

ویسے تو ہماری بہت سی بھابیاں ہیں کس کس کی تعریف و توصیف کریں۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھی ہیں مگر اللہ خوش رکھے ایک تو ایسی بھابی جان ہیں۔ کہ ان کی خوش مزاجی ہم کو مجبور کر رہی ہے کہ کچھ لکھیں۔ لہذا عرض ہے۔

بھائی مستقیم الدین ایک پیدائشی ٹھیک اور سیدھے سچے مسلمان آدمی ہیں۔ ان کو ہم شادی سے بہت پہلے سے بہت کچھ تعلیم کرتے رہے کہ شادی کے بعد بھابی جان سے کس اصول مراسم و میل جول رکھنا چاہئے۔ اور دیکھو اگر بہ کشمن روز اول یہ عمل کرنا مناسب ہوگا۔ ورنہ جڑیں جم جانے کے بعد درخت بلا خاص قوت کوشش کے نہ اکھڑ سکے گا۔ مگر جناب بھائی مستقیم ہم سے گو عمر میں تھوڑے بہت بڑے ہی کیوں نہ ہوں ہیں بالکل اسم بامسمےٰ۔

ہماری بھابی جان ویسے تو ماشاء اللہ سنجیدہ اور اُن تمام اوصاف سے متصف ہیں۔ جو ایک شریف و پردہ نشین خاتون میں ہونے چاہئیں۔ کھانے پکانے میں طاق۔ سینے پرونے میں ہوشیار۔ گھر گرہستی کے کام میں سگھڑ۔ عزیز و اقارب سے میل جول رکھنے والی۔ شاگرد پیشہ عورتوں اور بستی محلہ کے غریب غربا کے ساتھ سلوک کرنے والی یہ بہت کچھ اچھی عادتیں ہیں۔ لیکن بے عیب ذات اللہ کی ہے۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے چنانچہ ہماری بھابی جان میں بھی ایک بہت بڑا عیب قدرت نے ڈال دیا ہے۔ یعنی "شک" کا خبط اور وہ بھی اپنے میاں کی جانب

مقدر کا لکھا انمٹ ہوتا ہے۔ جوڑا تقدیر میں بدا تھا۔ شادی ہونے کو ہوگئی۔ زندگی کے دن بھی جوں توں گذر ہی جائینگے۔ مگر افسوس کہ طرفین کی ازدواجی زندگی شگفتہ نہیں ہے۔ بھابی جان نے یا تو اپنی خداداد قابلیت سے یا اپنی تجربہ کار سہیلیوں کے سمجھا دینے سے روز اول ہی سے ان قواعد و ضوابط پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جو ان کے ذہن میں جاگزیں تھے۔ اور ہمارے بھائی صاحب کو اپنا فرماں بردار شوہر بنا لیا۔ ہم اور بھائی مستقیم و دیگر احباب سب ایک ہی جگہ کھانا کھانے کے عادی تھے۔ سیر و تفریح کو بھی ہماری پارٹی کے سب لوگ ساتھ جاتے تھے۔ شادی۔ غمی کے موقع پر ایسی یکدلی و ہمدردی ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے۔ کہ غیروں کو ہمارے اتفاق اور اتحاد پر رشک ہوتا تھا۔ مگر واہ ری بھابی جان پہلے ہفتہ میں ہی بھائی مستقیم کو ہماری پارٹی سے الگ کر لیا نہ وہ ساتھ کھانا رہا۔ نہ سیر و تفریح۔ اول اول تو ہماری پارٹی نے اس کمی کا احساس کیا۔ اور گروہ احباب میں سے ہر تنہا شخص نے مستقیم کا تجاہل عارفانہ اور انہماک استغراق دیکھ کر اس طرف سے ہاتھ دھو بیٹھے اور رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا۔ کہ میاں مستقیم کی دو دن کیا مہینوں بھی صورت دیکھنا مشکل ہوگیا۔ یہ سمجھ کر کہ مستقیم ہاتھوں سے گئے صبر کر لیا چند روز بعد مستقیم خود ہی اتری ہوئی صورت رونی شکل لے کر

پارٹی میں آنے لگے۔ اور اپنی بیوی کے دکھڑے رونے لگے ہم لوگ بھلا زن و شو کے تعلقات میں کر ہی کیا سکتے تھے سوائے فہمائش کے چنانچہ امکانی اصلاح کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ بالآخر مجبور ہو کر دیور بھاوج کے مذاق کے طور پر واقعات کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ تاکہ دیگر صاحبان و صاحبات اس اخلاقی کمزوری کو دور کریں۔ اور شوہر صاحبان اپنی صاحبات کو حدِ مناسب سے متجاوز نہ ہونے دیں۔ ورنہ ہمارے ہر ایسے بھائی کے لئے ہماری بھابی جان وبال جان ہو کر دنیا میں جہنم کا مصداق انکا گھر ہو جائے گا۔ آئندہ سب صاحبوں کو اختیار ہے جیسا کریں گے ویسا پائیں گے سمجھا دینا ہمارا کام ہے۔ ماننا نہ ماننا انکا کام۔ مستقیم سے معلوم ہوا کہ بھابی جان کو مستقیم کی طرف سے ایک معمولی سی بات پر بدگمانی ہو کر خبط کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ حالانکہ ہمارا خیال ہے کہ یہ خبط سسرالی بیماری نہیں ہے، بلکہ غالباً وہ اپنے میکے سے ہی اس کے جراثیم ساتھ لائی تھیں ایک وقت کا صرف اسقدر واقعہ ہے کہ شادی ہونے کے پندرہ بیس روز بعد مستقیم بیت الخلا میں تھے۔ مہترانی انکے یہاں کی ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کرتی تھی اور بہری بھی تھی۔ دروازہ کی کنڈی لگانا بھول گئے تھے۔ مہترانی آئی اور سیدھی داخل ہو گئی۔ شام کا وقت تھا۔ دو وقتی کمانے آئی تھی۔ اب ہرچند مستقیم کھنکارتے ہیں۔ مگر سنے کون۔ بند مقام تھا اور خاکی رنگ کے کپڑے مستقیم پہنے تھے۔ جو تاریکی میں دکھ نہ سکے۔ آخر مجبور ہو کر بغیر اپنی بقیہ حاجت کو ضبط کر کے جلدی جلدی طہارت کی۔ اور کھڑا ہو گیا۔ اب بی مہترانی نے دیکھا۔ اور سوائے اس کے ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کہ دونوں باہر نکل آئے۔ بیت الخلا کا دروازہ رہائش کے کمرے کے سامنے ہے۔ بھابی جان نے مستقیم کو تو جاتے دیکھا تھا۔ مہترانی کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اب دونوں کو ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے نکلتے دیکھا۔ اس وقت تو خاموش رہیں۔ مستقیم لاحول پڑھتے ہوئے جھینپتے ہوئے سے باہر چلے گئے۔ اور مہترانی اُگالدان صاف کرنے کو گلی سے مانگنے گئی۔ مگر چونکہ بھابی جان کے خیال میں چشم دید واقعہ تھا۔ اور چشم دید کے ثبوت و صفائی کی دفعہ ان کی تعزیرات میں رکھی ہی نہیں گئی۔ اس لئے بلا اخراجِ اب ملزمان بیچاری مہترانی کو بچاس ضرب دلی کے وصلی دار سلیم شاہی کی سزا دیدی گئی۔ اور آئندہ مہترانی کا آنا بند۔ تا انتظام تا لی مہتر کے آنے کا حکم سنا دیا گیا۔ اور تیسرے روز بعد ہمسائی کی مہترانی کا تقرر۔ اس مظلومہ کی برخاستگی عمل میں لائی گئی ؛

میاں مستقیم کو ان بولے کی سزا۔ اور صبح کا ناشتہ غائب تیسرے پہر کی چاء ندارد۔ کھانا الگ کھانے کا آرڈر ملازم کو سنا دیا گیا۔ ڈیوڑھی میں بستر بچھوا دیا گیا۔ حتی کہ پانی پینے کا گلاس و ایک گھڑا الگ رکھوا دیا گیا۔ اب آپ سمجھ لیجیے کہ بھائی مستقیم کیا سے کیا ہو گئے۔ اب بھی غنیمت تھا اور وقت تھا کہ بھائی مستقیم سنبھل جاتے۔ بلکہ سنبھال لیتے اور وہ ڈانٹ بتاتے کہ بھابی جان خود ڈولی منگا کر اپنے میکے دو دن فیصلے کی چلتی پھرتی نظر آتیں اور دوسرے روز الٹی خوشامد شروع ہو جاتیں۔ سالے صاحب الگ منانے آتے اور خسر صاحب کا علیحدہ پرچہ آتا کہ۔ میاں مستقیم طول عمرہ۔ بعد دعا کے واضح ہو کہ نورِ چشمی سلمہا کی حماقت پر کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اس مرتبہ خطا معاف کرو۔ اور آج شب کو کھانا میرے ہی ساتھ کھانا۔ وغیرہ۔ اور جناب اگر ذرا بھی اس جانب سے ڈھیل ڈھال دکھائی دیتی تو ایک ہی ہفتہ میں وہ گل کھلائے ہوتے کہ مزا آ جاتا یعنی ایسی بد مزاج بیوی کیلئے

تعدد ازدواج کی وسیع اجازت کھلی ہوئی ہے۔ مگر مستقیم سے الہنگنے جانے سے کیا نسبت۔ خوشنودی بیگم صاحب محترمہ کی خاطر سب کچھ گوارا کیا۔ خدا خدا کر کے بھائی شفیق بیچ میں پڑے۔ تب کہیں چار روز میں میل ہوا۔ مستقیم سیدھے تو ہیں ہی۔ کیا جانے کہ احتیاط کس چڑیا کا نام ہے۔ میل ہونے کے دوسرے ہی روز صبح سو کر اٹھتے ہی گلچن سے غسل خانہ میں پانی رکھنے کو کہا۔ ہنوز وہ پانی نہ رکھنے پائی تھی کہ آپ غسلخانہ میں لنگی باندھے ہوئے پہنچ گئے۔ غسل خانہ میں پتھر کا فرش تھا۔ کسی نے کیلے کا چھلکا ڈال دیا تھا۔ گلچن جو پانی کا گھڑا لے کر آئی تو کیلے کے چھلکے پر پیر پڑا۔ اور پھسلکر دھڑام سے گری۔ گھڑا پھوٹنے کا جدا آواز ہوا۔ اور اری ری کی سُریلی آواز الگ سنائی دی۔ اتفاق دیکھئے کہ غسل خانہ کا دروازہ اسی وقت ہوا سے یا گرنے کی حرکت سے بند ہو نا تھا۔ بھائی جان نے بہت صبر کیا۔ مگر ضبط نہ ہو سکا۔ فورًا دوڑ کر غسلخانہ کا دروازہ کھولا اور بلا دریافت کئے سلیپر بازی بے گناہ گلچن پر شروع کر دی ... اڑ گئے۔ اور اس ورزش سے فارغ ہو کر اسی وقت گھر سے رفو چکر کر دیا۔ خیر مستقیم اسوقت تو کیا کہہ سکتے تھے۔ اور کہا ہو تو سنتا کون۔ بیچارے نے اپنے ہاتھ سے ... پانی لا کر غسل کیا۔ ... فدویانہ انداز سے اصلیت معاملہ کی بابت عرض کرتے رہے جس کے جواب میں یہ فرمایا کہ یہ سب جھوٹ باتیں ہیں۔ مردوں کے چھل بل سب میں خوب جانتی ہوں۔ یقینًا جو ماجرا ہوا ... اور آخر کوار بند کئے ہوے ... خیر ... ان بولا۔ اور حقہ پانی بند ... گیا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ کوئی کھجانے والا ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ گلچن کو تو نکال ہی دیا گیا تھا۔

بھر بھائی شفیق کو کسی طرح معلوم ہوا۔ اور صلح صفائی بعد میل کرایا گیا۔ مگر پھر بھی گلچن نہ بلائی گئی۔ بلکہ ایک پنجاہ سالہ بزرگ ماماگری پر بمشورہ بہن ہمسائی رکھی گئی۔ یہ بات بھی قابل اظہار ہے کہ گلچن کی تنخواہ تھی ایک روپیہ ماہوار اور رات دن رہنے کی شرط۔ کھانا جتنا پیٹ میں آئے اور ان بزرگ کی تنخواہ مقرر ہوئی چار روپیہ ماہوار نقد۔ اور دو روٹی صبح ناشتہ کی۔ چھ روٹی دوپہر کو۔ چھ شام کو کھانا گھر لے جانے۔ اپنے گھر بعد کام کے چلے جانے اور سونے کی شرط۔

مستقیم کہتے ہیں کہ یہ دقیا نوسی ڈائن گویا مجھے کھائے جاتی تھی اور ہر بات میں لقمہ دیتی تھی۔ اور دخل در معقولات کرتی رہتی تھی۔ مگر مجبور۔ اپنا کیا بس تھا۔ مستقیم کی یہ ملازمہ نہیں بلکہ ایک نگراں تھی۔ یہ پیر زال مستقیم کی ہر ہر نقل و حرکت کی گہری نگرانی کرتی۔ اور اسی وجہ سے بھائی جان کی خاص معتمدہ تھی۔ باہر ... محلہ میں تو خاصی نگرانی کر لیتی تھی۔ ... لوگوں کے یہاں اس کا کوئی قابو نہیں چلتا تھا ... متعلقین اس سبب سے گویا کمی محسوس کرنے لگیں۔ اور فکر ہوئی کہ دفتر اور محلہ اور دوستوں کے گھروں۔ تفریح گاہوں میں بھی نگرانی کیونکر قائم ہو۔ جو تمنا دیا بندہ کسی کی کوشش و محنت اکارت نہیں جاتی۔ بہن ہمسائی اور بڑی بی ملازمہ کی تلاش و مشورہ سے ایک ... دس سالہ "جگنو" نامی مل ہی گیا ... تھا تو ناٹک ... لونڈا۔ مگر ... ماشاءاللہ ... میاں مستقیم ... تو ... بھی ... آگیا۔ جہاں جا کر بیٹھے اور جنگلو موجود۔ بات کچھ ہو مگر ایسی بنا کر نمک مرچ لگا کر ...

نرگس بر کنارِ جو

بہت ہی قدیم زمانے کا ذکر ہے ———
جبکہ ہماری تمہاری طرح پھل پھول۔ درخت۔ جانور سب آپس میں باتیں کرتے تھے۔ انسان بھولے، اور نیک ہوتے تھے۔ جھوٹ اور مکر و فریب سے دنیا واقف نہ تھی لوگ شکار اور پھلوں پر گذران کرتے۔ قدرتی چشموں سے پانی پیتے۔ اور پہاڑوں کی کھوہوں میں آرام سے سوتے تھے۔

.... چونکہ دنیا ابھی نئی نئی تھی —— ——

لوگ بہت ہی سیدھے اور سادہ ہوتے تھے۔ وہ لوازم معیشتِ زندگی سے ناواقف محض لیکن حسیاتِ انسانیت مکمل ضرور تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب زمین کے بسنے والے اور آسمان کے رہنے والے آپسمیں ملتے جلتے تھے۔ یہاں تک وہ ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوتے تھے۔

——— کہتے ہیں یہ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ———

کسی جنگل میں جو کہ چھوٹی چھوٹی خوشنما پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ پانی کا ایک سوتا پھوٹ پڑا۔ عرصہ تک پانی کے بہنے سے وہاں ایک چشمہ سا بن گیا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ سبز سبز کائی اس آئینے سے صاف و شفاف چمکدار پانی کی جوکھٹا بندی کرتی گئی۔ سفید اور کچھ بہ کبودی مائل کو کابلی اور ہلکے نفیس گلابی رنگ کے کچھ اودی مائل سرخ رنگ کے کنول کے پھول۔ چشمہ کے شمالی جانب جدھر سورج کی سنہری شعاعیں اور چاند کی روپہلی کرنیں کافی پڑتی تھیں۔ کثرت سے سطحِ آب پر پھیلے ہوئے تھے۔ رات کی کھلنے والی کو کابیلی میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں میں ہوا اٹھکھیلی۔ ہچکولے دیدے کر انہیں ادھر ادھر پھراتی ——— لہریں اٹھ اٹھ کر اونچی نیچی پتھریلی چٹانوں پر مترنم نغمہ ریز ہو جاتیں۔ دور پہاڑی کے دامن میں ندی کے پرسکون فضا میں۔ سونے کے ساز دل کو گنگنا دیتا شب کی خاموش فضا میں وہ سوہنے راگ الاپتیں۔ دن کے اس تھوڑے سے شور و غل میں جو اس جنگل میں ہو سکتا ہے راگنی کا وہ مضطربانہ لہجہ گاتیں جو ادھر ادھر کے بھولے بھٹکے ہوئے متلاشیانِ آبِ خنک کو اپنی طرف کھینچ لیتیں۔ لیکن یہ جگہ پیچ در پیچ پہاڑیوں میں واقع ہونے سے انسان کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔

ایکدن شکاریوں کا ایک گروہ جو اتفاقاً ادھر آنکلا تھا۔ اُن پہاڑیوں کی بھول بھلیوں میں پہنچکر اپنا راستہ بھول گیا ہر چند تلاش کیا لیکن بجائے راستہ ملنے کے وہ خود ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ساتھیوں میں سے ایک جوان عمر کا لڑکا تو ان سے اسقدر دور ہو گیا کہ وہ اس کو قطعی نہ پا سکتے تھے۔

رہرو وادیِ غربت تمازتِ آفتاب اور شدتِ پیاس سے پریشان تھا۔ وہ پانی تلاش کر رہا تھا۔ اسنے دور پانی کے ٹکرانے کی آواز سنی۔ وہ ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا۔ دیکھیں! دستیابِ زیست کہاں پر ممکن ہو سکتی ہے۔ اس نے پہاڑیوں کے سلسلے میں کچھ دور پر مرغابیوں کے جھنڈ اڑتے دیکھے۔ اور مدھم سی آواز شاید بگلوں کی کنج کنج کی بھی سنی جو دور سے آ رہی تھی۔ اس نے خیال کیا وہاں پر تری ضرور ہے

وہ اس طرف جھپٹا۔ تھوڑی سی کوشش۔ تلاش اور محنت کے بعد وہ اس جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ جو اس جنگل میں کنجی زیست اور تمثیل نظری میں چشمۂ آبِ حیات تھی۔ کنارے پر بیتابانہ وار گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ جھکا۔ یہاں تک جھکا کہ اس کے منہ اور پانی کی ٹھہری ہوئی مصفا سطح سے تھوڑا فرق رہ گیا۔ پانی میں عکس خود نظر پڑا۔ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔ خیال گذرا۔ "اسمیں حسن رہتا ہے یہ پریزاد کا مسکن ہے۔ ہو نہ ہو اسمیں پانی کی پری رہتی ہے وہ کیوں آئی۔ پانی پینے سے منع کرتی ہے۔ ہاں شاید ——" خیالات کا تانتا بندھ گیا۔ وہ کہاں پیاس کیسی۔ اب جو دھن تھی وہ اس سے ملنے کی۔ جو خواہش تھی اس سے بات کرنے کی۔

وہ ایک مرتبہ پھر اپنے لرزہ بر اندام جسم کو لے کر کنارہ پر گیا۔ گھٹنوں کے بل جھکا۔ گردن کو پانی پر جھکانا شروع کیا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور اس چہرے مترنم آنکھوں والا معصوم صفت لڑکا۔ پھر بھولی بھالی شکل کا متلاشی تھا۔ جوں جوں وہ جھکتا جاتا۔ دھندلا عکس اس کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے عکس صاف نظر نہیں آتا تھا۔ ابھی وہ خیالات کے اُدھیڑبن میں تھا۔ کہ جنگل کے ایک ہلکے سے جھونکے نے خیالات کے سمندر کو متلاطم کر دیا۔ ٹھہری ہوئی سطحِ آب ہل گئی۔ وہ بت چہرہ اپنے متعدد ہمجنسوں کے ساتھ بروئے آب اٹکھیلیاں کرنے لگا۔ لڑکا ہنس دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ معکس جنس بھی ہنسی۔ "ہاں۔ نہیں۔ کیا میں کچھ نہیں کر سکتا نہیں وہ میری محدود طاقت سے واقف ہو کر ہنستا ہے کیا۔ چہرہ جسنے مجھ کو اپنا کر لیا" وہ مجسمۂ وہم کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کہ ڈانواں ڈول پانی ٹھہر گیا۔ عکس رخ پھر اسیطرح استوار ہو گیا۔ ادھر کچھ کہنا چاہا اُدھر ہونٹ جنبش میں آئے۔ مگر کلام مخاطب سمجھ میں نہ آنے سے آتو ماً نہائی متالم ہو گیا۔ وفورِ محبت سے آنسو ٹپک پڑے۔ سطحِ آب درہم برہم ہو گئی۔ عکس غائب ہو گیا۔ متغیث کی مستبعد حاجت نے مابین نظارۂ و منظر پردۂ بے نیازی کھینچ دیا وہ مبہوت بادۂ الفت دیوانہ ہو گیا۔ کنارہ پر گر گیا۔ جنگل کی ٹھنڈی ہوا نے اسکو تھپک تھپک سلا دیا۔ وہ خواب میں پیہم اپنے عکس کے ساتھ کھیلتا اور باتیں کرتا تھا۔ سورج کی تیز دھوپ اور چاند کی ٹھنڈی روشنی میں گھنٹوں ٹکٹکی باندھ کر عکس کو دیکھتا رہتا۔ وہ معکس جنبشِ لب سے اپنا مفہوم سمجھ لیتا سورج طلوع ہو کر غروب ہوتا۔ چاند ہلال سے بڑھ کر بدر اور بدر سے گھٹکر پاک ہوتا۔ روز کی طرح صبح بعد شام ہوتی۔ دن آتے جاتے۔ لیکن چشمہ کے کنارے محبت کے مد و جزر میں کسی طرح کمی نہ ہوئی۔ وہاں ہوا نے ترقی کے تنزلی نہ تھی۔ وہاں عشق کا چکر ایک محور پر گردش کر رہا تھا۔

ایک شب جبکہ چادر مہتابی اس کے خوبصورت مگر ضعیف جسم پڑی ہوئی تھی۔ وہ روتے روتے تھک کر سو گیا تھا۔ وہ بیشتر خواب دیکھا کرتا تھا کہ پانی سے عکس نکلتا ہے۔ اُسے بلا کر سبزہ زاروں میں لے جاتا ہے۔ ڈھلواں پتھروں پر اس کے ساتھ پھسلتا ہے۔ پانی میں اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ عکس نے آکر شانہ ہلایا "کیا سوتے ہو" چاندنی رات کے درمیانی حصے میں خواب سے آنکھ کھل گئی۔ وہ چشمہ کی طرف جھپٹا۔ صاف صاف چاندنی۔ پانی کی مجلا سطح پر پھیلی ہوئی تھی۔ تصور مالوف انتہائی سادگی سے برآمد ہوا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ ہوا اس کے بالوں سے شوخی کر رہی تھی۔ لڑکے نے ہیئت فرشتہ دیکھ کر قہقہ لگایا۔ خاموش فضا میں قہقہ پہاڑیوں سے ٹکرایا۔ وہ

آواز بازگشت کو جواب عکس سمجھا۔ دیوانہ جو حرکت کرتا عکس اسکا مترادف ہوتا۔ جفائے حسن نے لعنت خود نمائی دکھائی۔ وفائے عشق نے اپنی خدمتیں پیش کردیں۔ وہ کیا تھا۔ محبت کے گہرے سمندر میں دو حقیقتیں منقلب ہو چکی تھیں۔ انکا ایک دوسرے میں فنا ہو جانا ہی زیست انکا نازو نیاز ایک حقیقی پہلو اختیار کر چکا تھا۔ لڑکے نے کانپتے ہوئے ہونٹ ہلائے "تم مجھ سے ہمیشہ خفا رہتے ہو" اب حسن کی کرشمہ سازیاں عشق کی نیرنگ طرازیوں میں پھنس چکی تھیں۔ عکس ہنسا اور منہ بنا کر غائب ہو گیا۔ "بس تمہاری یہ باتیں مجھ کو ناپسند ہیں"۔ وفا کیش نے چلا کر کہا مطمح نظر پھر نظارہ کوش ہوا۔ اس نے اپنی تھکی ہوئی نظریں اسکی طرف اٹھا دیں۔ دیکھا۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم رقص کناں ہے۔ لیکن اپنا جواب نہ پا کر لڑکے نے آزردہ ہوتے ہوئے کہا "کیا تم کو مجھ سے دور رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے" وہ دزدیدہ نظروں سے سرفروش محبت کی طرف دیکھ رہا تھا"۔ آؤ! ہم تم ہار سنگھار کے نارنجی ڈنڈیوں والے سفید پھول چننے چلیں"۔ عکس نے اپنی کیف بھری نظریں اسپر نچھاور کرتے ہوئے کہا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ لڑکا دیوانہ وار کنارے پر دوڑ رہا تھا۔ وہ اپنے نصف جسم تک پھر نکلا۔ لڑکا کنارہ پر رک گیا۔ سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا "تمہارا ہاتھ گلا۔ ناک کان ننگے ہیں"۔ اسنے انتہائی انبساط کے ساتھ کہا "کیا میرے لائے ہوئے پھول ناک کان میں نہ ڈالوگے میرا خود بنایا ہوا ہار اپنی مرمریں گردن میں ڈالنا پسند نہ کروگے" لڑکا پر جوش لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ بت منعکس کے لبوں کے دونوں کناروں پر ہنسی کھیل رہی تھی۔ پاکیزہ آنکھوں کی سادہ زبان اثبات میں جواب دے رہی تھی۔ عکس نے گردن ہلائی۔ لڑکا چاندنی میں پھول چننے چلا گیا۔ وہ پھول لایا۔ کنارہ پر آکر آواز دی "حریم محبت کی ملکہ! لے۔ لے۔ پرستار الفت کی نذر قبول کر۔" یہ تھا جو کچھ کہ اسنے کہا۔ عکس آیا۔ دونوں ہاتھ گلے میں ڈالدینے کے لئے بڑھائے۔ جوں جوں وہ آگے کی طرف بڑھتا۔ عکس اس کو بلاتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹتا جاتا۔ لڑکا نصف جسم تک چشمہ میں پہنچ چکا تھا۔ عکس نے دونوں ہاتھ محبت کے فرشتے کے گلے میں حائل کردیئے۔ لہروں نے اٹھ کر دونوں کو اپنی آغوش طمانیت میں ہمیشہ کے لئے لے لیا۔ وہاں کیا تھا۔ کچھ نہیں۔ سطح آب اسی طرح سے برابر تھی۔

عرصہ دراز بعد جب اس کے دوست و اقارب اس طرف سے گذرے۔ انہوں نے ایک نوجوان کو چشمہ کے کنارے سوتا ہوا پایا۔ "آہ یہ وہی ہے! جوان گھاٹیوں میں عرصہ ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا"۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر سب نے مل کر صلاح کی چلو ضروریات تجہیز و تکفین لاکر اسکا رسوم کفن دفن کردیں جب وہ لوٹ کر آئے۔ تو انہوں نے ٹھیک اسی جگہ بجائے اسی فرشتہ کی لاش کے ایک چھوٹا سا درخت سفید پھولوں والا دیکھا۔

"یہ اتنی جلدی کیسے پیدا ہو گیا۔ اور اس میں شگفتہ پھول کیسے آگئے"۔ وہ سب آپس میں سرگوشی کرنے لگے "اس کے پھول مرحوم کی آنکھوں سے بہت ملتے ہیں" ان میں سے ایک نے کہا "اچھا اس نو پھول والے درخت کا نام نرگس تجویز کیا جاتا ہے"۔

(حافظ عبدالوہاب)

دفتر نیرنگ خیال میں
نئی کتابیں

کولتار۔ پندرہ بابکا نہایت دلچسپ ناول۔ جس کا ہر باب ایک مکمل افسانہ بھی ہے اور اگر کڑی سے کڑی ملائیے تو کچھ اور ہی لطف پیدا ہو جائیگا۔ "کولتار صاحب" کے عجیب وغریب واقعات شریر شاہدہ کی ہنسنے اور ہنسانیوالی شرارتیں۔ شاہدہ کی شادی کے پرلطف نظارے۔ "جم دلی" کے پراسرار حالات اور نوعمر لڑکیوں کی شوخ و شنگ باتیں پڑھکر آپ اچھل اچھل پڑینگے۔ حجم ڈھائی سو صفحات قیمت عمہ

روح لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی کے آٹھ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ جسمیں "مہارانی کا خواب" جیسا افسانہ بھی شامل ہے۔ ہر افسانہ بیحد پسند یدہ ہے قیمت عہ

چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز — پہلے حصہ میں ایک صاحب کے پرلطف مضحکہ خیز واقعات انہی کی زبانی بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں ایک خاتون نے اپنی دردناک سوانحعمری بیان کی ہے قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:۔
مینجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور



چار چاند۔ حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی کے مضامین کا مجموعہ ۸ر

ید قدرت۔ علامہ مضحک دہلوی کا ایک طویل فسانہ قیمت ۸ر

سلمیٰ۔ شہرہ آفاق آسکر وائلڈ کی تمثیل۔ سالومی کا لاجواب ترجمہ ۵ر

چندرا موہنی۔ جناب انصار ناصری بی اے دہلوی کا وہ معرکۃ الآرا طویل فسانہ جو ساقی کی دو اشاعتوں میں شائع ہو کر بیحد پسند کیا جا چکا ہے۔ حسن وعشق کے لطیف مرقعے۔ آپ کے احساسات کو متزلزل کردینگے۔ چندراموہنی کی دلکش تصویر بھی اس میں شامل ہے حجم ۱۷۵ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ
مینجر نیرنگ خیال پبلشنگ کمپنی۔ شاہی محلہ لاہور

نوٹ:- ۱۶۷ صفحہ کے بعد ۱۷۷ صفحہ صحیح ہے۔ چار صفحوں کے نمبر غلطی سے درج نہیں ہوئے۔

ظاہر کرتا تھا۔ کہ روز کی جنگ شروع ہوگئی۔ اور میاں مستقیم کا گھر باقاعدہ اکھاڑا بن گیا۔ یا مرغ کی پالی کا میدان ہے

لیلٰے اور مجنوں کی کچھ راز کی باتیں تھیں
یاروں نے جو سن پایا افسانہ بنا ڈالا

یاران طریقت نے جب یہ بھانپ لیا کہ یہ معاملہ ہے تو گویا ایک مذاق کا خاصہ موضوع ہاتھ آگیا۔ اب جسوقت جس نے بھی جنگو کو دیکھا۔ خواہ کچھ باتیں ہو رہی ہوں۔ مگر سلسلۂ کلام منقطع کرکے اس کا فرض ہوگیا کہ روئے سخن بھابی جان کے حسب دلخواہ پھیر دے۔ تاکہ بھابی جان تک بات پہنچکر باعث دلچسپی بھابی جان وسبب مرمت بھائی تقیم ہو کر یاروں اور محلہ داروں کا مشغلہ دل بہلاؤ ہو۔

ایک وقت کا ذکر ہے کہ رفیق کے یہاں ایک مسماۃ گانیوالی کا جلسہ تھا۔ بھائی مستقیم اور ان کے ہمزاد میاں "جنگو" بھی رنہ پہنچے تھے۔ مستقیم نے حسب بجٹ منظور شدہ وعطیہ سیلف ہوم گورنمنٹ ایکروپیہ دیدیا۔ زاہد کو تو اپنے پوزیشن کے اعتبار سے پانچروپیہ تک دینا ہی تھا۔ مگر اس ستم ظریفی کے ساتھ دیئے کہ ہر مرتبہ یہ کہتے گئے کہ بی جان مستقیم صاحب کی طرف کا نذرانہ قبول فرمایئے۔ اور مستقیم صاحب ہی کو سلام کیجئے۔ بس جناب پھر کیا تھا۔ صبح ناشتہ سے پہلے ہی وہ وہ چھنی ہے کہ دست وگریبان تک کی نوبت آگئی۔

اب بھائی مستقیم ہزار ہزار قسمیں کھاتے ہیں۔ کہ اگر اس ایکروپیہ کے جو تم نے اپنے ہاتھ سے دیا تھا۔ کچھ بھی میں نے خود دیا یا کسی سے دلایا ہو۔ لیکن جناب بھابی جان تھیں کہ ایک اٹھاتی تھیں اور ایک رکھتی تھیں۔ آپکی دعا سے ہماری بھابی جان کے پاس باتوں کی تو کمی تھی نہیں جو منہ میں آیا خوب بکیں۔ حتیٰ کہ بھائی مستقیم آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے زاہد صاحب کے پاس پہونچے۔ اور تصدیق چاہی زاہد صاحب نے ہم لوگوں کو بلوایا۔ اور مستقیم کے نہیں بلکہ بھابی جان کے گھر پر جاکر ہم سب نے بہ قسم بیان دیا۔ کہ یہ تو زاہد صاحب کا مذاق تھا۔ ورنہ فی الحقیقت بھائی مستقیم نے تو صرف ایک ہی روپیہ دیا تھا۔

تب کہیں جاکر بیچارے مستقیم کو معافی ملی مگر اس قرارداد کے ساتھ کہ آئندہ عورتوں کے گانا سننے میں شرکت ایک سال تک بند۔ بیچارے مستقیم نے اسی سزا کو غنیمت سمجھ کر باقرار صالح منظور کیا۔

ہم لوگ تو ہم لوگ مستقیم کی اس قسم کی باتیں مستقیم کے دفتر کے لوگوں نے بھی اڑتے اڑتے سن لیں اور مشورہ کرلیا کہ کوئی مذاق کرنا چاہیئے۔

بھائی مستقیم دوپہر کا کھانا دفتر ہی میں منگا کر کھاتے تھے۔ جس کے چند سبب تھے۔

ٹھیک وقت پر کھانا گھر پر تیار نہ ملنا۔ کار متعلقہ سے کھانا کھانے کے لئے جانے کی فرصت نہ ملنا۔ شدت گرمی میں عین دوپہر کو آنے جانے کی تکلیف سے بچنا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ کہ جنگو کھانا لے کر آیا اور حسب معمول بیٹھ گیا۔ کسی شخص نے ایک تمہیدی فقرہ بطور یاد دہانی کہ یہ کہدیا۔ کہ بھئی منشی جی آج کھانا ایک آدمی کا اور منگا لو حشمت جان نے کہلا بھیجا ہے کہ آج ہم دوپہر کا کھانا منشی مستقیم الدین صاحب کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ اور شامی کباب اور سوتوں کے مزعفر کی خاص طور پر تاکید کردی ہے۔ ظاہر ہے کہ بھائی مستقیم سے اور حشمت جان سے کیا واسطہ۔ اور حشمت جان کی دفتر سے کیا نسبت۔ دفتر سرکاری تھا یا فلم کمپنی کا یا کسی رنڈی باز کا بیٹھکا۔ یا کسی بی جان کا کوٹھا وہ بھی دن دوپہر۔ اور خصوصاً ایسے کھانوں کی فرمائش جو بغیر پہر بھر کے تیار ہی نہیں ہوسکتے۔ قابل توجہ ہے۔ مگر قابل توجہ

یا ناقابلِ التفات سے کیا مطلب۔ غرض تو ثواب سے تھی۔ دیوانہ را ہوئے بس است کے مصداق میں ہماری بھابی جان کے کان میں بذریعہ جنگو بھنک پڑتے ہی۔ گویا شتالے میں آگ لگ گئی فوراً ہی جنگو واپس دفتر میں بھیجا گیا۔ کہ کھانا واپس لے آئے۔ اور کہے کہ کھانا کھلا ہوا اینٹی میں رکھا ہوا تھا۔ کہ میاں چوہے نے موت دیا۔ مگر میں دھوکے میں اٹھالایا۔ دلہن بی نے کہا ہے۔ کہ وہ کھانا واپس لے آؤ۔ دوسرا کھانا بھیج دیا جائے۔ یہاں میاں مستقیم نے کھانا نوش جان بھی فرما لیا تھا۔ چاہے چوہے کا موت اس میں پڑا تھا۔ یا کچھ بھی تھا۔ جنگو خالی برتن لے گیا۔ لیکن بہت تاک جھانک کے بعد۔ آبدار خانے کی کوٹھڑی میں جاکر جھانکا۔ ایک آدھ الماری دفتر کی کھولی۔ میزوں کے نیچے اور درازیں کھول کر دیکھا۔ کہ حشمت جان تو نہیں بیٹھی ہے اس سے بحث نہیں کہ حشمت جان ایک عورت ہوگی۔ یا از قسم سوئی یا آلپین وغیرہ۔ یا کاغذ کا ورق۔ یا دوات۔ یا صراحی جو آبدار خانہ یا میزوں کی دراز۔ کرسیوں میزوں کے نیچے رکھی ہو۔ یہاں تو میاں جنگو کی تاک جھانک قابل ملاحظہ ہے۔ بھائی مستقیم کے گھر جانے پر جو بھی ہوا اس تحکم فضیحتی کا اظہار ہم سے اور بھائی مستقیم سے ایکا پکا باعث ہو جائے گا۔ دوسرے ایسا سنتے چلے آئے ہیں۔ کہ کسی کا ایک عیب چھپانے سے خدا اپنے ستر عیب چھپاتا ہے۔ اس لئے ہم صرف اسی قدر عرض کرتے ہیں۔ کہ ہمیں نہیں معلوم کہ کیسے گذری اور کیونکر نپٹے سلجھے۔ اتنا البتہ بتلائے دیتے ہیں کہ دوسرے روز جب مستقیم ملے تو چہرہ پر ناخنوں کے کھرونچے لگے تھے۔ اور ایک طرف کی مونچھ میں بالوں کی کمی نظروں کو محسوس ہو رہی تھی اور کہیں کہیں داڑھی بھی نچی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ سر کے بالوں کی حالت نہ معلوم کیا تھی۔ اس لئے کہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اور ہم نے سر برہنہ کرنا اور دیکھنا خلاف تہذیب سمجھا۔ دریافت پر بھائی مستقیم نے

جو کہا ہمنے مان لیا۔ جھوٹ سچ خدا جانے اگر انہوں نے ہم سے جھوٹ کہہ دیا ہو تو انہیں کی عاقبت بگڑی ہمارا کیا بگڑا۔ بھائی مستقیم نے ہم سے کہا یہ کہ رات کو سوتے میں بلیاں لڑتی ہوئی مجھ پر گر پڑیں انہیں کے پنجوں کی خراش ہے۔ قرین قیاس بات ہو یا نہ ہو ہم تو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔ البتہ اسکا افسوس ہے کہ اس روز سے بھائی مستقیم کا کھانا دفتر میں آنا بند ہو گیا۔ اور اب بیچاری کو تپتی دھوپ میں ٹھیک اسوقت جب آفتاب نصف النہار پر ہوتا ہے۔ کھانا کھانے گھر جانا پڑتا ہے۔ اسی قسم کے سیکڑوں واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اور اب تو تقریباً ایک ماہ سے مستقیم رات کو باہر ہی نہیں نکلتے ایک مرتبہ کسی ضرورت سے میں۔ رفیق۔ ساجد۔ شوکت حسین کے یہاں رات نو آٹھ بجے گیا۔ وہاں سے قریب ہی مستقیم کا مکان ہے جاتے وقت کہتے گئے کہ بھائی ہم ابھی آتے ہیں۔ پان تیار رکھنا۔ چنانچہ واپسی پر دیکھا تو اردلی باہر بیٹھا ہے۔ مستقیم اب بھی معدوم موجود۔ آواز دلوائی۔ بہت دیر کے بعد لونڈا پان لایا۔ اور دروازہ میں سے ہاتھ ڈال کر دے کر یہ کہہ کر چلا گیا۔ کہ آتے ہیں پھر انتظار کے بعد آواز دی۔ جواب ملا کہ سو رہے ہیں۔ جب کہا کہ اٹھا دو اور بھابی جان نے سمجھ لیا۔ کہ یہ بلا اس طرح نہیں ٹلے گی۔ تو جبراً بھابی جان نے جنگوا کو کنجی دی۔ کہ قفل کھول آ اور بڑبڑانے لگیں۔ جنگو نے دروازہ کا قفل کھولا۔ مگر اب بھی مستقیم ندارد۔ پھر آواز دی تو بھائی مستقیم خود بولے کہ بھائی آتا تو ہوں۔ اور آہستہ سے بھابی جان سے کہنے لگے یعنی اجازت لینے لگے۔ کہ کہو تو ہو آؤں۔ بھابی جان نے کڑک کر فرمایا کہ ہاں جاؤ۔ مرو۔ بھلا یار دوست کہیں چھوٹ سکتے ہیں۔ موئے آوارہ لوگوں کے نزدیک تو دن رات سب برابر ہیں۔ آدھی رات کو شریفوں میں تو ملنے کا وقت نہیں۔ ہاں چوری چھنالے والے البتہ گھروں گھر مارے مارے پھرتے ہیں۔

اب باہر کا جانا بند ہوا تو گھر پر سات رات بھر جھگڑا رہا کرے گا مستقیم نے پھر آہستہ سے انکسارانہ و مجبورانہ لہجہ میں کہا کہ جاؤں کیسے۔ زنجیر کا قفل تو کھولو۔ چنانچہ جب زنجیر آہنی سے پیر چھوڑا گیا۔ تو مستقیم باہر آئے۔ ہم لوگوں کو چونکہ مستقیم کی مظلومیت اور بے بسی پر افسوس تھا۔ اس لئے نہ کچھ دریافت کیا۔ نہ مذاق۔ تھوڑی دیر بادلِ ناخواستہ بیٹھے اور چلے آئے۔ اور اس روز سے عہد کر لیا کہ بغیر شادی غمی کے انشاءاللہ کبھی مستقیم کے گھر پر نہ جائیں گے۔

یہ ہیں جناب تعلقات زن و شو ۔

(غضنفر محمد خاں)

افسانہ:-

شہرزاد

(از مظہر انصاری - بی اے)

ایک اپیل - ایک پکار - ایک صدا - جو ترجمان ہے شکستہ دلوں کی جنمیں پنہاں ہیں ان تمام عورتوں کی صدائیں جو پکارا کرتی ہیں اور پکارا کریں گی - جب زندگی کی تاریک راہوں میں محبت کی شمع گل ہو جائے تو ہم کیا کریں ---+

وہ فردوس کے مالک کی لڑکی تھی اور فردوس طورہ کی تنہا سرائے ---- یہ اب سے بیس برس پہلے کی بات ہے -

شاہ بلوط کے بلند بالا درختوں سے گھری ہوئی نشیبی وادی میں سرائے واقع تھی اور اپنی گنبدوں دیواروں کی وجہ سے زمردیں کٹورے میں تیرتا ہوا یاقوت معلوم ہوتی تھی - اب تو وہ خاک کا ایک ڈھیر ہے - اب وہاں سے ریل بھی گذرتی ہے - اسوقت سب سے قریب سٹیشن بھی پانچ میل پرے تھا -

اکثر نواں طورہ میں سماہی پینٹھ لگا کرتی تھی - قہستانی دستکاری اشیا کا بازار لگتا - پہاڑوں کے خاموش گوشوں سے انسانی سمندر ابل پڑتا - لوگ اپنی اپنی چیزیں لے کر آتے -

فردوس پینٹھ کے بازار سے بہت قریب تھی - دہقان یہیں قیام کرتے تھے - سرائے کے مالک کی طرف سے خاص انتظامات ہوتے - شوربا - مچھلی - گوشت - کباب - سبزیاں - ترکاریاں - پھل پھول اور یہ سب کچھ بہت ہی سستے داموں کئی کئی روز تک سرائے میں رات دن کی آمد - جاسے ایک میلا لگا رہتا -

فردوس خاصا عجیب سا نام ہے - سرائیں دنیا میں اور بھی ہزاروں ہی ہیں - مگر ایسا حسین نام کسی اور سرائے کا نہیں سنا گیا اس نام سے نام رکھنے والے کی ذہنیت بے نقاب ہوتی ہے - اس سے تخیل پسندی کی جھلک ہے - نہ اسوقت کسی کو معلوم تھا اور نہ آج کہ سرائے کا نام فردوس کیوں رکھا گیا - کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ قہستانی مناظر کی تصویریں اتارنے کے لئے کوئی مصور وہاں آنکلا تھا اور اس نے سرائے کی ایک دلفریب شبیہہ بنا کر اس کے نیچے لکھدیا تھا "فردوس" وہ تصویر سرائے کے کمرہ میں لگی ہوئی تھی - اسپر ایک مصور "شہیر" نام کے دستخط بھی تھے مگر نہ کسی کو اسوقت خبر تھی نہ آج کہ وہ "شہیر" نام مقصد کون تھا اور نہ یہ معلوم کہ وہ یہاں کب آیا تھا اور اس نے فردوس کی تصویر کب بنائی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں دنیا میں صدہا اہم واقعات ایسے ہوتے ہیں - جنکی ابتدا یاد نہیں رکھی جاتی -

اسی مصور نے فردوس کے مالک کی بیٹی کا نام شہرزاد رکھا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قرب و جوار کے لوگوں نے اس مصور کو بھلا دیا - مگر اس کے دئے ہوئے نام کو یاد رکھا - سرائے کے مالک کی لڑکی شہرزاد کے نام سے مشہور ہوگئی - سب اسے شہرزاد شہرزاد کہنے لگے :-

شہرزاد الف لیلہ کی ہیروئن کا نام ہے - وہ حسین اور ہوشمند عورت جس نے نسوانیت کو ظلم شاہی کے پنجے سے چھڑانے کے

اپنی قربانی دینی گوارا کی۔ فردوس کے مالک کی لڑکی بھی اپنے سرخ و سپید بیضوی چہرے اپنی غزالی آنکھوں اور اپنے نرم و نازک گلابی ہونٹوں سے الف لیلہ کی شہرزاد کا جواب معلوم ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ وہ مصور جس نے لڑکی کا نام شہرزاد رکھا۔ چند روز تک فردوس میں مقیم بھی رہا۔ اسنے متعدد تصویریں بھی بنائیں ایک وادی کو پردے پر اتار کر اسکا نام رکھا "آغوشِ دل" چند کوہستانی مناظر کو نقوش کی صورت دے کر انکے نیچے لکھا "لوحِ طور" شہرزاد نے کئی دفعہ مصور کو کھانا بھی کھلایا بطور ایک خادمہ کے نہیں بلکہ بحیثیت "دختِ خانہ"۔

اپنے قیام کے پہلے دن جب مصور نے لڑکی کو دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ جیسے کسی کی نیند ٹوٹ جائے اور وہ یکایک اٹھ بیٹھے۔ بولا "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا نام کیا ہونا چاہئے" لڑکی گوش برآواز کھڑی ہوگئی۔ جیسے اس تمہیدی سوال کے بعد مصور جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے سننے کی منتظر ہو۔ کیفیتِ انتظار اس کی آنکھوں میں تھی۔ ہمیشہ سے تھی۔ ایک رقیق و رندانہ کیفیت جس کا اظہار اسوقت ہوتا جب کوئی اس سے بات کرنا چاہتا ایک کیفیت جو اپنی پرکشش مگر خاموش زبان میں کہا کرتی کہ دنیا ایک طلسمی محل ہے اور زندگی ایک شمشیرزن عاشق جو بہت انتظار دکھانے کے بعد آئے۔ مصور نے جب دیکھا کہ لڑکی الفاظ میں نہیں بلکہ آنکھوں میں باتیں کرتی ہے تو وہ بولا۔ "تمہارا نام ہونا چاہئے شہرزاد کیا سمجھیں شہرزاد"۔ لڑکی نے شہرزاد کے معنی پوچھے۔ مصور الفاظ کے حسن اور الف لیلہ کا ذکر کرنے لگا۔ وہ کیا سمجھتی۔ مصور کا نام بھی اس نے پوچھا تو سہی مگر یاد نہ رکھا۔ اور شاید وہ نام بھی جو مصور نے لڑکی کو دیا تھا۔ یاد نہ رہتا۔ اگر وہ اپنے وطن پہنچکر سرائے کے مالک کے نام ایک تصویر نہ بھیجدیتا۔ تصویر الف لیلہ کی ہیروئن شہرزاد کی تھی۔ مگر مصور نے الف لیلہ کی ہیروئن کاٹ کر اس کے نیچے "فردوس کی ہیروئن" لکھدیا تھا۔

سرائے کے مالک نے وہ تصویر قرب و جوار کے لوگوں کو دکھائی انہوں نے صلاح دی کہ اسے بڑے کمرے میں آویزاں کر دیا جائے تصویر وہاں لگا دی گئی۔ جو آتا دیکھتا تعریف کرتا۔ اور کہتا یہ تصویر تو اس لڑکی کی ہے۔

لوگوں نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا نام بھی پڑھا۔ کانوں کو بھلا معلوم ہوا۔ لفظ کے نغمے نے دلوں کی گرفت کی۔ سب اسے شہرزاد شہرزاد کہنے لگے۔ شہرزاد نام پڑ گیا۔

شمع روشن ہو اور پروانے نہ آئیں! بہت سے اور کچھ کم نہیں ایسے دل جو شہرزاد کے قدموں پہ لوٹنے کی آرزو کرتے تھے۔ نواحی فردوس کی دہقانی بستیوں میں ایک دو نہیں بیسیوں نوجوان شہرزاد پر فریفتہ تھے۔

مگر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو انکی آتشیں نظروں سے بچائے رکھتی یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ منتظر ہے کسی غم انگیز ذمہ داری کی کسی طوفانِ الم کی مصور کی پسند میں کلام نہیں۔ مگر شہرزاد اپنی نرگسی آنکھوں کی نم کیفیت سے ناکام شہرزاد نظر آتی تھی یہ بات اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔ جو گداز احساس سے بھیگی بھیگی معلوم ہوتی تھیں۔ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا یہ دوشیزہ ابھی ابھی رو چکی ہے۔

وہ چاہتی تو طورہ کے بڑے سے بڑے گھرانے میں بیاہی جا سکتی تھی۔ ایک تو ڈاکٹر مراد کا لڑکا تسنیم ہی تھا جو ہر دوسرے تیسرے فردوس کا پھیرا لگاتا تھا۔ خور و نوش کی اس قلیل مقدار سے جو اس کے لئے جاتی۔ یہ اندازہ لگا لینا کچھ مشکل نہیں کہ وہ کھانے پینے کے بہانے شہرزاد کو دیکھنے آتا تھا اور پھر کھانے سے فارغ ہونیکے بعد اس کا وہاں ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہنا جو بہ اعتبار حیثیت اس سے کہیں پست تھے اس بات کو اور بھی صاف

کر دیتا ہے۔شہر زاد اس کی باتوں کو جانتی اور اس کی حرکتوں کو سمجھتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں اس نے اپنی کسی ادا۔کسی حرکت کسی بات سے ڈاکٹر کے لڑکے کو یہ خیال کرنے کا موقع نہیں دیا کہ تیری نگاہِ شوق کو حریم ناز میں بار بخشا جا رہا ہے۔

جس طرح پھول اور نافہ دونوں کے دونوں ظالم صبا کے ہاتھوں اپنی خوشبو پھیلانے پر مجبور رہیں۔اسی طرح بہت کچھ چھپانے کے باوجود حسین شہر زاد کے جمال کا آوازہ فردوس سے نکل کر طرہ اور طرہ سے چل کر قصبانی بستیوں کے گوشے گوشے میں گونجا۔ عام شہرہ تھا کہ شہر زاد اس دیار کی حسین ترین دوشیزہ ہے۔ یہ بات سرائے کے حق میں بہت مفید پڑی۔برملا کہا جانے لگا۔ کہ اس نواحی میں فردوس سے بڑھ کر کوئی سرائے نہیں گو یہ کہا جاتا تو زیادہ درست ہوتا کہ اس نواحی میں شہر زاد سے بڑھ کر حسین عورت نہیں اور چونکہ شہر زاد فردوس کے مالک کی لڑکی ہے۔اس لئے فردوس سب سراؤں میں بڑھ چڑھ کر ہے معلوم ہوتا ہے شہر زاد کا باپ اس رمز سے واقف تھا۔فردوس کی بڑھتی چڑھتی آمدنی دیکھ کر بعض اور لوگوں نے بھی سرائیں قائم کیں مگر فردوس کے مالک نے اپنی سرائے کی خصوصیت کے اثر سے کام لے کر ان کو بیٹھا ہی نہیں دیا بلکہ گردا باد کر دیا اور سچ پوچھو تو یہ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔کیونکہ اور لوگوں کی سرائیں صرف سرائیں ہو سکتی تھیں۔فردوس نہیں جسے شہر زاد سے نسبت اور اس کے باپ کی ملکیت ہونے کا فخر حاصل تھا۔حیرت ہے اور تعجب کہ ایک لڑکی اور اسکی مقبولیت کا یہ عالم کہ اگر ایک دن نظر نہ آتی تو لوگ مضطرب ہو ہو کر پوچھنے لگتے "آج بی شہر زاد کہاں ہیں؟ خیریت تو ہے۔کیسی ہیں؟"

بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ فردوس کا مالک بیٹی سے کہہ دیتا "آج تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔گھر پر رہو آرام کرو" لڑکی عمارت سے ملحق ایک مختصر سا مکان اور چمن تھا۔شہر زاد - فرمانبردار۔ سراپا انکسار شہر زاد چمن کے گوشے میں بیٹھی کتابیں پڑھتی یا سوزن کاری کرتی یا ملگتے میں خواب دیکھتی۔خوابہائے انتظار۔ اُدھر سرائے میں سوال ہوا کرتے "آج بی شہر زاد کہاں ہیں۔طبیعت تو اچھی ہے انکی"

شہر زاد کے فدائیوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا۔جس کے ادنےٰ سے اشارے پر شہر زاد کھنچی چلی آتی گو یہ آثار رضامندی کا آئینہ نہ ہوتا (بعض انسان ایسے بھی ہیں جنکے سامنے جھک جانے پر ہم خواہ مخواہ مجبور رہو تے ہیں) خلقت کی زبان جسے صاحب لوح و قلم کا نقارہ بھی کہتے ہیں۔بار بار یہ انکشافات الٹتی تھی کہ شہر زاد اور کلکٹر کے خانساماں جاوید میں معاشقہ ہے ان ایام میں جب کلکٹر صاحب دورے پر ہوتے۔جاوید روز شام کے وقت فردوس میں دیکھا جاتا۔وہ سانولے رنگ کا خاموش طبیعت آدمی تھا۔عمر ہوگی تیس سے کچھ اوپر ایسے آدمی کو جوان نہیں کہتے۔اعلیٰ حیثیت کے مہمانوں کی آؤ بھگت کرتے کرتے۔اُسے انسانی دل و دماغ کے فہم میں درک ہو گیا تھا اور اس میں مرد سے زیادہ عورت کی نفسیات پر اُسے عبور تھا اور جہانتک کھانوں کی پسند کا سوال ہے۔اس کے متعلق تو اس کے مذاق میں کلام ہی نہیں ہو سکتا۔کبھی کبھی جب فردوس کے مقامی آنے جانے والے جاوید کو سگار پیتے دیکھتے تو گو اس سے کہنے کی تو کسی کو ہمت نہ پڑتی۔مگر آپس میں ضرور کھسر پھسر کرتے کہ سگار پینے والے کی حیثیت سے بڑھ کر بڑھ رہا ہے۔دو ایک آدمیوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بغیر برانڈ کی سگار پیتا ہے اور آپس میں چرچے کئے کہ نشانی نہیں دینی چاہتا۔اس لئے برانڈ اتار دیتا ہے۔

عزت تو نہیں البتہ جاوید کی آؤ بھگت ضرور ہوتی اور وہ

بھی ایک خاص غرض سے۔ شہر کے تجار اور حکام پرست اور کاروباری آدمی اس کے ذریعے سے کلکٹر کے بنگلے کی ٹوہ لیتے رہتے کوئی پارٹی ہوتی تھی۔ ہوتی تھی تو کس کی ہوتی تھی۔ کون کون آیا۔ کیا کیا باتیں ہوئیں وغیرہ۔

اس شام جب شہرزاد کی تصویر آئی اور بڑے کمرے میں آویزاں کی گئی۔ جاوید بھی فردوس میں آنکلا۔ تصویر کو دیکھتے ہی بولا۔ "یہ تو الف لیلےٰ کی ہیروئن شہرزاد ہے" سرائے کا مالک اور کوہستانی دہقان جو اس وقت وہاں موجود تھے یہ سنکر بہت متحیر ہوئے اور اس کی بات کو جھوٹ سمجھے۔ مگر جب اس کے تیسرے دن ایک سیاح آکر سرائے میں مقیم ہوا اور اُس نے بھی جاوید کے قول کی تصدیق کی تو سب کو یقین آگیا۔ اور جاوید کی علمدانی کا چرچا ہونے لگا۔ بعض لوگوں نے اسکے منہ پر بھی اس کی تعریف کی مگر جاوید اس طرح ٹال گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

غلط یا صحیح اس سے بحث نہیں مگر قرب وجوار کے رہنے والوں کا خیال تھا اور زعم کہ شہرزاد کے حسن کو سمجھنے کے لئے جاوید سے بہتر مذاق پیدا کرنا مشکل ہے۔ گو واقعہ اس کے خلاف تھا اور حالات نے بہت جلد خیالات کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح بے نقاب کیا کہ تمام نواحی میں تنہا جاوید ہی ایک ایسی ہستی نہیں جسے عورتوں کے جمال کا ادراک ہو۔ جہانتک فردوس کے مالک کی لڑکی کا تعلق ہے شہرزاد خود بھی اپنے حسن کی بے پناہیوں کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔

ایک دن کلکٹر کی غیرموجودگی میں جاوید نے شہرزاد کو بنگلے پر بلایا۔ شہرزاد جس حال میں تھی اسی حال میں چلی گئی جاوید نے اسے ساتھ لیا اور بنگلے کی گیلری میں پہنچا۔ شہرزاد ایک ایک تصویر کو دیکھتی جاتی تھی۔ اور جاوید اس کا حال سناتا جاتا تھا۔ ایک تصویر کے آگے شہرزاد ٹھٹکی۔ اس کے نیچے لکھا تھا "مغل شہزادی" تصویر نورجہاں کی تھی۔ جاوید نے کہا۔ "یہ نورجہاں ہے"۔ اور جہانگیر و نورجہاں کا افسانۂ محبت دہرانے لگا کبوتروں والے سین پر پہنچکر وہ رکا۔ شہرزاد نے کہا "ہاں سناؤ" جاوید نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نیچے اوپر دائیں بائیں کوئی نہیں تھا۔ طبعاً محتاط ہونے کے باوجود ضبط کی عنان اس کے ہاتھوں سے چھٹ گئی جسم میں ایک سنسنی دوڑی۔ ہونٹ سفید پڑگئے بولا۔ "شہرزاد تم اس نورجہاں سے کہیں زیادہ حسین ہو" اور پیشتر اس کے کہ شہرزاد اسکی حرکت کو سمجھ سکے جاوید کے ہونٹ شہرزاد کے ہونٹوں سے پیوست تھے۔ آغوش اس کے جسم سے بھری ہوئی تھی۔ اور سانس اس کے رنگین عارض پر کھیلتا پھرتا تھا۔

خبر نہیں وقت کی بات تھی یا نورجہاں و جہانگیر کے قصے نے جاوید کے جذبات کو بھڑکا دیا۔ یا اس جیسے زندانیٔ عقل کو اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ کوئی تصوری معراج حاصل ہوگئی۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ احتیاط کے پتلے جاوید کو اپنی غلطی کا احساس اسی دم ہوگیا۔ جب اس کے ہونٹوں نے شہرزاد کے ہونٹوں کی شست باندھی اور اس کے بعد۔ اسوقت ہوا جب شہرزاد کا ڈھیلا ہاتھ ایک تھپڑ بن کر اُس کے چہرے پر لگا۔

فوراً چھوڑ کر الگ ہوگیا۔

شہرزاد کی قہرگوں آنکھوں میں شعلے لرز رہے تھے۔ بولی۔ "میں اپنے جوہر سے ناآشنا نہیں ہوں مگر خانساماں صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ جوہر آپ کی آغوش کی تاریکیوں میں گھٹکر مرجانے کے لئے پیدا نہیں ہوا"۔

جاوید کی سمجھ کا یہ عالم تھا کہ انسان تو انسان شیطان کو بھی فریب کاری کا سبق پڑھا دیتا۔ جھٹ پہلو بدل لیا۔ گڑگڑانے لگا۔ معافی مانگنے لگا۔ مگر دل ہی دل میں کہتا جاتا تھا۔

میرا نام جاوید نہیں جو اس مغرور عورت کو نیچا نہ دکھایا ہو۔

اس واقعہ کے بعد بھی جاوید برابر سرائے میں آتا جاتا رہا مگر دو ہفتے یا شاید اس سے بھی زیادہ تک اس نے شہرزاد سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک بالکل ہی غائب رہا۔ کلکٹر صاحب گورنر کو دعوت دے رہے تھے۔ اور جاوید دعوت کا منتظم تھا۔ ہفتے کے اخیر میں دعوت سے فارغ ہو کر کلکٹر صاحب دورے پر روانہ ہوئے جاوید فردوس میں آیا۔ لوگ دعوت کے حالات سننے کے مشتاق تھے۔ مگر جاوید مہر بلب بیٹھا رہا کسی نے کچھ پوچھا بھی تو ایک آدھ فقرے میں ٹال گیا۔ مگر ان نسوانی آنکھوں کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہ تھی جو سرائے کے مالک کی پشت پر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے انہیں یہ پیغام دیدیا کہ اگر شہرزاد سننا چاہے تو جاوید گورنر کی پارٹی کا بہت کچھ حال سنا سکتا ہے۔

ماننا پڑے گا اور ناحق نہیں کہ شہرزاد اپنی قوتوں سے باخبر تھی۔ مگر غلط۔ غلط نہیں نادرست اور نادرست نہیں کم عقلی پر دال ہوگا۔ یہ کہنا کہ جاوید جیسا ہوشیاروں کا ہوشیار اپنی کشش پرور طاقت سے لاعلم تھا۔ وہ جانتا تھا اور اسے یقین کہ میں بھی وہ طاقت ہوں جو حسن کی ہم پلہ نہیں تو جوابی حریف ضرور ہو سکتی ہے۔

شہرزاد آئی۔ اسے آنا پڑا۔ جاوید فوارے کے آگے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ وہ آئی اور بیٹھ گئی اور اس طرح چپکے سے آکر بیٹھی گویا جاوید کو اپنی آمد سے بےخبر رکھنا چاہتی ہے۔ جاوید نے اپنے سگار کا گل گرایا اور بغیر کسی تمہید کے گورنر کی دعوت کا حال بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس نے حسین فرنگنوں کا ذکر کیا۔ ان کی خوشنما پوشاکوں کا۔ کھانوں کا۔ ناچوں کا۔ شہرزاد سنا کی مبہوت بنی ہوئی اور بےخبر اس سے کہ میں مبہوت ہو گئی ہوں جاوید سناتا گیا اپنے مخصوص انداز بیان میں اور یہ جانتے ہوئے کہ میرا بیان مخاطب کے سامعہ کے لئے سحر کا دام بن رہا ہے۔

اسی سال کا ذکر ہے۔ ایکدن سرائے میں ایک مصور آکر مقیم ہوا بہار کی طراوت پذیر فضاؤں میں شاہ بلوط سے گھری ہوئی وادیوں کی تصویریں اتارنے کے لئے اسکا نام تھا شبیر۔

صبح کا وقت تھا۔ دس کا عمل وہ سرائے کے برآمدے میں آکر رکا اور خادم سے شراب لانے کے لئے کہا۔ مے لائی گئی مصور نے گلاس پر ایک نظر ڈالی اس کے آتشیں رنگ کو دیکھا اور کہا۔ "کہئے آپ کی شہرزاد کہاں ہیں" اسے بتایا گیا کہ وہ گھر میں ہے بولا۔ "میں ایک مصور ہوں تمہاری شہرزاد کی تصویر بنانی چاہتا ہوں۔ تکلیف تو ہوگی ذرا اسے یہاں بلا دو"۔

بہار کے ایام تھے۔ مصور میلہا میل کا سفر کرتا ہوا آیا تھا۔ سفر کرتا ہوا اور قہستان کے شاداب نشیب و فراز سے نگاہ کو سیراب کرتا ہوا شراب کے دو ہی گھونٹوں نے بیخودی کا عالم طاری کر دیا۔ اتنا بےخبر ہوا کہ کسی کے آنے تک کی آہٹ بھی نہ پا سکا۔ خالی گلاس میز پر رکھنے کے لئے مڑا تو دیکھا ایک حسین دوشیزہ کھڑی ہے۔ گلاس میز تک پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور کھیل کھیل ہو گیا۔ مخمور لگا ہوں سے فردوس کی ہیروئن کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "واللہ شہرزاد تم تو عجیب چیز بن گئی ہو۔ شہرزاد خاموش کھڑی رہی (یہ امر مشتبہ ہے کہ اسنے مصور کو پہچانا) بولا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ شراب کے شیشے میں حسن کی مے کا گداز ایسی سحور کن صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ آہ"۔

جاوید نے بھی کلکٹر کی گیلری میں اسی قسم کی کوئی بات کہی تھی۔ مگر مصور کے اس فقرے نے کچھ اور ہی کام کیا۔ شاید اسے سحر کہہ سکیں۔

چند منٹ تک ٹکٹکی باندھے وہ شہرزاد کو دیکھا کیا۔ اس دیکھنے میں دل کو جگا دینے کا ایک اعجاز تھا۔ اس اعجاز نے اپنا کام کیا۔ شہرزاد کی آنکھ وا ہوئی۔ زندگی کی صبح ہو رہی تھی اور اس کی درخشانی میں شہرزاد اپنے جلوہ حسن کی تنہا تماشائی وہ حسن جسکی آنکھوں میں ایک نم آلود کیفیت انتظار تھی جو منتظر تھا کسی غم انگیز ذمہ داری کا دفعتاً مصور چونکا۔ بولا "بی شہرزاد میں چند روز کے لئے یہاں قیام کرونگا" شہرزاد نے کچھ سنا کچھ نہیں سُنا۔ بولی۔ "اچھا"

شہرزاد کے چلے جانے پر سرائے کا مالک آیا تو اس نے مصور کو ایک کرسی پر میز کے آگے کسی خیال میں غرق بیٹھا پایا۔ بولا۔ "آپ نے شراب نوش کی؟" مصور نے اثبات میں جواب دیا۔ بولا "پسند فرمائی؟" مصور نے کہا۔ "ہاں اچھی تھی" پوچھنے لگا۔ "تو کبتک قیام رہے گا؟" مصور نے گردن اٹھائی۔ اور نگاہیں مالک سرائے کے چہرے پر جما دیں۔ بولا "قیام؟ (اور پھر جھجک کر) کچھ کہہ نہیں سکتا"۔ دوسرے دن صبح کو مصور نے ناشتے پر شہرزاد کو پھر یاد کیا۔ وہ آئی۔ کھانا خاموشی کے ساتھ جاری رہا۔ مگر مصور کی نگاہیں برابر مصروف تھیں اور جب وہ چلی تو دروازے تک ساتھ ساتھ آئیں اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک وہیں ٹھیری رہیں۔ دوپہر کا کھانا کھلانے وہ پھر آئی۔ اس مرتبہ مصور نے شہرزاد کو باتوں میں لگا لیا۔ ہر بار جب وہ جانا چاہتی کوئی نہ کوئی نئی بات چھیڑ دیتا۔ وہ اس کی خاموشی سے اپنی گفتگو کا جواز پیدا کر رہا تھا اور شہرزاد کی ان مضطرب کٹورا سی آنکھوں کی گھبراہٹ کے باوجود جو ایک ڈرے ہوئے جانور کی طرح ہراساں تھیں یہ جانتا تھا کہ شہرزاد میری ہے اور صرف میری۔

گرد و نواح کے متعلق پوچھتا رہا۔ شہرزاد بنوں والوں پہاڑوں کے متعلق بتاتی رہی۔ دفعتاً پوچھنے لگا۔ آج چاندکی

کونسی ہے؟" شہزاد نے جواب دیا "تیرھویں" بولا۔ "چاند پورا ہوگا؟" شہزاد نے کہا "ہاں" بولا "تم نے کبھی پورا چاند جنگل میں دیکھا ہے؟" شہزاد نے انکار کیا۔ کہنے لگا "اچھا تو آج شب ہمارے ساتھ چلنا۔" "تو کب؟" بعد میں اُسے خود حیرت ہوئی کہ میں نے یہ کیا کیا مگر اسوقت شہزاد پر کچھ ایسا جادو سا ہوگیا کہ وقت بھی بتا دیا اور مقام بھی۔ اور اس شب ٹھیک ڈیڑھ پہر رات گئے جب جاوید فردوس کے مالک کی لڑکی کو دام تزویر میں لانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ شہزاد کے تیز تیز قدم اُس راہ کو پامال کر رہے جو فردوس کی عقبی وادی میں اُترتی ہے۔

چند منٹ تک مصور اور شہزاد خاموش چلتے رہے۔ ماہتاب فستان کی الرالمقد سر چوٹیوں سے بلند ہو کر فلک کی نیلی رہگذر کا کچھ حصہ طے کر چکا تھا۔ وادی کی فضا ماہتاب کی ضو میں بھیگ کر ایک نہائی ہوئی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ مصور چلتا جاتا تھا۔ اور دیکھتا جاتا تھا چاند کو نہیں بلکہ چاند اُس روشنی کو جو شہزاد کے عارض پر کھیل رہی تھی۔ دفعتاً وہ رُک گیا۔ (اب مصور اور شہزاد ایک دوسرے کے مقابل تھے) اس نے اپنے دونوں ہاتھ شہزاد کے شانوں پر رکھے۔ اور ایک والہانہ جوش کے ساتھ بولا "تم بھول گئیں۔ میں نے یاد رکھا۔ شہزاد کیا فراموش کر دیا تم نے اس مصور کو جسنے تمہیں شہزاد بنایا۔ کیا بھول گئیں تم اس دیوانے کو جو تمہاری نرگس کا بھونرا۔ تمہارے گل کا بلبل اور تمہاری شمع کا پروانہ بنکر گیا تھا۔ اور اب درد الفت کو ناقابل ضبط پاکر پھر تمہاری بارگاہ حسن پر اپنی جبیں کو سجدہ ریز کرنے آیا ہے۔ شہزاد! الفت کا جو بیج تیری نگاہوں نے اسوقت میرے مزرعہ دل میں ڈالا تھا۔ آج وہ بڑھ کر شجر بن چکا ہے۔ اب اگر اس کی زندگی ہے تو تیرے ابر کرم پر۔ اُس کی بقا ہے تو تیرے لطف آبیاری سے وگرنہ محبت کی خزاں جس کی شقاوت نے دلوں کے لاکھوں

شاداب قریئے اجاڑ اور ویرانوں سے بدل دیئے۔ اس پر بھی اپنا ہاتھ دراز کرے گی۔ اور جب یہ نہیں تو میں کہاں"

ذرا کی ذرا رُکا۔ پھر بولا۔ حسن یقیناً بری ہے اس الزام سے کہ اس نے عشق کی پذیرائی نہ کی۔ مگر شہرزاد۔ میری پیاری شہرزاد۔ میری برسہابرس کی آرزوؤں کا مرکز۔ شہرزاد سوچ ذرا سوچ۔ ہاں سوچ۔ اور سمجھ کہ زندگی کیا ہے اگر اس میں پذیرائی کی صلاحیت۔ قبولیت کی لچک۔ اور وفا کی رسیلی چاشنی نہ ہو میری آغوش وا ہے۔ آ۔ حسن کی تمام بے پناہیوں کو جلو میں لئے ہوئے آ۔ شہرزاد! اور مجھ میں سما جا۔ کائنات کی سب زبانیں مل کر پیار کے دو میٹھے بولوں کے برابر وزنی نہیں۔ اور سنسار کی ساری کامرانیوں میں ایک کامرانی حسن و عشق کی کامیاب یکجائی ہے"

شہرزاد کا یہ عالم ہوا۔ جیسے کسی نے اس کی مدافعانہ حیثیتیں صلاحیتیں سلب کر لیں۔ جیسے کسی نے اُسے بے بس کر دیا۔ مصور نے اُسے اپنی آغوش میں لیا اور جب اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا تو فردوس کے مالک کی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایک کیفیت انتظار جھلکا کرتی تھی۔ خاموش کھڑی تھی۔

یہ پہلا دن تھا۔ مصور دس روز تک فردوس میں مقیم رہا۔ اور گو ایک متنفس کے علم میں یہ بات نہیں آئی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ اُن دس دنوں میں شب و روز کے چند گھنٹے چھوڑ کر باقی تمام وقت وہ ایک دوسرے کی نگاہوں میں رہے۔

آخرکار مصور کے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ ایک شبانہ ملاقات میں اُس نے رخصت کی اجازت چاہی۔ بولا "اب میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں"۔ شہرزاد کے لئے اس صدا میں کرب کا سامان ضرور تھا۔ مگر کوئی ندرت نہیں۔ اس کا دل ان الفاظ کو بہت پہلے سے سن رہا تھا (گو بغیر پرواہ کئے) اور

پھر اسی پر بس نہیں مصور نے شہرزاد کو کچھ اور بھی بتایا۔ وہ کچھ جو شہرزاد کا دل جلتے ہوئے بھی اس سے چھپا رہا تھا۔

گذشتہ دس دن اور دس راتوں میں مصور نے شادی کا کوئی سلسلہ نہیں اٹھایا تھا۔ اور شہرزاد بھی یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ خواہ مخواہ کیوں رسمی الجھنوں میں پڑا جائے۔ کافی ہے یہ ناگفتہ سمجھوتا کہ میں اس کی ہوں اور وہ میرا۔ مگر قسمت روتی تھی زندگی کی طلسمی نیرنگیوں پر۔ شہرزاد پر اور شہرزاد کے احساسات پر جو حالت کو سمجھنے۔ صورت کو جاننے اور معاملے سے باخبر ہونے کے باوجود اصلیت پر پردہ ڈال رہے تھے۔ اور ایسے وقت جب وہ انجام کی نقاب کشائی سے لرزاں تھے اور خائف۔ اس جانور کی طرح جسے ذبح ہونے سے پہلے چھری نظر آجائے۔

چنانچہ جب مصور نے بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور صاحب اولاد بھی۔ تو شہرزاد کو خیال سا گذرا کہ کوئی نامعلوم آواز میرے کانوں میں کبھی یہی کہتی رہی ہے۔ گو اس کا لہجہ مدھم تھا اور زبان ناقابلِ فہم۔ جسے کہنا چاہیے اور نہ کہہ سکے۔ یا کہہ سکے اور نہ کہنا چاہیے۔

مصور نے اپنی ناانصافی کا کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ اس نے کہدیا اور صاف صاف کہ میں مجبور ہوں اور وابستگی سے معذور۔ شہرزاد بولی "میرا دل پکار رہا تھا کہ مجھے ایکدن یہ جواب ملنا ہے میں جانتی تھی"۔

معلوم ہوتا ہے۔ شہرزاد کے اس فقرے پر مصور کا دل ہل گیا۔ گھبرا سا گیا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا صیاد اپنے ظلم کا احساس کرنے کے باوجود صید کے کلیجے سے تیر کھینچنے پر رضامند نہیں۔ زخمی شہرزاد کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اول تو اس پھانس کی تکلیف جو دل میں چبھی ہوئی تھی۔ اور پھر اس تکلیف پہ تکلیف اس خیال کی کہ جس کا یہ سب کچھ کیا دھرا ہے وہ خود بے رخی پر مائل ہے۔ طول شہرزاد اپنی بےبسی کا خیال کر کے

بلبلا اٹھی۔ ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے مصور کو دیکھا اور بولی شکوہ تم سے نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو اپنی تقدیر سے مگر قسم لے لو جو مجھے اس سے بھی ہو۔ نوعمر ہوں اور زندگی کے نشیب و فراز سے ناواقف۔ مگر اس سے بے خبر نہیں کہ اپنی کرنی کا پھل اس دنیا میں عورت مرد سب کو ملتا ہے۔ آگے یا پیچھے۔ دیر یا سویر آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں۔ تم نے زہر کو امرت بنا کر مجھے دیا۔ سمجھداری کی۔ میں نے اسے امرت سے بھی کچھ سوا سمجھ لیا۔ حماقت کی۔ بیوقوفی کی۔ تم کامران ہو اور بے قصور میں ناکامیاب ہوں اور خطاوار۔ مگر اس نامرادی پر رحم کھا کر جس میں فریب خوردہ شہزادی کی ساری زندگی بسر ہوگی اتنا اور صرف اتنا بتا دو کہ آئین وفا یہی ہے۔ اور جذبۂ محبت کا تقاضا صرف اسی قدر کہ جب اپنے جذبے کی تسکین کا سوال ہو تو ہر معمولی سے معمولی بات کو اصول اور ہر اصول کو اپنا آلۂ کار بنا لو۔ مگر جب دوسروں کی ضرورتیں تمہیں پکاریں تو کمال ہوشیاری کو کام میں لا کر دامن بچا لو۔ اور مجبوریوں کی آڑ میں کترا کر نکل جاؤ۔ بحث اس سے نہیں کہ تم نے ابتک کیا کیا۔ دیکھنا یہ اور صرف یہ ہے کہ اسوقت تک سب کچھ کر لینے کے بعد تم اب کیا کر رہے ہو۔ میں تمہاری لونڈی بننے پر رضامند ہوں اور تمہارے ساتھ چلنے کو تیار۔ مگر تم جنہے زیادہ نہیں اب سے کل ہم دس ہی دن پہلے میرے سامنے وفا و مہر کا ایک بھرا پڑا دفتر کھول کر رکھ دیا تھا۔ آج وابستگی سے انکاری ہو اور گوناگوں مجبوریوں کے مفسر۔ خیر جاؤ۔ کام تو یہ تم نے ایسا کیا ہے کہ برحق ہوگا اگر نظام کائنات کی ہر لولتی اور خاموش شے تمہاری اس حرکت پر سراپا نفریں ہو۔ اور مشیت تمہاری بربادی پر کمربستہ اور میری بد دعا ان سب کی منتقمانہ کارروائی کا جزو لازم نہیں۔ تاہم اس سے کہ زمانہ جبیر میرا کوئی بس نہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ ہی سلوک کرے۔ میں

تمہیں معاف کرتی ہوں۔ محبت کے مردہ دکو محبت کی گھائل کھلے دل سے معاف کرتی ہے۔ جاؤ۔ سدھارو۔ گو آخر ہیں روکنے کے باوجود دل یہ پوچھے بغیر نہیں رہتا کہ ظالم جانے والے بتا تو جا تیرے ظلم کی شکار شہرزاد اپنی زندگی کے باقی دن اور راتیں کس کے سہارے کاٹیگی؟

بظاہر یہ فقرہ ایک سوال معلوم ہوتا ہے اور ہے۔ مگر ہونے کے باوجود نہیں ہے۔ عورت کے ٹوٹے ہوئے دل کی ایک صدا تھی جو تنہا مصور کے گوش دل ہی سے نہیں بلکہ شب کے سکوت۔ شب کی تاریکی۔ قبرستان کے سناٹے۔ وادی کی فضا اور فطرت کے ہراس خاموش رکن سے ایک پر درد اپیل کر رہی تھی۔ جو ظالم و مظلوم کی جگر خراش کشمکش کے تماشائی رہے ہیں آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔

سوال جو سوال معلوم ہوتا ہے۔ سوال نہیں تھا۔ بظاہر ہے۔ تھا۔ مگر حقیقت میں نہیں ہے۔ نہیں تھا۔ نہ کبھی ہوا۔ اور نہ کبھی ہوگا۔ البتہ ہے۔ تھی۔ ہوئی۔ اور ہوگی۔ ایک اپیل۔ ایک صدا۔ ایک پکار۔ جو ترجمان ہے شکستہ دلوں کی جن میں پنہاں ہیں۔ ان تمام عورتوں کے دلوں کی صدائیں جو پکارا کرتی ہیں اور پکارا کریں گی۔ کہ "ہمیں بتاؤ جب زندگی کی تاریک راہوں میں محبت کی شمع گل ہو جائے تو ہم کیا کریں"۔

ہاں تو یہ فقرہ سوال نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ایک سوال تھا۔ جس کے جواب سے مصور قاصر رہا۔

اس رات اشکوں کی جھڑی نے شہرزاد کی آنکھوں کو خواب شبی کے لطف سے محروم رکھا۔ جب ایک دوشیزہ کا خواب انتظار جو ایک عمر کی تمناؤں کا ماحصل ہوتا ہے۔ یوں برباد و تعبیر ہو جائے تو ایک شب کا خواب کیا۔ ہوا۔ ہوا۔ نہ ہوا نہ ہوا۔ شمع جلائی اور شہرزاد تکئے کے سہارے بیٹھی رات بھر

اشکوں کی جھلملیوں میں سے اس کی جھل مل جھل مل دکھائی
شمع اور چاہت دونوں ہی دلہن ہے۔ جلن اور گریہ۔ کبھی کبھی
اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی اور مصور کا بنایا ہوا یہ شعر زبان سے
نکل جاتا۔

زندگانی ہے فریبِ آرزو کھانے کا نام
عاشقی ہے بندہ بر درگھٹ کے مرجانے کا نام

(۲)

بیس برس بعد

ہندوستان کا مشہور کوہستانی مقام "طورہ" دنیا کی حسین
ترین سیرگاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ حکومت کے گرمائی دارالخلافے
شملے سے دس میل کے فاصلے پر اپنی دلآویز بستیوں اور بلند پہاڑیوں
اپنی نظر فریب وادیوں اور آبشاروں۔ اپنے پرکیف مناظر
اور مقامات کے طفیل طورہ دنیا کے بعید ترین گوشوں سے
آنے والے سیلانیوں اور سیاحوں کی مہمانی کرتا ہے۔ ناممکن ہے
کہ کوئی مغربی دیار کا رہنے والا مشرق بعید کے سفر پر آئے اور
طورہ نہ دیکھے۔

یوں تو بہت سی جگہیں یہاں سیلانیوں کے قیام کے لئے
اور چند درچند ہوٹل یہاں ہیں۔ ان کے آرام کے واسطے۔ مگر دو
ہوٹل طورہ کی بستی میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک
اپنی آبادی اور دوسرا اپنی ترقی کی وجہ سے۔ پہلا فردوس
ہوٹل کہلاتا ہے اور دوسرا "روزولا"

فردوس ہوٹل اب سے بیس پچیس برس پہلے کی ایک
سرائے ہے مگر چونکہ عمارت اچھی تھی اور جگہ مناسب اس لئے جب
سرکاری دفاتر کی وجہ سے شملے کی رونق بڑھی اور طورہ کے
حسین مناظر نے شہرت کے پر لگا کر اقصائے عالم میں پرواز
شروع کی۔ تو سرائے کے نئے مالک جاوید نے جسے مرحوم ہوا لئے

مالک نے اپنی فرزندی میں لے کر مختارِ کل بنا دیا تھا اسی سرائے کو ہوٹل کا ڈھنگ دیدیا۔

مگر فردوس ہوٹل کا بس نام ہی نام ہے۔ ویسے دیکھو تو کچھ نہیں۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ "روز ولا" کے منتظمین سفید فام ہیں، اور اس لئے ان سیاحوں کی توجہ کے جائز مرکز جو بیشتر فرنگستان سے آتے ہیں۔ تاہم جہاں تک مقامی رائے کا تعلق ہے یہ بات عام ہے اور قیافے سے درست کہ فردوس کی تباہی کی ذمہ دار جاوید کی بیوی ہے۔ جو کسی زمانے میں شہرزاد کے نام سے مشہور تھی اور اب دیوانی کہلاتی ہے۔ یہ دیوانی جس کے نام سے منسوب ہو کر "فردوس" بھی "دیوانی کا ہوٹل" کہلانے لگا ہے کچھ عجیب تماش کی عورت ہے۔ لاپرواہیاں ہزاروں قسم اور لاکھوں طرح کی دیکھی گئیں۔ مگر یہ بات سننے میں آئی نہ دیکھنے میں کہ کسی عمارت میں ایک کمرے کی آراستگی کا تو یہ عالم ہو جیسے اب منہ سے بولا۔ اور باقی تمام جگہ میں کتے لوٹا کریں مگر "فردوس" میں یہ چیز سننے سنانے اور دیکھنے دکھانے کی حدود سے گذر کر انتظام خانہ داری میں داخل ہے۔ نوکروں کو حکم ہے اور بڑا سخت حکم دیوانی مالکہ کی طرف سے کہ باقی ہوٹل کا کچھ ہی حال ہوا کرے۔ بڑے کمرے کی آرائش میں حبہ برابر فرق نہ آئے۔

چنانچہ بڑا کمرہ جس کا ایک دروازہ سڑک کے رخ کھلتا ہے طرح طرح کے پردوں، قسم قسم کی تصویروں، انواع واقسام کی میزوں اور کرسیوں اور بڑے بڑے قیمتی نوادرات سے سجا رہتا ہے۔ گو ان فقرات سے مقصود یہ غلط فہمی پیدا کرنا نہیں کہ یہ سجا سجایا کمرہ دیوانی عورت سوائے اپنے کسی اور کے استعمال میں آنے دیتی ہے۔ اور اس کے اپنے استعمال کی پوچھو تو اس کی گہرائی صرف اسقدر کہ ہر روز صبح و شام دونوں وقت اس خاموش

تقدیس گاہ میں آتی ہے اور در و دیوار کو چند لمحوں تک مشتاق نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد واپس لوٹ جاتی ہے ؛

پُرلطف یہ ہے کہ اس کمرے کا سارا سامان آرائش خود اس عورت نے اپنی محنت کے پیسے سے جمع کیا ہے۔ اپنی محنت کے پیسے کا مطلب یہ کہ اس کے لئے وہ اپنی کنٹھن سلائیوں اور مختلف دستکاریوں کی تو مرہون ہے۔ مگر اپنے خاوند کی نہیں اور ہوتی بھی کہاں سے جب فردوس کے مالک لے شریکِ زندگی ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ میں کبھی ادھی کی کوڑیاں بھی نہیں دیں۔ کہا یہ جاتا ہے (گو خبر نہیں کہانتک درست ہے) کہ وہ عدم اعتماد کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور رہا۔ عدم اعتماد جس کی بنا یہ شبہ کہ دیوانی عورت چھپ چھپ کر شراب پیتی ہے (حالانکہ بعض لوگوں کی کہن یہ بھی ہے کہ بغیر شراب پئے اس پر شرابیوں کی سی مدہوشی طاری رہتی ہے)

ایک بڑی عجیب چیز اس سلسلے میں رہ گئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ لوگ باگ ناواقفیت کی وجہ سے اس بڑے کمرے کے دروازے پہ دستک دیدیتے ہیں۔ جو دیوانی عورت آٹھ پہر آراستہ رکھتی ہے وہ بین دیکھنے اور دکھانے کے لائق ہوتا ہے۔ فردوس کی دیوانی مالکہ دروازہ کھولتی ہے۔ مرد کو دیکھتی ہے تو روتی ہے۔ عورت کو دیکھتی ہے تو ہنستی ہے اور جلدی سے دروازہ بند کر دیتی ہے؛

بہار کا موسم ہے۔ سہ پہر کا وقت۔ فردوس ہوٹل کے آگے سے گذرنے والی سڑک پار ناسس پر جو شملے سے سیدھی آتی ہے موٹروں کی آمدورفت سے ہنگامہ سا برپا ہے ؛

شفق کی آغوش میں گم ہو جانے کے لئے آفتاب سمتِ غرب دوڑا چلا جاتا ہے ؛

فردوس ہوٹل سے کچھ فاصلے پر سڑک کے دائیں ایک ایک مختصر سی موٹر رکی۔ اور ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے نیچے اترتے ہوئے ایک نوجوان عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ناشتہ کرو گی یا کچھ کھانا دانا بھی"

نوجوان عورت بولی "نہیں اباجان۔ کھانا تو کوٹھی پہ چل کر ہی کھائیں گے۔ چائے وغیرہ سے سہارا کر لیجئے" ادھیڑ عمر کے آدمی نے جواب دیا۔ "دیکھو یہاں کوئی آدمی نظر پڑے۔ تو اس سے پوچھیں (ذرا رک کر) بیس بائیس برس پہلے تو میں نواب جوناپور کی نشا پر کچھ تصویریں بنانے کے لئے یہاں آنکر مقیم ہوا تھا۔ مگر اسوقت میں اور اب میں بڑا فرق ہو گیا ہو گا۔ اسوقت تو یہاں صرف ایک سرائے تھی۔ اور اب معلوم نہیں کتنے ہوٹل وہوٹل ہونگے"؛

دفعتاً اس کی نگاہ ایک آدمی پر پڑی جو پوشش کے لحاظ سے پہاڑی معلوم ہوتا تھا۔ اشارے سے قریب بلایا اور پوچھا "یہاں کوئی ہوٹل ایسا ہے۔ جس میں ہم ناشتہ کر سکیں"؛

اجنبی نے جواب دیا "جی ہاں ایک تو یہی ہے (فردوس کی طرف ہاتھ اٹھا کر) پرے کو ___ مگر وہاں صاب لوگ زیادہ آتے ہیں۔ آپ (فردوس کی طرف اشارہ کر کے) یہیں چلے جایئے۔ گو ___

ادھیڑ عمر کے آدمی نے پوچھا "گو کیا۔ تم رک کیوں گئے بولو۔ بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو"

اجنبی بولا "جناب بات یہ ہے کہ اس ہوٹل کی مالکہ دیوانی ہے۔ اور ___"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے پوچھا "تو کیا لوگ باگ وہاں جاتے نہیں"؛

اجنبی بولا "جاتے تو ہیں اور انہیں وہاں کھانا دانا بھی مل ہی جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی دیوانی عورت بڑی انوکھی حرکتیں کر بیٹھتی ہے۔ اور ___"

"خیر کوئی بات نہیں" ___ کہکر ادھیڑ عمر آدمی موٹر میں بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی ؛

فردوس کا بلند آہنی دروازہ بند تھا۔ موٹر دروازے سے کچھ فاصلے پر رکی۔ مرد نیچے اترتے ہوئے بولا۔ جگہ تو وہی ہے۔ مگر بہت کچھ بدلی ہوئی۔ پہلے یہ اونچا دروازہ نہیں تھا۔ ذرا غور سے دیکھو کر، یہ تو بند ہے۔ اب کیا کیا جائے؟

عورت نے ایک اور سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھئے غالباً کسی کمرے کا دروازہ ہے۔ وہاں دستک دیجئے۔

ادھیڑ عمر کا آدمی آگے بڑھا اور دستک دینے لگا۔ چند منٹ تک کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔ عورت جو اس اثنا میں باپ کے پس پشت آکر کھڑی ہو گئی تھی بولی۔ "ابا ذرا دم لیجیے۔ ممکن ہے آواز پہنچ چکی ہو اور کوئی خادم وغیرہ آ رہا ہو۔"

خیال صحیح نکلا۔ چپل کی کھسر پھسر کی آواز آئی۔ کوئی چوکھٹ تک آتا معلوم ہوا۔ دروازہ کھلا۔ مگر بہت ہی آہستہ آہستہ ایک دیوانی سی عورت نے جس کے باہر نکلے ہوئے سر میں سفید بالوں کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ وحشت زدہ ہرنی کی طرح بدحواس نظروں سے نو واردوں کو دیکھا۔ عمر رسیدہ آدمی نے تعجب کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہاں ہمارے ناشتے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

بولی۔ "میں فردوس کے مالک کی بیوی ہوں۔ دیوانی کہلاتی ہوں۔ میں اور ناشتے کا انتظام۔" اور یہ کہکر دروازہ بند کرنے والی ہی تھی۔ کہ اس کی نظر اس نوجوان عورت پر پڑی جو اپنے باپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی۔ ہاتھ رک گئے۔ دروازہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دیوانی عورت کی دیوانگی مسرت سے بدل گئی بے پایاں مسرت سے۔ قہقہہ مار کر ہنسی۔ بولی:۔

"اچھا۔ ہاں۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ناشتے کا انتظام ہو سکتا ہے۔" اور یہ کہکر دروازہ چوپٹ کھول دیا۔

پھر بولی۔ آیئے آیئے اندر آ جایئے۔ فردوس کے مالک کی بیوی بڑی دیوانی ہے۔ ہے نا؟ ہاں۔ بڑی دیوانی ہے۔ دیوانی! سچ۔ جبھی تو کہتی تھی ناشتے کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ مگر نہیں۔ کوئی بات ہے؟ آپ کے لئے ناشتے کا خاص الخاص ناشتے کا۔ آیئے۔ آ جایئے........."

ادھیڑ عمر کے آدمی نے مڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا (نوجوان عورت کی نگاہیں کہہ رہی تھیں "چلنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ بھی ایک دیوانی عورت کے ہاتھوں کیوں مٹی پلید کرائی) بولا۔

"آؤ بھی۔ دیوانی ہے تو ہوا کرے ہمارا کیا لیگی۔"

دونوں اندر داخل ہوئے۔ ہوٹل کی مالکہ ان کے آگے آگے اس طرح جا رہی تھی۔ جیسے کوئی طائر زمین کے گول گول پرواز کرے۔ اس کی رفتار کو "چلنا" نہیں کہہ سکتے۔ اس کے ہاتھوں کی ٹمک۔ بازوؤں کی جنبش اور سر کی حرکت میں ایک طفلانہ رقص کی سی کیفیت تھی۔ دونوں نو وارد دل ہی دل میں تعجب کرتے ہوئے آگے بڑھے اور دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "ہمیں زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں۔ صرف چائے یا توس ــــ" کہتے کہتے ادھیڑ عمر آدمی رک گیا۔ ہوٹل کی مالکہ عجیب والہانہ انداز سے اسکی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ نوجوان عورت نے ایک دو مرتبہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اسے دیکھا اور پھر محجوب ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔ ہوٹل کی مالکہ برابر ٹکٹکی لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تعجب یا حیرت نہیں بلکہ عقیدت کی جھلک تھی۔ جیسے کوئی پجاری اپنے معبود کو دیکھ پائے۔ بولی۔ "ہاں دیوانی۔ ہاں پگلی۔ فردوس کے مالک کی بیوی۔ تو نے بی بی کو گھبرا دیا۔ تو نے اس طرح دیکھا کہ بچاری شرما گئی۔ ہا دیوانی۔ ہا پگلی۔ مگر بیوی خفا نہ ہونا تم حسین ہو۔ اور حسن بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں کشش ہے۔ جادو ہے قوت ہے۔ خفا نہ ہونا بی بی۔ فردوس کے مالک کی بیوی تو پگلی ہے

دیوانی ہے۔ حسین عورتوں کو اس طرح دیکھتی ہے کہ وہ شرما جاتی ہیں۔ کچھ خیال نہ کرنا۔ میری پیاری بی بی۔ خدا تمہارے حسن کو قرار۔ اور اس کے پرستار کی وفاداری کو زندگی دے"۔

لہجہ۔ لہجے کا طنز۔ اور طنز کا تاثر ہر چیز اپنی جگہ دوسری سے زیادہ جگر خراش تھی۔ دفعتاً اس کے چہرے کی کیفیت بدلی۔ پہلے خوشی تھی اب خوف طاری ہوا۔ گویا ایک نامعلوم ہاتھ نے کسی گوشے سے نکل اسپر تازیانہ برسانا شروع کر دیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیفیت بھی بدل گئی۔ خوشی کے بعد طنز۔ طنز کے بعد خوف۔ خوف کے بعد اب تکلیف کا اثر طاری ہوا۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی اور اس کے بعد جو کروٹ لی ہے تو نہ خوف تھا نہ طنز۔ نہ خوشی۔ نہ تکلیف۔ اب وہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی آواز اسے بلا رہی ہے۔ ایسی آواز جو آنکھوں کی چمک کو برقی کروٹوں کی طرح بدل سکے۔ وحشت زدہ انداز سے ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "اش" دروازے کی طرف لپکی۔ اسے کھولا۔ باہر کی طرف دیکھا۔ طرح نووارد عورت مرد کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ باپ بیٹی نے اس کی آواز سنی۔ دروازے کے باہر یہ فقرہ دہرائی جاتی تھی۔ "ہمیں زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں۔ چائے یا توس وغیرہ"۔ اور ابھی دونوں تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ کواڑ جو دیوانی عورت بند کر گئی تھی کسی قدر وا ہوئے۔ اتنے کہ صرف اس کا چہرہ نظر آسکے۔ وہ چہرہ جو فوری خوشی کے اثر سے گلرنگ تھا اس انسان کی طرح جس نے اپنے سینے کو کسی سربستہ راز کا مدفن بنا رکھا ہو۔ دیوانی عورت نے کلمے کی انگلی ہونٹوں پر رکھی۔ تیز تیز آنکھوں سے نوجوان عورت کو دیکھا۔ اور بولی "دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی چائے لاتی ہے۔ ہاں لاتی ہے۔ ابھی توس بھی ہیں۔ توس دیوانی نے اپنے لئے تیار کئے تھے۔ مگر وہ تم سے زیادہ تھوڑے ہی ہے۔ تم کھاؤ۔ ہاں تم۔ وہ تو پگلی ہے۔ دیوانی ہے۔ (اور پھر دفعتاً لہجہ بدل کر) یا دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی۔ پاگلی فردوس کے مالک کی بیوی"۔ اور یہ کہتے کے ساتھ ہی دروازہ دفعتاً بند اور خود غائب۔

چند منٹ تک عورت مرد دونوں بیٹھے کواڑوں کو تکا کئے اس توقع پر کہ شاید پہلے کی طرح دروازہ پھر کھلے۔ مگر توقع بے سود اور خیال بے محل ثابت ہوا۔ ایکسے دیوانی عورت واقعی جا چکی تھی اور گئی تھی سامان خورونوش لانے کے لئے۔ دور سے برتنوں کی کھڑ بڑ کی آواز آئی۔ بجلی کا چولہا جلنے کی سیں سیں سنائی دی ادھیڑ عمر آدمی نے بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا "کیا خیال ہے تمہارا عورت واقعی پگلی ہے"؟

بیٹی کچھ کہنے کو ہوتی۔ آپ پھر بولا "ڈر سا لگتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر"

عورت نے جواب دیا "ہاں اول اول تو میں بھی ڈر گئی"۔

بولا "مگر ڈرنے کی کوئی بات ہے نہیں"

عورت۔ ہاں۔ البتہ افسوس ضرور آتا ہے۔ بیچاری کی حالت کسی مرد کی ستائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس وقت کہتی ہے یا دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی تو سننے والے کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔

مرد۔ ہاں۔ اور تم نے یہ بھی دیکھا۔ چہرہ کی کیفیتیں کس قدر جلدی بدلتی ہیں۔ ابھی خوشی ہے ابھی [illegible] ابھی خوف۔ ابھی درد۔ اور پھر دفعتاً کسی نامعلوم آواز پر کان لگا دیتی ہے۔

عورت۔ ہاں پگلی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

مرد۔ یقیناً۔ مگر معلوم ہوتا ہے اسکا پاگل پن بالکل بے ضرر ہے ورنہ لوگ کبھی اس کا یہاں اس طرح رہنا گوارا نہ کرتے۔

عورت۔ شاید۔

مرد۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چائے وائے تو کچھ لائے نہیں

اور خالی پلیٹیں۔ پیالیاں ہمارے سامنے رکھ کر کہہ گئے کمائیے۔ دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی چائے لے آئی

عورت ہنسی۔ بولی "آپکی بات ہے تو قرین قیاس۔ اچھا فرض کیا۔ یہ صورت آن پڑے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ جھوٹ موٹ کمانے لگیں؟"

مرد۔ "اور کیا [illegible] تب تو [illegible] پڑے گی" دفعتاً گفتگو کا رخ بدل گیا۔ ہم نے دیواروں کی طرف اشارہ کرکے تصویریں بتائیں۔

عورت نے سر اٹھا کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھا۔ مرد بولا "ہے کوئی بات خاص؟"

عورت۔ "جی ہاں تقریباً سب کی سب ایک ہی موضوع پر ہیں؟"

مرد۔ ہاں۔ ہر تصویر میں عورت اور مرد کی جدائی دکھائی گئی ہے۔

عورت کچھ پوچھنے والی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور دیوانی عورت ناشتے کا سامان لئے ہوئے داخل ہوئی۔ چائے گرم گرم تھی۔ توس خوبصورت تراشے ہوئے اور [illegible] مرتبہ؟

یہ سامان میز پر رکھتے ہوئے کہیں اس کا ہاتھ نوجوان عورت کے ہاتھ سے مس ہو گیا۔ گھوڑے کی طرح جھجکی۔ چمک کر پیچھے ہٹی۔ پیچھے ہٹ کر آگے بڑھنے کو ہوئی۔ اور آگے بڑھتے بڑھتے دفعتاً کچھ جھجک گئی۔ بولی "دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی۔" اور یہ الفاظ کچھ ایسے لہجے میں کہے۔ جیسے ایک عورت دوسری عورت سے [illegible] کرتی ہو اور کہتے کہتے ساتھ ہی دروازہ کی طرف لپکی۔ جیسے کسی نامعلوم شکاری نے کمین گاہ سے نکل کر اسے ہرنی کی طرح تیروں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ دروازہ تک پہنچی کواڑ کھولنے لگی۔ کھولتے کھولتے رک کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے اب تعاقب ختم ہو چکا اور شکاری [illegible] گیا۔ مڑی۔ مسکرائی۔ قریب

رک کر کھڑی ہو گئی۔ اور عقیدت کی نظروں سے نوجوان عورت کو دیکھنے لگی۔ سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا۔ منہ حیرت سے اور حیرت سے زیادہ عقیدت سے کھلا ہوا۔۔۔ دیکھے چلی جاتی ہے۔ متوحش نظروں۔ گھبرائے گھبرائے دیدوں سے برابر ٹکٹکی لگائے دیکھے چلی جاتی ہے۔ نوجوان عورت نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ آپ بولی "بی بی کیسی خوبصورت ہے"

[illegible] نوجوان عورت [illegible] کہا۔ مگر دیوانی عورت [illegible] شاید اپنے ہی [illegible] تھی [illegible] کچھ جواب دینے کو ہوا۔ آپ بولی۔ "کیوں [illegible] بی بی بہن بہت حسین" [illegible] کہا۔ "ماشاء اللہ کہو۔ ماشاء اللہ [illegible] سلطان"

دیوانی عورت نے [illegible] اس فقرے میں کوئی مطلب تھا [illegible] سر کا رخ بدل کر اپنے شوہر سلطان کو پھر دیکھنا شروع کر دیا۔ [illegible] دونوں [illegible] ایک دوسرے [illegible] پرشوق نظروں سے [illegible] اس ادھیڑ عمر آدمی سے پوچھا۔ "تمہارے بھی بال بچے ہیں؟"

دیوانی [illegible] جواب دیا "ہاں۔ کیوں نہیں (اور پھر ایک قہقہہ لگا کر) بڑے حسین۔ بڑے خوبصورت بچے"

مرد نے پوچھا "کہاں ہیں۔ یہیں رہتے ہیں یا کہیں اور۔"

اس کے جواب میں دیوانی عورت نے طفلانہ شوخی [illegible] کے ساتھ گردن کو جنبش دی اور سیدھے ہاتھ سے پیشانی پر ضرب لگاتے ہوئے بولی "جہاں بھی ہیں اچھے ہیں۔ جہاں بھی ہیں"

مرد بولا "کیا مطلب معلوم ہوتا ہے تمہارے کوئی بال بچہ ہے نہیں۔"

دیوانی عورت کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ یہ اس کا راز تھا۔ اور تنہا اسی کا حق۔ چاہے بتائے چاہے نہ بتائے گفتگو کو [illegible] لگی۔ مگر معلوم ہوتا ہے

دو ہی قدم کے بعد اس کا ارادہ بدل گیا۔ واپس لوٹی۔ اور میز کے قریب آکر بولی "کبھی میں بھی خوبصورت تھی۔ بہت خوبصورت بہت حسین۔۔۔"

فقرہ ناتمام ہی رہا۔ شاید اُسے خیال آگیا۔ کہ میرے مخاطب اجنبی ہیں اور اجنبیوں کے سامنے راز کی باتیں کہنے سے فائدہ؟

بولی "میں اس کمرے میں کسی کو آنے نہیں دیتی۔ یہ کمرہ میرا رازدار ہے۔ اس کمرے میں میرے ہونٹوں سے راز کی باتیں نکلنے لگتی ہیں"۔

اور یہ کہہ۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ مگر جنون قرار لینے دے تو اسے جنون کون کہے۔ باپ بیٹی نے تعجب سے دیکھا کہ پانچ منٹ بھی نہیں گذرے کہ وہ پھر چلی آئی ہے۔ آئی اور کھلے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر پھر اپنے شغل میں کھو گئی۔ جس کا تماشا اتنی دیر سے دکھا رہی تھی۔

باپ بیٹی ناشتہ کرتے رہے اور دیوانی عورت برابر پھیرے لگاتی رہی۔ کبھی آتی کبھی جاتی۔ اور اس طرح کہ اس کا اپنا عجیب شغل برابر جاری ہے۔

آتی۔ آکر کھڑی ہو جاتی۔ نگاہیں شہیرہ کے چہرے پر جما دیتی۔ خاموش دیکھتی رہتی۔ پھر دیکھتے دیکھتے گھبرا سی جاتی۔ زیر لب کہتی "بی بی بہت حسین ہے بہت حسین" اور پھر اپنی جسارت کی معافی مانگنے لگتی۔

ایک مرتبہ جب معافی طلبی کے جواب میں شہیرہ نے کہا۔ "نہیں کوئی ہرج نہیں۔ تم کھڑی رہو۔ جب تک جی چاہے" تو وہ رو پڑی۔ بولی "نہیں نہیں میں جاتی ہوں" اور پھر چند قدم دروازے کی طرف چل کر ایک جھجک کے ساتھ واپس مڑتے ہوئے میز پر شہیرہ کے قریب جھک سی گئی۔ اور بولی۔۔

"بی بی تم بہت حسین ہو۔ بہت حسین۔ مگر ۔۔ آہ ۔۔"

اور فقرے کو ناتمام چھوڑ کر یہ شعر گانے لگی۔۔

زندگانی ہے فریب آرزو کھانے کا نام
عاشقی ہے بندہ پرور گھٹ کے مر جانے کا نام

آواز بھرائی ہوئی تھی اور نغمے سے بالکل محروم۔ سروں سے بیدقی اور الفاظ کے حسن ادا سے عاری۔ مگر پھر بھی اس گانے میں کچھ ایسی دلدوز کشش تھی کہ سننے والے کے دل پر ایک تازیانہ لگتا تھا۔

ابھی شعر کا دوسرا مصرع پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ کہ ادھیڑ عمر کے آدمی نے چونک کر دیوانی عورت کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف سے پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ مڑی تو چہرہ کسی پوشیدہ کیفیت کے اثر سے گلرنگ تھا۔ ایک مجذوب کی طرح ہاتھ اٹھا نگاہیں چھت میں جما دیں اور گانے لگی۔۔

زندگانی ہے فریب آرزو کھانے کا نام

ادھیڑ عمر آدمی نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا "اے دیکھنا۔۔۔۔ یہ شعر تم نے کہاں سنا؟"

جواب دینے کی بجائے وہ ایک قہقہہ مار کر ہنسی اور مڑ کر دیکھتی ہوئی دروازے کی طرف چلنے لگی۔ ادھیڑ عمر کے شخص نے پھر پوچھا "ارے یہ شعر کہاں سے یاد کیا تم نے؟ بتاؤ نا؟ کس سے سنا تھا؟" دیوانی عورت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ یہ معلوم ہو جیسے کہتی ہے۔ یہ راز ہے اور راز بتانے نہیں جاتے۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے جاتی ہوئی عورت کو واپس بلایا۔ وہ آئی اور پیشتر اس کے کہ بلانے والا کچھ کہہ سکے۔ بولی۔ "میں بھی کبھی خوبصورت تھی۔ دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی بھی کبھی خوبصورت تھی (اور پھر مخاطب کے چہرے پر نظر جما کر) یاد دیوانی فردوس کے مالک کی بیوی۔ ہاں پگلی فردوس کے مالک کی بیوی۔ دیکھا تم نے دیوانی کو۔ دیکھا پگلی کو۔ دو آنکھیں ملائیے مگر نہیں تمہیں کہاں معلوم ہوگا۔ یہ دیوانی بھی کبھی بہت خوبصورت تھی اور بہت مشہور۔ تمہیں معلوم ہے یہ دیوانی کس نام سے

مشہور تھی۔ تمہیں معلوم ہے۔ وہ نام کس نے رکھا تھا۔ اُف تمہیں یہ باتیں بھلا کہاں معلوم ہونگی۔ کھوگئے دیوانی پریشان کرتی ہے"

خبر نہیں دیوانی عورت کے ان فقرات میں کیا اثر تھا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی بیچین ہوگیا۔ پوچھنے لگا "کس نام سے مشہور تھی۔ بتاؤ تو۔ کس نام سے مشہور تھی۔ کس نے رکھا تھا وہ نام بتاؤ بتاؤ"

دیوانی عورت نے ایک شریر بچے کی طرح نفی میں سر ہلایا اور لگی چلنے۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے پھر زور دے کر پوچھا:۔

"کس نام سے مشہور تھی۔ تم نے بتایا نہیں"

آواز میں شاید کچھ کشش تھی۔ دیوانی الٹے واپس پھری اس کے قریب آئی۔ اور چپکے سے اُس کے کان میں کچھ کہہ کر پنجوں کے بل باہر نکل گئی۔ نوجوان عورت نے پوچھا:۔

"کیا کہا اباجان اس نے؟"

ادھیڑ عمر کا آدمی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "کچھ نہیں"

عورت نے پوچھا "یعنی کیا اس نے آپکے کان میں کچھ کہا ہی نہیں؟"

ادھیڑ عمر کے آدمی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند منٹ وہ اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ جس سے نکل کر دیوانی عورت باہر گئی تھی۔ پھر جیب سے چند طلائی سکے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بیٹی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "لو چلو"

عورت نے پہلے اسے دیکھا اور پھر ان طلائی سکوں کو جو ناشتہ کی صحیح قیمت سے کہیں زیادہ اور رسانہ ہوئی وہ حیران تھی۔ مگر خاموش۔ ادھیڑ عمر کا آدمی بھی (جس کا نام تہیر تھا اور پیشہ مصوری) خاموش باہر نکلا۔ وہ کسی خیالی دنیا میں گم تھا اور آنکھوں میں آنسو لائے ہوئے تھے۔

(منظر انصاری۔ بی اے۔ آنرز)